قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

دسمبر 2025 قیمت ₹25

ماہنامہ
اردو دنیا
نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچوں کا کتب خانہ

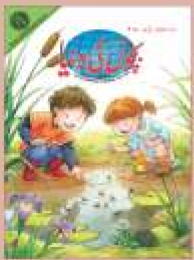

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

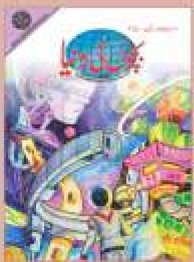

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے   سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326 ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in
شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 040 - 24415194

ماہنامہ اردو دنیا
نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:27، شمارہ:12، دسمبر 2025

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین : شاداب شمیم، فیضان الحق، یونس انصاری

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
سالاسار امیجنگ سسٹمس
A-97، سیکٹر 58، نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے سالانہ -/240 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ
- ہماری بات 4

خطوط
- ربط و التفات قارئین کے خطوط 5

انڈین نالج سسٹم
- انڈین نالج سسٹم (IKS) اور موجودہ تعلیمی نظام کا تقابلی مطالعہ کے ایم عظمت النسا 7

زبان و تعلیم
- شمولیاتی تعلیم کی روشن دنیا مظفر اسلام 12
- خواتین میں اعلیٰ تعلیم کا فروغ صائمہ ثمرین 14

ادب، زاویے اور جہات
- اردو شاعری میں بنارس کی جھلکیاں رئیس انور 17

- اقبال مجید کی افسانہ نگاری ریاض توحیدی 21
- جموں میں اردو زبان کی صورت حال اقبال احمد 25

ہوگا کوئی ایسا بھی...
- دکن اور دیوان غالب کی شرحیں ظہیر دانش عمری 28
- غالب کی فارسی شاعری ملک سلیم جاوید 30
- غالب کی شاعری اور تمنا کا دوسرا قدم عبدالرزاق زیادی 32

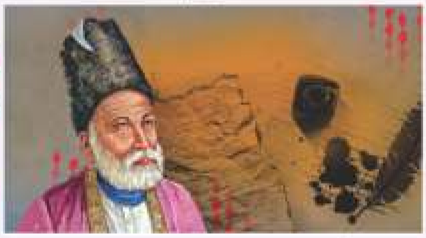

- جدتِ خیال اور ندرتِ بیان کا شاعر: غالب فیصل خان 35

شخصیات
- علامہ محوی صدیقی لکھنوی کی علمی، ادبی اور تعلیمی خدمات محمد نعمان خاں 38
- پروفیسر اصغر عباس بہ حیثیت سرسید شناس عباس رضا نیر 41

شاعری کے معتبر دستخط
- زاہدہ زیدی کی نظمیہ شاعری محمد شہواز عالم 45

- اقبال کرشن کی غزلیہ شاعری کا تنقیدی جائزہ معراج احمد معراج 48
- فضا ابن فیضی: مجھ کو میرے سخن سے پہچانو! رضیہ پروین 50

یاد رفتگاں
- انجم مانپوری: صحافی، شاعر اور طنز و مزاح نگار محمد جلیل اختر جلیلی 53
- ڈاکٹر راہی معصوم رضا گنگا جمنی تہذیب کے امین شاہ فیصل 56
- حمید تمنائی: حیات اور ادبی شناخت سعدیہ پروین 60
- سجاد مہدی حسینی کی علمی شخصیت سرفراز جاوید 63

گوشۂ قاسم خورشید
- قاسم خورشید کا تخلیقی انفراد شہاب ظفر اعظمی 66

- کچھ یادیں کچھ باتیں قاسم خورشید کی صدر عالم گوہر 70
- آسمان ادب کا نیر تاباں: قاسم خورشید عشرت صبوحی 73

ابلاغیات
- آکاش وانی کا 90 سالہ سفر اختر آزاد 76

فارسی ادبیات
- قاضی سجاد حسین اور دیوانِ حافظ کا ترجمہ فیصل نذیر 79

کتابوں کی دنیا
- تعارف و تبصرہ ادارہ 81

خبر نامہ
- اردو دنیا کی خبریں ادارہ 87

ہماری بات

اردو شعروادب کی دنیا میں جن شعرا وادبا کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ان میں میر تقی میر اور مرزا اسداللہ خاں غالب کا نام سرفہرست ہے۔ میر کے بعد اردو کے نمائندہ شاعر کے طور پر غالب کا نام لیا جاتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ غالب نے ایک ایسے عہد میں اردو زبان کو اظہار کا وسیلہ بنایا جب فارسی کا دورعروج تھا۔ غالب نے 1857 کی پہلی جنگ آزادی کا بھی مشاہدہ کیا اور اس کے عذاب بھی جھیلے۔ اس تعلق سے ان کے تجربات ومشاہدات کبھی شاعری کے پیکر میں اور کبھی خطوط کے حوالے سے ظاہر ہوتے رہے۔ لیکن ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے شعروادب کے فن سے سمجھوتا کیے بغیر اپنے کرب کا اظہار کیا۔ ان کی شاعری کا انداز مختلف اور قدرے مشکل بھی تھا، جس پر معترضین نے سوالات بھی قائم کیے لیکن غالب نے ان سب کا نہایت بیباکی کے ساتھ مقابلہ کیا اور اپنی روش بدلنے کے بجائے اس وقت کا انتظار کیا جب دنیا ان کے سخن کی قدر کرنا سیکھ جائے گی۔ وہ ہمیشہ ایک گلشن ناآفریدہ کے تمنائی رہے اور یہی امید ان کی شخصی مضبوطی کا حوالہ بنتی رہی۔ بالآخر وہ زمانہ آیا جب غالب کے قدردان پیدا ہوئے اور ان کے فکر وفلسفہ پر غور وخوض کیا جانے لگا۔ جدت طرازی اور معنی آفرینی کی جیسی مثالیں غالب نے پیش کی تھیں، ان کی نظیر ملنا مشکل تھا۔ ناقدین نے بنظر غائر ان کے کلام کا مطالعہ کرنا شروع کیا تو معلوم ہوا اس میں معانی کے دریا رواں ہیں۔ قاری جس قدر اس میں غوطہ زن ہوتا ہے مفاہیم کے نئے نئے جواہر سے فیضیاب ہوتا ہے۔ اس روش نے کلام غالب کی شرح وتفسیر کی بنا ڈالی اور دیکھتے ہی دیکھتے شارحین غالب کی ایک بڑی تعداد تیار ہوگئی۔ شمال سے جنوب اور مشرق سے لے کر مغرب تک کلام غالب کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا اور کلام غالب کی شروحات منظر عام پر آنے لگیں۔ ان شارحین میں درگا پرشاد نادر دہلوی، نظم طباطبائی، عبدالرحمٰن بجنوری، سہا مجددی، حسرت موہانی، مولانا ناطق گلاوٹھی، نریش کمار شاد، یوسف سلیم چشتی، نیر مسعود، شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے کلام غالب پر اظہار خیال کیا اور اس کے معانی کی تہیں روشن کیں۔

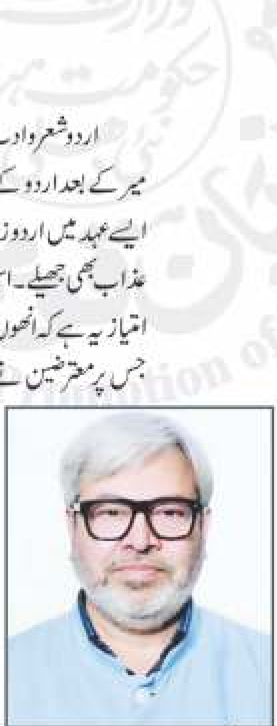

کلام غالب کے شارحین شمال سے لے کر جنوب تک پھیلے ہوئے ہیں۔ سرزمین دکن جسے اردو کی سرپرستی کا خاص شرف حاصل ہے، اس نے نصرتی، غواصی، قلی قطب شاہ، ولی اور سراج جیسے شعرا پیدا کیے اور ان کی قدردانی بھی کی۔ دکن کے امرا وسلاطین نے بھی اس جانب خاص توجہ دی اور یہاں کے عوام بھی اردو زبان وادب کے تئیں سنجیدہ نظر آئے۔ انھوں نے ہر دور میں شاعروں کی قدر کی۔ اسی طرح جب یہ لوگ کلام غالب سے روشناس ہوئے تو اس کی تفہیم وتعبیر پر کمربستہ ہوئے اور کئی ایسی شروحات لکھیں جو تفہیم غالب میں معاون ثابت ہوئیں۔ ان شروحات میں عبدالعلی والہ حیدرآبادی مدراسی کی 'وثوق صراحت'، سید علی حیدر نظم طباطبائی کی 'شرح دیوان غالب'، عبدالواجد کی 'وجدان تحقیق'، ضامن کنتوری کی 'شرح دیوان غالب' اور شہاب الدین مصطفیٰ کی 'ترجمان غالب' قابل ذکر ہیں۔ ان شروحات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شارحین نے کلام غالب کو نہ صرف لغوی اعتبار سے قابل فہم بنانے کی کوشش کی ہے بلکہ اس کی مختلف تعبیریں بھی پیش کی ہیں۔ زبان وبیان کی گتھیوں کو سلجھاتے ہوئے علاقائی دشواریوں کو بھی ختم کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ ان تمام شروحات کو تاریخی اہمیت بھی حاصل ہے اور انھیں ادبی سرمایے میں اضافہ کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

غالب کی شخصیت اتنی گوناگوں ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کا بیک وقت احاطہ ناممکن ہے۔ قومی اردو کونسل 'غالب' کی ادبی وتہذیبی شخصیت کو ایک قیمتی اثاثہ تصور کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے متعلق مختلف کتابیں کونسل سے شائع ہو چکی ہیں۔ 27 دسمبر 1797 مرزا غالب کا یوم پیدائش ہے۔ اسی مناسبت سے ماہنامہ 'اردو دنیا' کے اس شمارے میں غالب کی شخصیت اور شعری وادبی انسلاکات کے تعلق سے ایک گوشہ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ امید ہے قارئین اسے پسند فرمائیں گے۔

شمس اقبال

ربط والتفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

ماہنامہ 'اردو دنیا' نومبر 2025 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا، تمام مشمولات ادب وفن کے اعلیٰ تقاضوں نیز تحقیق وتنقید کے نئے گوشوں کی دریافت پر مشتمل ہیں۔ 'اداریہ' ادب کے نئے جزیروں کی دریافت کا استعارہ ہے۔ ممنون کرم ہوں کہ آپ اردو کے ایک نہایت موقر رسالے سے مجھے فیضیاب ہونے کے مواقع عنایت کرتے ہیں۔

ڈاکٹر رضوانہ پروین ارم: صدر شعبۂ اردو، جمشید پور وومنس یونیورسٹی، جمشید پور، جھارکھنڈ

اردو دنیا کا نومبر 2025 کا شمارہ موصول ہوا۔ اس کے مشمولات کو دیکھتے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس پر ادارتی سطح پر نہایت سنجیدگی، توجہ اور ذوق کے ساتھ محنت کی گئی ہے۔ ہر مضمون اپنے اندر فکر وآگہی کی نئی جہتیں سمیٹے ہوئے ہے۔ تعلیم، ٹیکنالوجی، ادب زاویے اور جہات، شخصیات، کلاسیکی شعر و ادب، زبان و تعلیم، صحافت، تراجم، سائنس، خصوصی گفتگو اور فلم جیسے متنوع عنوانات کے تحت شائع ہونے والے مضامین اس شمارے کو ہمہ جہت اور بامقصد بنا رہے ہیں۔ اداریے میں ہندوستان کی علمی تاریخ پر نہایت عمدہ گفتگو کی گئی ہے جس سے قارئین کو ہمارے علمی ورثے اور تہذیبی تسلسل کا احساس ہوتا ہے۔ اس شمارے کا پہلا مضمون محترم دھرمیندر پردھان (وزیرِ تعلیم، حکومتِ ہند) کا ہے، جس کا عنوان 'مغربی گھاٹوں میں بھارت کی عظیم کہانی کا جنم' ہے۔ یہ مضمون 30 ستمبر 2025 کو ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہوا تھا۔ اس کا ترجمہ نایاب حسن نے نہایت خوب صورت اور شاندار انداز سے کیا ہے۔ مترجم کی زبان شستہ، رواں اور سلیس ہے۔ اس عمدہ ترجمے کے لیے میں نایاب حسن کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ محمد ذاکر کا مضمون 'تہذیب، ثقافت اور تمدن: ایک جائزہ' علمی و تحقیقی نقطہ نظر سے بے حد وقیع ہے۔ انھوں نے مختلف لغات اور علمی ماخذات سے استفادہ کرتے ہوئے تینوں اصطلاحات تہذیب، ثقافت اور تمدن کی تعریفیں نہایت وضاحت اور باریکی کے ساتھ کی ہیں۔ ان کے اس مضمون سے قاری کے علم میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے۔ غلام غوث کا مضمون 'زبانی قصہ گوئی کی روایت' بھی نہایت معلوماتی ہے۔ انھوں نے برصغیر میں زبانی روایت کی تاریخی جڑوں اور قصہ گوئی کے فن کے ارتقائی مراحل پر مدلل گفتگو کی ہے۔ مضمون کی زبان دلکش اور اسلوب دل نشیں ہے۔ اسی طرح ابرار اجراوی کا مضمون 'شکیل الرحمٰن کا تنقیدی موقف' تنقید و ادب کے سنجیدہ قاری کے لیے نہایت مفید مطالعہ ہے۔ انھوں نے شکیل الرحمٰن کے فکری وفنی نظریات کو گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس کے نمایاں پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ عبداللہ کا مضمون 'فورٹ سینٹ جارج کالج کی اردو خدمات' اردو کے فروغ میں ادارہ جاتی کوششوں کا قیمتی ریکارڈ فراہم کرتا ہے۔ عبدالباری کا مضمون 'مومن خاں مومن: شخصیت اور شاعری' میں شاعر کی زندگی اور فکری جہات کو نہایت خوب صورتی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ محمد ارشد کا 'ہند ایرانی تہذیب کا بیانیہ' اور محمد سہیل کا 'انور جلال پوری کے منظوم اردو تراجم' بھی اچھے مضامین ہیں۔ آخر میں 'تعارف وتبصرہ' اور 'اردو دنیا کی خبریں' جیسے گوشے اس رسالے کو مزید وقار اور جامعیت عطا کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ علمی، ادبی اور فکری سطح پر نہایت معیاری ہے اور اردو ادب کے سنجیدہ قارئین کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہے۔ میں اردو دنیا کے مدیر اور پوری ادارتی ٹیم کو اس شاندار شمارے کی اشاعت پر تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

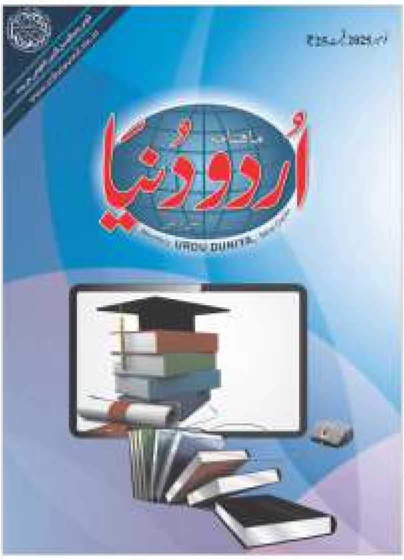

شارق حسن: بتیا، دربھنگہ، بہار

ماہنامہ 'اردو دنیا' اکتوبر کا شمارہ مجھے تاخیر سے موصول ہوا۔ یہ رسالہ ایک علمی اور ادبی بین الاقوامی مجلّہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس و ٹکنالوجی، زبان کی زمینی صورت حال اور انسانی زندگی سے جڑے دیگر اہم موضوعات پر مختلف ادیبوں، قلمکاروں و دانشوروں کے مثبت غیر مطبوعہ مضامین فیچرز شائع ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ زبان اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا ہے۔ اس میں عام قارئین، اساتذہ، ریسرچ اسکالرز کی ادبی ضرورتوں کا خاص خیال رکھنے والے مضامین شامل ہوتے ہیں۔ فیچرز سے بھرپور اس کا ہر شمارہ 100 صفحات پر مشتمل خوبصورت سرِوق، رنگین صفحات و جاذب نظر تصاویر لیے اشتہارات و سیاسی خبروں سے ایک دم پاک وصاف ہوا کرتا ہے۔ دلچسپ اتنا کہ ایک پڑھا نہیں دوسرے شمارے کا انتظار شروع ہوجاتا ہے۔ اکتوبر کا شمارہ بھی انھی خصوصیات کا حامل ہے۔ اردو دنیا پابندی سے شائع کرنے والے کونسل کے ذمے داران اور سارے عملہ کی کڑی محنت اور لکھنے والوں کی زبان اردو سے سچی محبت اور قارئین سے گہری ہمدردی والفت ظاہر ہوتی ہے۔ پروردگار عالم سبھی کو صحت وسلامتی عطا فرمائے۔

افضل بیگ: بنگلور، کرناٹک

ماہنامہ 'اردو دنیا' اکتوبر کا شمارہ موصول ہوا۔ اداریے میں مدیر نے ملک اور قوم کی تعمیر میں دیگر شعبوں کے علاوہ اردو زبان وادب کے کردار پر تفصیلی بحث کی ہے۔ یقیناً ہر ملک کا ادب ان کے یہاں کی تہذیب، ملکی، قومی تقاضوں کی تعمیر وتشکیل میں اہم کارنامہ انجام دیتا ہے۔ اس کے علاوہ پٹنہ میں منعقد ہونے والے سہ روزہ قومی سمینار سے متعلق بھی گفتگو کی گئی ہے۔ 'ربط والتفات' کے کالم میں خطوط زیادہ شائع کریں تاکہ رسالہ کی قدر وقیمت اور معائب ومحاسن کا اندازہ ہوجائے۔ ویسے 'اردو دنیا' کا مواد مشمولات اپنے اندر نیاپن لیے ہوئے ہے، اس کے مضامین میں جدت، ندرت اور نیاپن ہوتا ہے۔ سہ روزہ قومی سمینار کو محمد مرجان نے اچھی طرح نوٹ کر کے رپورتاژ کی شکل دی ہے۔ ڈاکٹر ندیم احمد نے 'گاندھی جی کا تعلیمی وژن بنیادی تعلیم سے ڈیجیٹل عہد تک' میں تعلیم کا موقف، اس کے کردار پر گاندھی کے تعلیمی نظریات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ گاندھی جی تعلیم سے اخلاق، کردار، شخصیت سیرت، روحانیت کی تربیت کے قائل تھے۔ غزالہ شیریں نے 'قومی پالیسی برائے تعلیم 2020' میں نئی تعلیمی پالیسی اور علاقائی زبان میں تفصیل سے احاطہ کیا ہے۔ 2020 پالیسی میں مادری زبان کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ اردو کو بھی مادری زبان کے طور پر فوقیت دینا چاہیے اور تمام ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں اردو ایک زبان کے طور پر یا مضمون کی حیثیت سے لازمی پڑھائی جائے تب اس کا فروغ ہوگا۔ نوشاد حسین نے مصنوعی ذہانت کے دور میں بچوں کی پرورش پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے اس کی اہمیت، افادیت کو اچھے انداز سے واضح کیا ہے۔ محمد آصف رضا نے 'اردو زبان کا ڈیجیٹل چہرہ' میں اردو زبان وادب کس طرح ٹکنالوجی ڈیجیٹل ماحول سے مربوط ہورہا ہے، اس کا مثبت بیان ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے 'دورِ حاضر میں پریم چند مطالعہ کی نئی جہتیں' میں ان کے افسانوں اور ناولوں کا نئے انداز سے تجزیہ پیش کیا ہے۔ عبدالرحمٰن نے 'شعری بیانیے میں لفظوں کا انتخاب اور دستور غالب' میں غالب کے اشعار کی تشریح و تعبیر کی ہے۔ ویسے غالب کے ایک شعر کی تشریح وتعبیر پر ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے 150 صفحات کی کتاب لکھی ہے۔ ان کے اشعار میں معنی کی مختلف جہتیں ہیں جتنا غور کریں گے اتنے معنی نکلیں گے۔ اشرف لون نے 'جموں وکشمیر میں اردو ڈراما کے موقف' کو بہت ہی بہتر انداز سے پیش کیا ہے۔ مقیم احمد نے 'سیماب اکبرآبادی کی شعری کائنات' محمد شہاب الدین نے 'یاس یگانہ چنگیزی: جدید اردو غزل کے معمار' اور محمد دانش کی تحریر 'مجروح کا شعری آفاق' بھی اچھا اور معلوماتی مضمون ہے۔ باقی حصہ بھی فکرانگیز، اور بصیرت افروز ہے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ واکیڈمک سینٹ ممبر، تلنگانہ یونیورسٹی، حیدرآباد، تلنگانہ موبائل: 9603018825

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ اردو دنیا کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن ودل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت ومعنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم وہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی ومعروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

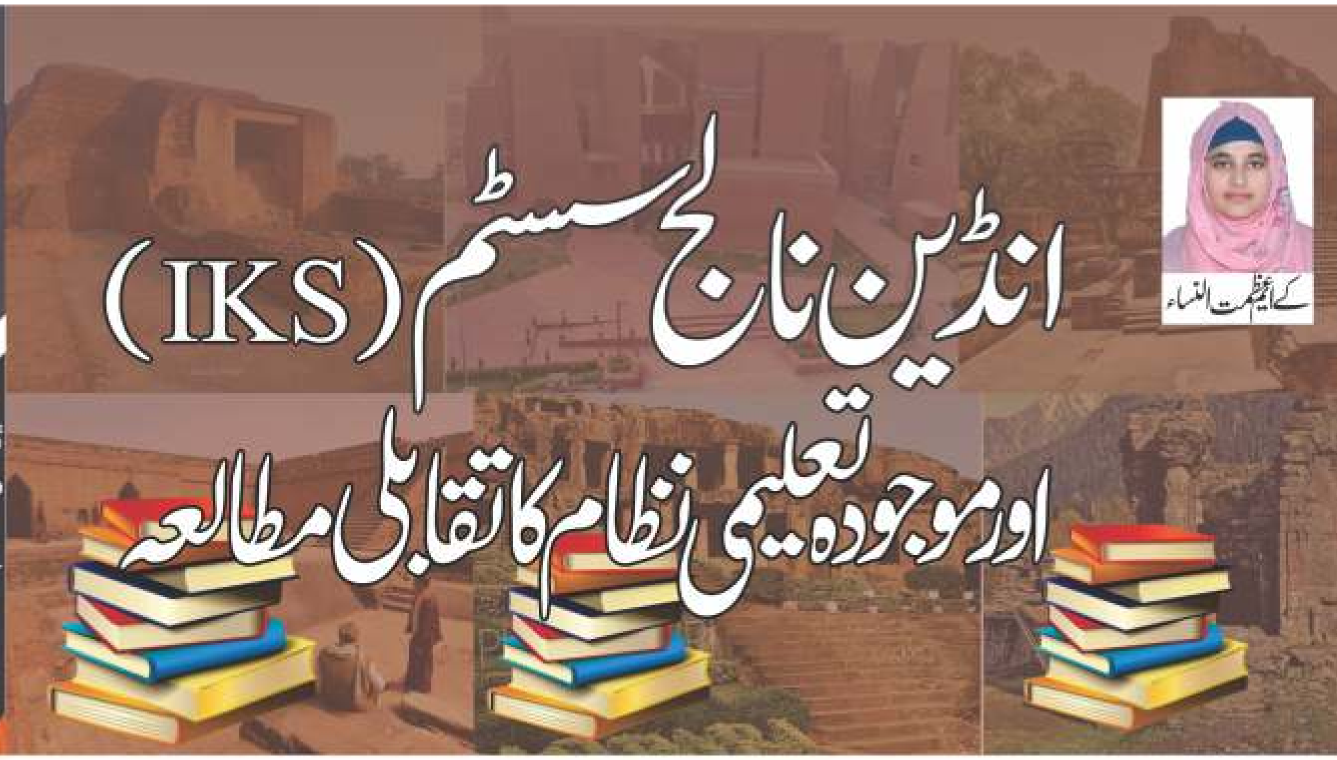

انڈین نالج سسٹم (IKS)
اور موجودہ تعلیمی نظام کا تقابلی مطالعہ
کے اعظمت النساء

ہندوستان دنیا کی ان قدیم ترین اور ہمہ گیر تہذیبوں میں سے ایک ہے جس نے نہ صرف انسانی فکر و شعور کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا بلکہ تمدنی، اخلاقی، سائنسی اور روحانی میدانوں میں بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس سرزمین کا علمی و فکری نظام ہزاروں سال پر محیط ہے جو آج بھی اپنی تابناک روایتوں کا آئینہ دار ہے۔

ہندوستانی تہذیب کی علمی روایت ایک ہمہ جہت اور جامع نظام پر مشتمل ہے جس میں ادب، فلسفہ، طب، فلکیات، علم النفس، اخلاقیات، فنونِ لطیفہ اور دیگر سائنسی وسماجی علوم شامل ہیں۔ یہ روایت صرف نظری علوم تک محدود نہیں بلکہ عملی، اخلاقی اور روحانی ارتقا کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ سنسکرت، پالی، تمل، فارسی، اردو، ہندی اور دیگر زبانوں میں محفوظ علمی سرمائے کی وسعت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ہندوستانی علوم دنیا کے کسی بھی قدیم علمی نظام کے ہم پلہ بلکہ کئی لحاظ سے اس سے برتر رہے ہیں۔

قدیم ہندوستان کا علمی ماحول ہمیشہ اہلِ دانش، مفکرین اور علم کے متلاشیوں کے لیے باعثِ کشش رہا ہے۔ نالندہ، تکشیلا اور وکرم شیلہ جیسے عظیم تعلیمی مراکز نہ صرف برصغیر بلکہ دنیا بھر میں علمی جستجو کے نمایاں مراکز رہے ہیں۔ ان اداروں میں صرف مقامی نہیں بلکہ دنیا کے مختلف خطوں سے تعلق رکھنے والے علما اور فلاسفہ حصولِ علم کی غرض سے آتے تھے، جو ہندوستان کی بین الاقوامی علمی حیثیت کو ظاہر کرتا ہے۔

گزشتہ دو صدیوں میں نوآبادیاتی اثرات کے باعث ہندوستانی نظام تعلیم میں بنیادی نوعیت کے تغیرات رونما ہوئے۔ انگریزوں نے مقامی علمی روایت کو نظرانداز کر کے ایسا تعلیمی نظام متعارف کروایا جو اُن کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی مقاصد کو تقویت دے۔ اس عمل نے نہ صرف مقامی علمی روایت کو پس پشت ڈال دیا بلکہ اخلاقی، روحانی اور تہذیبی علوم کو بھی تعلیمی اداروں سے نکال باہر کیا۔ سچائی کی تلاش، خودی کی پہچان اور تہذیبی خود اعتمادی جیسی اقدار کمزور ہو گئیں اور ان کی جگہ معاشی مفاد کارپوریٹ ملازمت اور مغربی تصورات نے لے لی۔ موجودہ دور کا تعلیمی نظام زیادہ تر اسی نوآبادیاتی ڈھانچے پر استوار ہے جو معاشی پیداوار اور عالمی مسابقت پر زور دیتا ہے۔ اس نظام میں فکر و دانش کی روایتی ہندوستانی روح معدوم ہوتی گئی۔

ہندوستانی قدیم علوم اور جدید تعلیمی نظام کا تقابلی مطالعہ نہ صرف ان دونوں کے نظریاتی اور عملی تفاوت کو نمایاں کرتا ہے بلکہ اس سے تہذیبی ترجیحات، علمی مزاج اور فکری جہتوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے قدیم علمی ورثے کی بازیافت کریں، اس کی معنویت کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کریں اور ایک ایسا تعلیمی نظام تشکیل دیں جو نہ صرف روزگار فراہم کرے بلکہ انسان سازی، فکری بالیدگی اور تمدنی خود شعوری کا بھی ضامن ہو۔

اسی تناظر میں حکومتِ ہند نے 'نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020' کے ذریعے ایک بامعنی کوشش کی ہے تاکہ ہندوستان کے قدیم علمی ورثے کو موجودہ تعلیمی نظام سے ہم آہنگ کیا جا سکے۔ اس پالیسی کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس میں ہندوستانی علوم و فنون، فلسفہ، زبانوں اور روحانی روایات کو نصاب کا حصہ بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ سنسکرت، یوگا، آیوروید، نیتی شاستر، ویدانت، بھگوت گیتا، بدھ و جین فلسفہ اور دیگر کلاسیکی علوم کو جدید تعلیم کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ طلبا صرف روزگار ہی نہیں بلکہ فکری بصیرت اور اخلاقی تربیت بھی حاصل کریں۔

NEP-2020 کے مطابق علم کو صرف معلومات کی ترسیل نہیں بلکہ شخصیت سازی (Personality Development) اور معاشرتی شعور (Social Awareness) کی بیداری کا ذریعہ سمجھا گیا ہے۔ قدیم علم کی روایت کو موجودہ تحقیق، ٹیکنالوجی اور تخلیقی اظہار کے ساتھ مربوط کر کے ایک ایسا نظام تشکیل دینے کی کوشش ہو رہی ہے جو بیک وقت مقامی ہو اور عالمی بھی، روایتی بھی ہو اور جدید بھی۔

قدیم ہندوستان کی تعلیمی روایت

روایتی تعلیم محض علم کی ترسیل کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک مکمل طرزِ حیات تھی جو فرد کی روحانی، اخلاقی، سماجی اور عملی تربیت پر مشتمل تھی۔ قدیم ہندوستان میں گروکل یا گروکلم (Gurukula or Gurukulam) اسی نظامِ تعلیم کا مرکز تھا، جہاں شاگرد (ششیہ) اپنے استاد (گرو) کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتا اور نہ صرف علم حاصل کرتا بلکہ زندگی گزارنے کے عملی طریقے بھی سیکھتا

تھا۔ گرو اور ششیہ کے درمیان تعلق کو ایک مقدس رشتہ سمجھا جاتا تھا۔ جو خلوص، احترام اور عقیدت پر مبنی ہوتا تھا۔ شاگرد اپنے گرو کی خدمت کرتا، روزمرہ کے گھریلو کاموں میں حصہ لیتا اور یوں وہ نہ صرف تعلیمی بلکہ عملی زندگی کی ذمہ داریوں کے لیے بھی تیار ہوتا تھا۔ بعض علما کے مطابق یہ گھریلو کام محض خدمت نہیں بلکہ تعلیم کا ایک اہم حصہ تھے۔ جن سے نظم وضبط، خود انحصاری اور قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔

گروکل میں تعلیم کا طریقہ زبانی یادداشت پر منحصر ہوتا تھا۔ استاد سبق سناتے اور شاگرد تکرار کے ذریعے اُسے یاد کرتے۔ نہ تو تحریری کام کا کوئی خاص رواج تھا اور نہ ہی امتحانات کو رسمی شکل دی جاتی تھی۔ طلبا زبانی سوالات کے ذریعے جانچے جاتے اور ان کی فکری پختگی کو پرکھا جاتا تھا۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد شاگرد اپنے گرو کو گرو دکشنا (ہدیہ) پیش کرتا جو کہ عقیدت، شکرگزاری اور اخلاقی ذمہ داری کا مظہر ہوتا۔ یہ دکشنا مالی بھی ہو سکتی تھی یا پھر استاد کے کہنے پر کوئی خاص خدمت بھی انجام دی جا سکتی تھی۔

روایتی تعلیم کا بنیادی مقصد فرد کو سماج کا ایک باوقار، ذمہ دار اور بااخلاق رکن بنانا تھا۔ اس تعلیم میں معاشرتی روایات، تہذیب، مذہب، رسم و رواج، سلوک، احترام، بزرگوں کی خدمت اور خاندانی اقدار کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شاگرد کئی مہینوں بلکہ برسوں تک گرو کے ساتھ رہتے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں میں مکمل تربیت حاصل کرتے۔ اس نظام میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی وہ تفصیلات شامل نہیں تھیں جو آج کل کی تعلیم میں شامل ہیں۔

روایتی تعلیم کا تقابل اگر ہم جدید تعلیم سے کریں تو واضح فرق نظر آتا ہے۔ جدید تعلیم معلومات، پیشہ ورانہ مہارت اور سائنسی ترقی پر زور دیتی ہے، جب کہ روایتی تعلیم انسان کی مجموعی شخصیت، اخلاقی کردار، روحانی شعور اور سماجی ذمہ داریوں پر توجہ مرکوز رکھتی تھی۔ آج کا تعلیمی نظام اگرچہ سہولتوں سے بھرپور ہے لیکن اس میں وہ قلبی و اخلاقی گہرائی کم نظر آتی ہے جو روایتی نظام کا طرۂ امتیاز تھی۔

اس تمام تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ روایتی تعلیم صرف ایک نصابی سرگرمی نہیں تھی بلکہ ایک جامع تربیتی عمل تھا۔ گروکل ایک ایسا ماحول فراہم کرتا تھا جس میں علم کے ساتھ ساتھ کردار سازی، خدمت، انکساری اور سادگی کو فروغ دیا جاتا تھا۔ آج جب کہ ہم تعلیم کو صرف ایک پیشہ ورانہ سیڑھی یا معاشی کامیابی کا ذریعہ سمجھنے لگے ہیں، ہمیں چاہیے کہ ہم روایتی نظامِ تعلیم کی اعلیٰ اقدار کو اپنے موجودہ تعلیمی نظام میں دوبارہ زندہ کریں تاکہ ہماری نسلیں علم کے ساتھ ساتھ انسانیت، تہذیب اور اخلاقیات سے بھی بہرہ مند ہو سکیں۔

قدیم تعلیمی نظام کی خصوصیات

قدیم ہندوستان میں تعلیم کا نظام فطری، عملی اور خاندانی روایتوں سے جڑا ہوا تھا۔ بچوں کی تعلیم کا آغاز عموماً گھر سے ہوتا تھا، جہاں والد اپنے بیٹے کو وہی ہنر، پیشہ یا مذہبی علم سکھاتا تھا جس سے خود وابستہ ہوتا۔ اس طرح ایک پیشے کی مہارت نسل در نسل منتقل ہوتی تھی اور معاشرے میں ہر فرد کو اپنی ذمے داری کا واضح شعور ہوتا تھا۔ ڈاکٹر کپل دیو لکھتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے:

''قدیم ہندوستان کا نظامِ تعلیم ایک شاندار اور بامقصد نظام تھا۔ قدیم ہندوستان میں تعلیم کا تصور عظیم، بلند اور باوقار تھا۔ اس کا مقصد ''زندگی کی ہمہ گیر تربیت'' فراہم کرنا اور مرد و خواتین کے کردار کو زندگی کی جدوجہد کے لیے تیار کرنا تھا۔ سوامی ویویکانند نے کہا کہ 'تعلیم انسان سازی اور کردار سازی ہے' کے لیے ہے۔''

وقت کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں دو بڑے تعلیمی دھارے ابھر کر سامنے آئے 'ویدک نظامِ تعلیم' اور 'بدھ مت کا تعلیمی نظام'۔ ویدک نظام میں مذہبی علوم جیسے وید، ویدانت، اپنشد اور روحانی فلسفے کی تعلیم دی جاتی تھی، جس کا مقصد فرد کو دھرم (فرض)، گیان (علم) اور موکش (نجات) کی راہ پر گامزن کرنا تھا۔ اس نظام میں ذریعہ تعلیم سنسکرت زبان تھی جو علمی اور مذہبی حلقوں کی زبان سمجھی جاتی تھی۔

دوسری طرف بدھ مت کا تعلیمی نظام علم کی وسعت، منطق، فلسفے اور بدھ مت کے مختلف مکاتبِ فکر پر مبنی تھا۔ یہاں تعلیم کا ذریعہ پالی زبان تھی جو عام لوگوں میں زیادہ رائج تھی۔ اس لیے بدھ مت کی تعلیم عام طبقے تک بھی پہنچ سکی۔

ان دونوں مذہبی نظاموں کے ساتھ ساتھ ایک خالص پیشہ ورانہ تعلیم بھی رائج تھی۔ اس میں ماہر کاریگر جیسے کمہار، لوہار، بڑھئی، مصور اور دیگر ہنرمند افراد اپنی مہارتیں شاگردوں کو سکھاتے تھے۔ یہ شاگرد کئی سال تک اپنے استاد کے ساتھ رہ کر عملی کام سیکھتے اور مہارت حاصل کرتے جسے آج اپرنٹس شپ (Apprenticeship) ' کہا جاتا ہے۔ ان تمام نظاموں کا امتزاج مذہب، پیشہ اور اخلاقیات پر مبنی ایک جامع تعلیمی ڈھانچہ پیش کرتا تھا۔ ان نظاموں نے نہ صرف علم اور ہنر کو فروغ دیا بلکہ معاشرتی ذمہ داریوں، روحانی ترقی اور ذاتی کردار سازی پر بھی زور دیا۔

قدیم ہندوستان کی عظیم درسگاہیں

قدیم ہندوستان کو بجا طور پر علم و دانش کی سرزمین کہا جا سکتا ہے، جہاں صدیوں پہلے وہ ادارے قائم ہوئے جنھیں دنیا کی قدیم ترین اور عظیم ترین جامعات تسلیم کیا جاتا ہے۔ جن میں نمایاں نام ٹکششیلا (Taxila)، نالندہ (Nalanda)، وکرمشیلا (Vikramshila)، ولبھی (Vallabhi)، اودنت پوری (Odantapuri)، شارده پیٹھ (Sharada Peeth) اور پشپگیری (Pushpagiri) وغیرہ ہیں۔ یہ درسگاہیں نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا میں علمی و تہذیبی زندگی کی علامت تھیں اور چھٹی صدی قبل مسیح سے تیرہویں صدی عیسوی تک علم و فضل کی شمع روشن کرتی رہیں۔

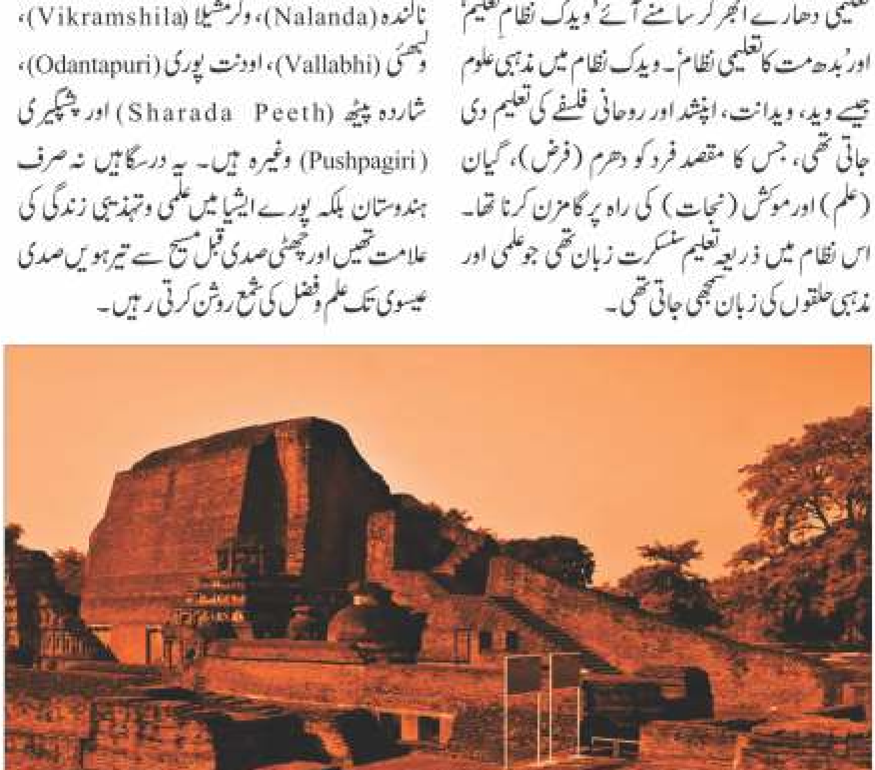

1. تکششیلا (Taxila)

تکششیلا کو دنیا کی اولین یونیورسٹیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ موجودہ پاکستان کے علاقے راولپنڈی کے قریب واقع اس ادارے کا آغاز چھٹی صدی قبل مسیح کے آس پاس ہوا۔ یہاں پر منطق، فلسفہ، علم فلکیات، علم نجوم، فنون لطیفہ، طب، جراحی، ریاضی، تیراندازی، جنگی علوم اور تجارت، زراعت وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مشہور مفکر چانکیہ (کاوٹلیہ)، سنسکرت کے عظیم نحوی پنینی اور طبیب چرا کا اسی درسگاہ سے وابستہ تھے۔

2. نالندہ (Nalanda)

نالندہ کی بنیاد پانچویں صدی عیسوی میں کمار گپت اوّل نے رکھی۔ یہ بہار میں واقع دنیا کی سب سے بڑی بدھ متی یونیورسٹی تھی، جہاں ایک وقت میں دس ہزار طلبہ اور ہزار اساتذہ مقیم تھے۔ نالندہ میں صرف بدھ مت ہی نہیں بلکہ ریاضی، فلکیات، طب، فلسفہ اور ادب جیسے علوم بھی پڑھائے جاتے تھے۔ اس مرکز کی خصوصیت کو بیان کرتے ہوئے یوآن چوانگ کہتا ہے:

''اس نظام میں تقریباً کچھ ہزار اراکین تھے۔ سب کے سب بڑے عالم اور قابل لوگ تھے۔ سیکڑوں بلند پائے کے اور مشہور تھے۔ اراکین اپنی جماعت کی تعلیمات اور قواعد وضوابط کی پابندی میں بہت سخت تھے۔ مطالعہ اور بحث ومباحثہ کے لیے انھیں دن بہت چھوٹا لگتا تھا۔ دن رات وہ ایک دوسرے کو سمجھاتے رہتے تھے۔ چھوٹے اور بڑے کمال حاصل کرنے میں آپس میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرتے تھے۔ لہٰذا بیرونی ممالک کے طلبہ اپنے شکوک رفع کرنے کے لیے اس نظام میں آئے اور بعد میں وہ بہت مشہور ہوئے اور جنھوں نے نالندا میں نام حاصل کیا وہ جہاں بھی گئے تمام نے بڑی عزت پائی۔''

(قدیم ہندوستان میں تعلیم، ڈاکٹر اے ایس الٹیکر مترجم ابو یوسف، ص120، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1985)

نالندہ کے منتظمین نے ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا جو اس یونیورسٹی کے سینکڑوں اساتذہ اور ہزاروں طلبہ کی علمی ضروریات پوری کرتا تھا۔ یہاں مختلف علوم و فنون کی نایاب کتابیں موجود تھیں۔ چینی علما مہینوں نالندہ میں قیام کرتے تاکہ مقدس نسخوں اور دیگر علمی کتابوں کی مستند نقول تیار کرسکیں۔ مشہور سیاح آئی سنگ نے یہاں سے سنسکرت کی چار سو کتابوں کی نقول کیں، جو پانچ لاکھ اشعار پر مشتمل تھیں۔ یہ کتب خانہ 'دھرم گنج' یا 'مذہبی منڈی' کے نام سے مشہور تھا اور تین شاندار عمارتوں پر مشتمل تھا جنھیں 'رتن ساگر'، 'رتنو داھی' اور 'رتنا رانجکا' کہا جاتا تھا۔

3. ولبھی یونیورسٹی (Vallabhi)

چھٹی صدی عیسوی میں گجرات کے حکمران میترک خاندان نے ولبھی یونیورسٹی قائم کی۔ یہ ادارہ ویدانت، جین مت، بودھ مت اور ریاستی علوم کی تعلیم کا بڑا مرکز تھا۔ تبتی اور چینی سیاحوں نے اس کی شہرت کا ذکر کیا ہے۔

4. وکرمشیلا یونیورسٹی (Vikramshila)

آٹھویں صدی میں دھرم پالا نے بہار میں اس یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ یہ ادارہ خاص طور پر تنتر واد (Tantric Buddhism) کے مطالعے کے لیے مشہور تھا۔ تبتی ماخذ کے مطابق یہاں ہزاروں طلبا زیر تعلیم

تھے۔ نالندہ کے بعد یہ بدھ متی تعلیم کا دوسرا سب سے بڑا مرکز تھا۔

5. اودنت پوری یونیورسٹی (Odantapuri)

اودنت پوری یونیورسٹی قدیم بھارت کا ایک نمایاں تعلیمی و بدھ مت مرکز تھا، جو موجودہ بہار کے علاقے مگدھ میں واقع تھا۔ اس عظیم ادارے کی بنیاد 8ویں صدی میں پال سلطنت کے بانی گوپال نے رکھی تھی۔ یہ یونیورسٹی نالندہ اور وکرمشیلا جیسے ممتاز اداروں کے ہم پلہ تھی اور علم ودانش کے پیاسے ہزاروں طلبا یہاں دور دراز سے آیا کرتے تھے، جن کی تعداد بارہ ہزار سے بھی زائد بتائی جاتی ہے۔

6. شاردہ پیٹھ (Sharada Peeth)

شاردا پیٹھ قدیم ہندوستان کا ایک درخشاں علمی اور روحانی مرکز تھا، جو علم وحکمت کا ایک عظیم گہوارہ تھا۔ چھٹی صدی سے بارہویں صدی کے دوران یہ ادارہ اپنے عروج پر تھا اور اس نے دنیا بھر سے علم کے متلاشیوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ مقام اپنے وسیع و عریض کتب خانے، سنسکرت زبان کے فروغ اور شاردا رسم الخط کی تخلیق وترقی میں ایک بنیادی حیثیت رکھتا تھا۔ برصغیر کے ساتھ ساتھ دور دراز علاقوں کے محققین، فلسفی اور مذہبی اسکالرز یہاں آکر تعلیم حاصل کرتے تھے۔

شاردا پیٹھ نہ صرف تعلیم وتحقیق کا مرکز تھا بلکہ روحانی روشنی کا مینار بھی تھا جس کی گونج آج بھی تاریخ کے اوراق میں سنائی دیتی ہے۔

7. پشپگیری یونیورسٹی (Pushpagiri)

پشپگیری جسے پشپگیری مہاویہار بھی کہا جاتا ہے، قدیم ہندوستان کا ایک اہم بدھ مت تعلیمی مرکز تھا، جو موجودہ اڑیسہ (اوڈیشہ) میں تیسری سے گیارہویں صدی تک سرگرم رہا۔ یہ خوبصورت خانقاہی ادارہ لنگوڈی پہاڑی پر واقع تھا اور نالندہ جیسا بااثر مقام رکھتا تھا۔

چینی سیاح ہیون سانگ (Xuanzang) نے اس کا ذکر کیا اور برہمی کتبوں میں اسے 'پھولوں سے بھری پہاڑی' کہا گیا ہے۔ آثار قدیمہ کی کھدائیوں سے اس کی عظمت کے آثار ملے ہیں۔ آج بھی اس کے کھنڈرات میں سٹوپے، خانقاہیں اور مجسمے تاریخ کی گواہی دیتے ہیں۔

یہ تمام جامعات اپنی وسعت، تنوع اور بین الاقوامی طلبا کے باعث محض تعلیمی ادارے ہی نہیں تھیں بلکہ اپنے وقت کی عالمی درسگاہیں تھیں۔ یہاں ایشیا کے مختلف خطوں سے طلبا آتے اور علم حاصل کرکے دنیا کے دیگر علاقوں تک روشنی پھیلاتے۔ ان اداروں نے نہ صرف ہندوستانی تہذیب کو علمی وقار بخشا بلکہ عالمی

تاریخ میں بھی اپنے گہرے نقوش چھوڑے۔

قدیم ہندوستان میں خواتین کی تعلیم

قدیم ہندوستانی تہذیب میں خواتین کی تعلیم کو خاص مقام حاصل تھا۔ عورتوں کو صرف گھریلو ذمہ داریوں کی تربیت تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ انھیں رقص، موسیقی اور مذہبی تعلیمات میں بھی مہارت حاصل کرنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ 'اُپنین سنسکار' (Upanayana Sanskar) جو ابتدائی مذہبی تعلیم کے آغاز کی علامت تھی، لڑکیوں کے لیے بھی ضروری سمجھی جاتی تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خواتین کو روحانی اور علمی میدان میں شریک ہونے کی اجازت حاصل تھی۔

تعلیم یافتہ خواتین کو اُن کے تعلیمی رجحان کے اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا:

1. سدیوُ دواہا (Sadyodwahas) وہ خواتین جو شادی سے پہلے تک تعلیم حاصل کرتی تھیں اور بعد ازاں گھریلو زندگی اختیار کر لیتی تھیں۔

2. برہماوادینی (Brahmavadinis) وہ خواتین جنھوں نے تجرد کی زندگی اختیار کی اور ساری عمر علم اور تعلیم کے لیے وقف کر دی۔

ایسی خواتین کو ویدوں اور ویدانگ (Vedangas) کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اگرچہ یہ تعلیم اکثر مذہبی نظموں اور رسومات سے متعلق گیتوں تک محدود رہتی تھی۔ اس کے باوجود کئی خواتین نے علمی دنیا میں بلند مقام حاصل کیا۔ اپالا (Apala)، اندرانی (Indrani)، گھوشا (Ghosha)، لوپامدرا (Lopamudra)، گارگی (Gargi) اور میتریئی (Maitreyi) جیسی قابلِ احترام خواتین نہ صرف ویدوں کی عالمہ تھیں بلکہ انھوں نے فلسفہ، مذہب اور روحانیت جیسے سنجیدہ موضوعات پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ ڈاکٹر سید عبد اللطیف اپنی کتاب 'مختصر تاریخ ثقافت ہند' میں لکھتے ہیں:

''خاندان میں عورتوں کو بلند اور معزز مقام حاصل تھا۔ گرہا پتنی گھر کی زیب و زینت سمجھی جاتی تھی اور تمام مذہبی اور سماجی کام کاج میں اپنے شوہر کے مساوی رتبہ رکھتی تھی۔ عورتوں کی تعلیم کا معیار بھی بلند تھا۔ وید کے بعض بھجن خواتین کی تخلیق ہیں۔ یہ خواتین وسوا وارا، گوشا، اپالا وغیرہ تھیں۔ گارگی ایک بڑی عالمہ تھی۔ اس نے فلسفیانہ مسائل پر فلسفیوں کی مجلس سے خطاب کیا تھا۔ بڑے بزرگ سنیاسی والکیا کی بیوی میتری روحانی مسائل پر مستند مانی جاتی تھی اور اس کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔'' (ص 24-25)

قدیم ہندوستانی تہذیب میں خواتین کی تعلیم کو خاص مقام حاصل تھا۔ عورتوں کو صرف گھریلو ذمہ داریوں کی تربیت تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ انھیں رقص، موسیقی اور مذہبی تعلیمات میں بھی مہارت حاصل کرنے کا موقع دیا جاتا تھا۔

یہ اس بات کا مظہر ہے کہ قدیم ہندوستانی معاشرے میں خواتین کو علمی اور فکری ترقی کا بھرپور حق حاصل تھا اور وہ اس میدان میں مردوں کے شانہ بشانہ نظر آتی تھیں۔

قدیم ہندوستان میں تعلیم کے طریقہ کار

قدیم ہندوستانی تعلیمی نظام میں تدریس کا انداز فکری اور عملی دونوں پہلوؤں پر مشتمل تھا۔ تعلیم زیادہ تر زبانی ترسیل کے ذریعے دی جاتی تھی جس میں سننا (Shravana)، غور کرنا (Manana) اور گہرے تدبر سے سمجھنا (Nididhyasana) بنیادی طریقے تھے۔ اساتذہ شاگردوں کی ذہنی استعداد کے مطابق تعلیم دیتے اور انھیں حفظ، غور و فکر، سوال و جواب، مناظروں، کہانی گوئی اور عملی مشقوں کے ذریعے علم میں پختگی عطا کرتے تھے۔ طلبا کو صرف رٹوانے کے بجائے تنقیدی سوچ سکھائی جاتی تاکہ وہ سیکھے گئے علم کو عملی زندگی میں نافذ کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے سیمینارز اور مباحثے منعقد ہوتے جن سے طلبا کو اظہارِ خیال اور سننے سمجھنے کی تربیت ملتی۔ یوں یہ نظام محض معلومات کی ترسیل نہیں بلکہ شخصیت سازی اور ذہنی ارتقا کا ہمہ گیر ذریعہ تھا۔

جدید تعلیم

زمانے کے بدلتے تقاضوں کے ساتھ تعلیم کے اسلوب اور مقاصد بھی تبدیل ہوتے گئے ہیں۔ اُرمیلا یادو (Urmila Yadav) اپنے ایک مضمون میں اس تبدیلی کے حوالے سے لکھتی ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے:

''جدید کاری، صنعتی ترقی، شہری نظام، نجی کاروبار، عالمگیریت اور مغربی ثقافت کے اثرات جیسے مختلف تغیرات کی وجہ سے ہندوستانی معاشرے میں بہت سے مسائل اور برائیاں پیدا ہوئیں، جو ہندوستانی نظامِ تعلیم میں اخلاقی اقدار کے زوال کا سبب بنیں۔ اگرچہ اس نظامِ تعلیم نے شرحِ خواندگی (Literacy rate) میں اضافہ کیا ہے لیکن یہ معاشرے میں حقیقی معنوں میں تعلیم یافتہ افراد پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے، جس کے نتیجے میں ملک میں مثالی شہری پیدا نہیں ہو پاتے۔ ہندوستانی طلبا کا بنیادی مقصد محض ڈگری حاصل کرنا، پیسہ کمانا اور کیریئر بنانا رہ گیا ہے بغیر اس کے کہ وہ اپنی زندگی میں اخلاقی اقدار اور قومی جذبے کو کوئی خاص اہمیت دیں۔''

جہاں ماضی میں تعلیم کا مرکز روایتی اقدار، مذہبی علوم اور محض یادداشت پر انحصار تھا وہیں جدید تعلیم نے انسان کی فکری، سائنسی اور تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ آج کے تعلیمی اداروں میں نصاب کو اس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ وہ موجودہ دور کی ضروریات پوری کرے، اسی لیے سائنس و ٹیکنالوجی، طب، انفارمیشن ٹیکنالوجی اور دیگر جدید شعبوں کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ جدید تعلیم محض نظری معلومات تک محدود نہیں بلکہ مہارتوں کے فروغ پر زور دیتی ہے تاکہ طلبا عملی زندگی میں کامیاب ہو سکیں۔ تدریسی انداز بھی کثیر الجہتی ہے، جس میں سننے کے ساتھ ساتھ لکھنے، دیکھنے، سوچنے، تجزیہ کرنے اور خود سے تصور قائم کرنے کی تربیت دی جاتی ہے، جس سے یادداشت بہتر ہونے کے ساتھ تخلیقی صلاحیتیں بھی نکھرتی ہیں۔ طلبا کی علمی پیش رفت کو جانچنے کے لیے تحریری امتحانات، پروجیکٹس، اسائنمنٹس اور عملی مشقوں کا منظم اہتمام کیا جاتا ہے جب کہ تدریس کو زیادہ مؤثر اور دلچسپ بنانے کے لیے سوال و جواب، مباحثے، گروہی سرگرمیوں اور جدید تدریسی آلات کا سہارا لیا جاتا ہے۔ دراصل جدید تعلیم روایتی تعلیم ہی کی توسیع اور ارتقا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ جہاں پرانی تعلیم حفظ اور تقلید پر مبنی تھی، وہیں نئی تعلیم تحقیق، تجربے اور تخلیق کو بنیاد بناتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید تعلیم نہ صرف فرد کو روزگار کے قابل بناتی ہے بلکہ اس کی سوچ، کردار اور رویے میں

وسعت پیدا کرتے ہوئے اسے معاشرے کا باشعور، فعال اور باصلاحیت رکن بھی بناتی ہے۔

روایتی تعلیم اور جدید تعلیم ایک تقابلی جائزہ

تعلیم انسانی تہذیب کی بنیاد ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ مختلف ادوار سے گزرتی ہوئی آج کے جدید دور تک پہنچی ہے۔ روایتی اور جدید تعلیم دونوں اپنی نوعیت اور مقاصد کے لحاظ سے مختلف ہیں مگر ایک دوسرے سے منسلک بھی ہیں۔

قدیم دور میں جب باقاعدہ اسکولوں کا نظام موجود نہ تھا تو بچوں کو تعلیم ان کے آباواجداد سے ملتی تھی۔ یہ تعلیم بنیادی طور پر روزمرہ زندگی گزارنے کی مہارتوں پر مبنی ہوتی تھی جیسے شکار کرنا، اوزار بنانا، جانوروں کی کھالوں کا استعمال اور مختلف رسم و رواج کو اپنانا وغیرہ۔ مذہب، عبادات اور اخلاقیات کا علم زبانی روایات کے ذریعے نسل در نسل منتقل ہوتا تھا۔ اسی دور میں ہندوستان میں 'گروکل' کا نظام رائج تھا۔ جہاں بادشاہ اپنے بچوں کو بھیجتے تھے۔ یہاں شہزادوں کو جنگی فنون، حکمرانی کے اصول اور مذہبی و اخلاقی تعلیم دی جاتی تھی۔ مگر یہ ادارے صرف اشرافیہ کے لیے مخصوص تھے جب کہ عام لوگ اپنے والدین سے ہنر سیکھ کر عملی زندگی میں قدم رکھتے تھے۔ وقت کے ساتھ جب جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آیا تو تعلیم عام لوگوں تک بھی پہنچنے لگی۔ اسکول قائم ہوئے جہاں ہر طبقے کے بچے پڑھنے لگے۔ یہی جدید تعلیم کی شروعات تھی جس نے معاشرے کو ترقی کی نئی راہوں پر گامزن کیا۔

جدید تعلیم کا باقاعدہ نظام برطانوی راج کے دوران وجود میں آیا۔ 1835 میں لارڈ میکالے (Lord Macaulay) نے انگریزی تعلیم کا آغاز کیا اور پھر 1854 میں وڈز ڈیسپیچ (Wood's Dispatch) نے جدید تعلیمی ڈھانچے کی بنیاد رکھی جسے 'ہندوستانی تعلیم کا میگنا کارٹا' بھی کہا جاتا ہے۔ اس نظام کا مقصد انگریزی بولنے والے کلرک تیار کرنا تھا تاکہ وہ برطانوی حکومت کی مقامی انتظامیہ چلا سکیں۔ اس دور میں اسکولوں میں ابتدائی تعلیم مقامی زبانوں میں جب کہ اعلیٰ تعلیم انگریزی میں دی جاتی تھی۔ برطانوی حکومت نے بعض روایتی تعلیمی اداروں کو مالی امداد دینا شروع کی جس سے آہستہ آہستہ کئی ادارے سرکاری امدادی اسکول بن گئے۔

یوں روایتی تعلیم سے جدید تعلیم کا سفر نہ صرف علم کی وسعت کا مظہر ہے بلکہ یہ تبدیلی معاشرتی، فکری اور سائنسی ترقی کی علامت بھی بن چکی ہے۔

گویا روایتی اور جدید دونوں نظام تعلیم کی اپنی اپنی اہمیت اور افادیت ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو مکمل طور پر بہتر یا ناقص کہنا درست نہیں ہوگا کیونکہ ہر نظام نے اپنے دور کی ضروریات کو پورا کیا ہے۔ روایتی تعلیم اُس وقت کے معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی تقاضوں سے ہم آہنگ تھی جب کہ جدید تعلیم آج کے سائنسی و تکنیکی دور کی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔

بلاشبہ جدید تعلیم اپنی بنیادیں روایتی تعلیم ہی سے حاصل کرتی ہے مگر بدقسمتی سے آج کے دور میں روایتی نظامِ تعلیم کو یکسر نظرانداز کیا جارہا ہے۔ اس رویے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ہماری تہذیبی، اخلاقی اور ثقافتی شناخت دھندلانے لگتی ہے، جو ایک قوم کے فکری وجود کے لیے نہایت نقصان دہ ہے۔

اصل فرق فرد کی دلچسپی اور سیکھنے کے مقصد میں ہے۔ اگر کوئی فرد اپنی تہذیب، ثقافت، مذہب اور روایات کے بارے میں جاننا چاہتا ہے تو روایتی تعلیم اس کے لیے بہتر انتخاب ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی سائنس، ٹیکنالوجی یا ریاضی جیسے جدید مضامین میں مہارت حاصل کرنا چاہے تو جدید تعلیم ہی اس کی ضرورت ہے۔

روایتی تعلیم ہماری شناخت، ثقافتی ورثے اور مذہبی شعور سے جُڑی ہوتی ہے، جو انسان کی جڑوں سے وابستگی کو مضبوط بناتی ہے۔ دوسری طرف جدید تعلیم انسان کو دنیا کے بدلتے ہوئے حالات، ترقی یافتہ علوم اور عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں سے ہم آہنگ رکھتی ہے۔ لہٰذا دونوں نظام تعلیم اپنی جگہ ضروری اور مکمل ہیں اور ایک متوازن شخصیت کی تشکیل کے لیے ان دونوں سے فائدہ اٹھانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

کسی ایک تعلیمی نظام کو دوسرے پر فوقیت دینا آسان نہیں کیونکہ روایتی اور جدید دونوں تعلیم اپنی اپنی جگہ اہمیت اور افادیت رکھتی ہیں۔ روایتی تعلیم نے صدیوں تک انسانی فکر، اخلاق اور تہذیبی قدروں کو محفوظ رکھا اور نسل در نسل منتقل کرنے کا فریضہ انجام دیا جب کہ جدید تعلیم نے انسان کو سائنسی شعور، تجرباتی فکر اور عملی زندگی کے لیے ضروری مہارتیں عطا کیں۔ بلاشبہ جدید تعلیم اپنی بنیادیں روایتی تعلیم ہی سے حاصل کرتی ہے مگر بدقسمتی سے آج کے دور میں روایتی نظامِ تعلیم کو یکسر نظرانداز کیا جارہا ہے۔ اس رویے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ہماری تہذیبی، اخلاقی اور ثقافتی شناخت دھندلانے لگتی ہے، جو ایک قوم کے فکری وجود کے لیے نہایت نقصان دہ ہے۔

ایک متوازن اور صحت مند معاشرے کی تشکیل اسی وقت ممکن ہے جب ہم دونوں نظاموں کے فوائد کو یکجا کریں۔ روایتی تعلیم ہمیں اپنی جڑوں، اقدار، اخلاقیات اور تاریخی شعور سے جوڑتی ہے جب کہ جدید تعلیم ہمیں سائنس، ٹیکنالوجی اور بدلتے ہوئے دور کے تقاضوں کے مطابق آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ اگر ہم محض جدید تعلیم پر انحصار کریں تو خطرہ ہے کہ ہماری تہذیبی اساس کھو جائے گی اور اگر صرف روایتی تعلیم کو اختیار کریں تو ہم عملی زندگی اور ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ماضی کی دانش اور حال کی سائنس کو یکجا کریں۔ یہی امتزاج ہمیں فکری پختگی، سماجی توازن اور باشعور ترقی کی راہوں پر گامزن کرسکتا ہے۔ ایک ایسا تعلیمی نظام جو روایت اور جدت دونوں کا حسین امتزاج ہو نہ صرف انفرادی سطح پر انسان کو باشعور اور باصلاحیت بناتا ہے بلکہ اجتماعی سطح پر معاشرے کو ترقی یافتہ، مہذب اور اپنی شناخت کا محافظ بھی ثابت کرتا ہے۔

■

KM Azmatunisa
Editorial Assistant , NCERT
New Delhi - 110016
Mob.: 9718665026
Email: azmatunisa36@gmail.com

شمولیاتی تعلیم کی روشن دنیا

مظفر اسلام

تعلیم انسانی ترقی اور سماجی انصاف کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔ یہ نہ صرف فرد کی شخصیت کو نکھارتی ہے بلکہ ایک مہذب، روشن خیال اور ہم آہنگ معاشرے کی تشکیل میں بھی بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ ایک فرد جب تعلیم حاصل کرتا ہے تو وہ صرف علمی مہارتیں ہی نہیں سیکھتا بلکہ سوچنے، مسئلہ حل کرنے، اور تخلیقی صلاحیتوں کو فروغ دینے کی صلاحیت بھی حاصل کرتا ہے۔ تعلیم کے ذریعے انسان اپنے حقوق، ذمہ داریوں اور اخلاقی اقدار کو سمجھتا ہے اور سماجی زندگی میں فعال کردار ادا کرنے کے قابل بنتا ہے۔ تاہم، اگر تعلیم سب کے لیے یکساں مواقع فراہم نہ کرے تو اس کی افادیت اور اثر کم ہو جاتا ہے، اور معاشرتی نابرابری کے مسائل مزید گہرے ہو جاتے ہیں۔ اسی پس منظر میں 'شمولیاتی تعلیم' (Inclusive Education) کا تصور ابھرا، جو اس بات پر زور دیتا ہے کہ کوئی بھی بچہ سماجی، معاشی، لسانی یا جسمانی فرق کی بنیاد پر تعلیم کے بنیادی حق سے محروم نہ رہے۔ شمولیاتی تعلیم کا مقصد ایسا تعلیمی ماحول فراہم کرنا ہے جس میں تمام بچے اپنی انفرادی صلاحیتوں اور ضروریات کے مطابق سیکھیں اور ترقی کریں۔ یہ تعلیم صرف معذور یا پسماندہ طلبہ کو مرکزی دھارے میں شامل نہیں کرتی بلکہ ایک ایسا سماجی ڈھانچہ بھی تشکیل دیتی ہے جو مساوات، رواداری، احترام، اور باہمی تعاون کی بنیاد پر قائم ہو۔

علاوہ ازیں، آج کے دور میں شمولیاتی تعلیم کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے کیونکہ دنیا تیزی سے گلوبلائزیشن، لسانی و ثقافتی تنوع اور معاشرتی پیچیدگیوں کی طرف بڑھ رہی ہے۔ مختلف زبانوں، ثقافتوں، اور پس منظر کے بچے جب ایک ہی کلاس روم میں بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں تو وہ نہ صرف علمی اور ذہنی ترقی کرتے ہیں بلکہ زندگی کے لیے درکار اعلیٰ انسانی اقدار، جیسے برداشت، رواداری، احترام، اور انسان دوستی، بھی سیکھتے ہیں۔ اس عمل کے ذریعے بچے معاشرتی ہمدردی اور ہم آہنگی کے جذبے کے ساتھ بڑے ہوتے ہیں، جو ایک مثبت اور ترقی یافتہ معاشرے کی بنیاد بنتا ہے۔ اس طرح شمولیاتی تعلیم محض ایک تعلیمی پالیسی نہیں بلکہ ایک وسیع سماجی وژن اور مستقبل کی ضمانت ہے۔ یہ ہر بچے کو اپنی منفرد صلاحیت کے مطابق روشنی بکھیرنے کا مساوی موقع فراہم کرتی ہے، اور ایسے معاشرے کی تشکیل میں مدد دیتی ہے جہاں تعلیم سب کے لیے ہے اور ہر فرد اپنی قابلیت کے مطابق آگے بڑھ سکتا ہے۔ شمولیاتی تعلیم نہ صرف تعلیمی ترقی بلکہ انسانی وقار، مساوات، اور سماجی انصاف کے فروغ کا بھی سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔

شمولیاتی تعلیم کی اہمیت

شمولیاتی تعلیم فرد، ادارے اور معاشرے تینوں کے لیے نہایت اہم ہے۔ یہ صرف تعلیمی مواقع فراہم کرنے تک محدود نہیں بلکہ انسانی وقار، سماجی انصاف اور مساوات کے خواب کو عملی شکل دیتی ہے۔ ذیل میں اس کی چند نمایاں خوبیاں پیش کی جا رہی ہیں:

تعلیم کا حق سب کے لیے: شمولیاتی تعلیم اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ کوئی بچہ جسمانی معذوری، ذہنی فرق، معاشی پسماندگی یا لسانی تنوع کی وجہ سے تعلیم سے محروم نہ ہو۔ یہ مساوات کی بنیاد پر سب کو آگے بڑھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

سماجی ہم آہنگی اور رواداری: مختلف پس منظر کے بچے جب ایک ہی کلاس روم میں پڑھتے ہیں تو وہ برداشت، بھائی چارہ اور تعاون جیسے اوصاف سیکھتے ہیں۔ اس سے معاشرہ زیادہ پرامن اور ہم آہنگ بنتا ہے۔

اعتماد اور خود انحصاری: شمولیاتی ماحول طلبہ میں خود اعتمادی پیدا کرتا ہے۔ ہر بچہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق کارکردگی دکھا کر یہ احساس کرتا ہے کہ وہ معاشرے کا ایک باوقار اور فعال رکن ہے۔

تعلیمی معیار میں بہتری: چونکہ شمولیاتی تعلیم میں تدریسی طریقوں کو متنوع اور لچکدار بنایا جاتا ہے، اساتذہ زیادہ تخلیقی انداز میں پڑھاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام طلبہ کی تعلیمی کارکردگی بہتر ہوتی ہے۔

پائیدار ترقی کی ضمانت: شمولیاتی تعلیم عالمی سطح پر پائیدار ترقی کے اہداف (SDGs) کا بھی حصہ ہے۔ یہ صرف ایک تعلیمی ضرورت نہیں بلکہ ایک سماجی ذمہ داری ہے جو معاشرے کو زیادہ انصاف پسند اور ترقی یافتہ بناتی ہے۔

شمولیاتی تعلیم محض ایک اضافی یا غیر ضروری پہلو نہیں ہے جو کبھی کبھار اسکولوں میں شامل کر دی جاتی ہے، بلکہ یہ تعلیمی نظام کا ایک بنیادی ستون ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تعلیمی ادارے حقیقی معنوں میں مؤثر اور معیاری تعلیم فراہم کرنا چاہتے ہیں تو انھیں شمولیاتی تعلیم کو اپنی تدریسی حکمت عملیوں، نصاب، اور پالیسیوں کے مرکز میں رکھنا ہوگا۔ شمولیاتی تعلیم تعلیمی بہتری اور معیار کے لیے لازمی ہے۔ جب ہر بچے کو اس کی انفرادی ضروریات اور صلاحیتوں کے مطابق مواقع فراہم کیے جاتے ہیں، تو نہ صرف طلبہ کی علمی ترقی ہوتی ہے بلکہ اساتذہ کی تدریسی مہارت بھی بہتر ہوتی ہے۔ اس طرح تعلیمی ادارے متوازن، تخلیقی اور باہمی تعاون پر مبنی ماحول فراہم کر پاتے ہیں، جو تعلیمی نتائج اور سماجی ہم آہنگی دونوں کے لیے فائدہ مند ہے۔ تعلیم کا ایک حاشیہ یا ثانوی موضوع نہیں بلکہ ہر تعلیمی عمل کا مرکزی اور لازمی جزو ہے، جو فرد، ادارے اور معاشرے کی ترقی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

شمولیاتی تعلیم کے چیلنجز

اگرچہ شمولیاتی تعلیم ایک روشن اور انسان دوست تصور ہے، مگر اسے عملی جامہ پہنانا آسان نہیں۔ مختلف سماجی، معاشی اور ادارہ جاتی رکاوٹیں اس کے راستے میں حائل ہوتی ہیں۔ ذیل میں اس کے نمایاں چیلنجز درج ہیں:

وسائل اور مالی معاونت کی کمی: بہت سے اسکولوں میں بنیادی سہولیات ہی ناکافی ہیں۔ معذور طلبہ کے لیے خصوصی آلات، ریمپ، یا معاون تدریسی مواد مہیا کرنا اکثر ممکن نہیں ہوتا۔ اس کمی کی وجہ سے شمولیاتی تعلیم کا

تصور محدود ہو جاتا ہے۔

اساتذہ کی تربیت کا فقدان: زیادہ تر اساتذہ روایتی تدریس کے عادی ہیں۔ شمولیاتی ماحول میں انھیں خصوصی تدریسی مہارتیں درکار ہوتی ہیں، جیسے سیکھنے کے مختلف انداز کو سمجھنا اور متنوع تدریسی حکمتِ عملیاں اپنانا۔ تربیت نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس نظام کو صحیح طور پر نافذ نہیں کر پاتے۔

نصاب اور تدریسی طریقوں میں سختی: ہمارے تعلیمی نصاب اور امتحانی نظام میں لچک کم ہے۔ ایک ہی پیمانے پر سب کی کارکردگی ناپی جاتی ہے، جس کی وجہ سے مختلف صلاحیتوں والے طلبہ کو مشکلات پیش آتی ہیں۔

سماجی رویے اور والدین کی آگاہی کی کمی: بعض اوقات والدین یا کمیونٹی کے لوگ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ مختلف صلاحیتوں والے بچوں کو مرکزی دھارے میں شامل کرنا کتنا ضروری ہے۔ اس رویے کی وجہ سے بھی شمولیاتی تعلیم کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

پالیسی اور عملدرآمد میں فرق: اگرچہ حکومتیں شمولیاتی تعلیم کی پالیسی بناتی ہیں، لیکن عملی سطح پر اسکولوں میں اس پر مؤثر طریقے سے عمل نہیں ہو پاتا۔ پالیسی اور حقیقت کے اس خلا کو پُر کرنا بہت بڑا چیلنج ہے۔

شمولیاتی تعلیم کے سب سے بڑے چیلنجز میں سے ایک یہ ہے کہ اسے محض نظریاتی سطح پر نہیں بلکہ عملی طور پر مؤثر بنایا جائے۔ زیادہ تر ممالک اور ادارے شمولیاتی تعلیم کے لیے پالیسی بناتے ہیں، مگر حقیقی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ یہ پالیسیاں کلاس روم کی حقیقت میں کس حد تک نافذ ہو رہی ہیں۔ اسکولوں میں استاد، نصاب، تدریسی وسائل اور تعلیمی ماحول اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ ہر بچہ اپنی صلاحیت کے مطابق سیکھ سکے۔ اگر پالیسی کو عملی شکل نہ دی جائے تو شمولیاتی تعلیم کے تمام فوائد حاصل نہیں ہو سکتے، اور وہ صرف ایک نظریے یا ضابطے تک محدود ہو جاتی ہے۔ اس لیے اصل توجہ اس بات پر ہونی چاہیے کہ ہر کلاس روم میں یہ اصول حقیقتاً اپنائے جائیں اور ہر طالب علم کو حقیقی معنوں میں شامل کیا جائے۔

شمولیاتی تعلیم کے حل اور تجاویز

شمولیاتی تعلیم کے چیلنجز کے باوجود، مؤثر حکمت عملی اپنانے سے ان پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ ذیل میں چند اہم حل اور تجاویز پیش کیے جا رہے ہیں:

وسائل کی فراہمی اور مالی معاونت: اسکولوں میں بنیادی سہولیات کی دستیابی ضروری ہے۔ معذور طلبہ کے لیے ریمپ، خصوصی تدریسی مواد، اور جدید تعلیمی آلات فراہم کرنا لازمی ہے تاکہ سب طلبہ یکساں طور پر سیکھ سکیں۔

اساتذہ کی تربیت اور پیشہ ورانہ ترقی: اساتذہ کو شمولیاتی تعلیم کے لیے خصوصی تربیت دی جائے۔ انھیں مختلف سیکھنے کے انداز، تدریسی حکمت عملی، اور کلاس روم مینجمنٹ کے جدید طریقے سکھائے جائیں تاکہ وہ ہر بچے کو اس کی ضرورت کے مطابق پڑھا سکیں۔

نصاب میں لچک اور متنوع تدریسی طریقے: نصاب کو زیادہ لچکدار بنایا جائے تاکہ مختلف صلاحیتوں والے طلبہ اسے اپنی رفتار اور ضرورت کے مطابق سمجھ سکیں۔ تکنیکی مدد اور تخلیقی تدریسی طریقے اپنانا اس ضمن میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

والدین اور کمیونٹی کی آگاہی: والدین اور کمیونٹی کو شمولیاتی تعلیم کی اہمیت سے آگاہ کیا جائے۔ ورکشاپس، سیمینارز، اور مقامی سطح پر مہمات کے ذریعے وہ بھی اس عمل کا حصہ بنیں اور مثبت رویہ اپنائیں۔

پالیسی کے مؤثر نفاذ کی یقین دہانی: حکومت اور تعلیمی ادارے پالیسی بنانے کے ساتھ ساتھ اس کے مؤثر نفاذ پر بھی توجہ دیں۔ اسکولوں میں شمولیاتی تعلیم کی نگرانی اور رہنمائی کا نظام قائم کیا جائے تاکہ پالیسی عملی شکل اختیار کرے۔

شمولیاتی تعلیم کی کامیابی کا دارومدار محض اچھی نیت یا پالیسی بنانے تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے فروغ کے لیے تین بنیادی عناصر کی ہم آہنگی ضروری ہے: پالیسی، تدریسی عمل، اور کمیونٹی کی شمولیت۔ جب یہ تینوں پہلو ایک ساتھ مربوط ہو کر کام کرتے ہیں تو شمولیاتی تعلیم نہ صرف اسکولوں میں عملی طور پر نافذ ہوتی ہے بلکہ طلبہ کی علمی، سماجی اور جذباتی ترقی کو بھی یقینی بناتی ہے۔ ایک مضبوط پالیسی وہ رہنما اصول فراہم کرتی ہے جو تعلیمی اداروں کو واضح سمت دیتی ہے، جب کہ تدریسی عمل میں اس پالیسی کو حقیقت میں تبدیل کرنے کی ذمہ داری اساتذہ پر ہوتی ہے۔ اگر صرف پالیسی موجود ہو مگر کلاس روم میں اس پر عمل نہ کیا جائے، تو شمولیاتی تعلیم کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا (Florian, 2014) اسی کے ساتھ، کمیونٹی کی شمولیت بھی بے حد اہم ہے۔ والدین، مقامی رہنما، اور معاشرتی ادارے طلبہ کے سیکھنے کے ماحول کو مضبوط بنانے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ جب کمیونٹی اس عمل میں شامل ہوتی ہے تو بچوں کے لیے تعلیمی مواقع اور معاونت میں اضافہ ہوتا ہے، اور معاشرتی رویے بھی شمولیاتی تعلیم کے لیے سازگار ماحول تیار کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح پالیسی، تدریسی عمل، اور کمیونٹی تعاون کے اشتراک سے ایک ایسا متوازن اور مؤثر نظام قائم ہوتا ہے جو ہر بچے کو مساوی مواقع فراہم کرتا ہے اور معاشرتی انصاف کے اصولوں کو فروغ دیتا ہے (Sharma & Desai, 2019)۔ لہٰذا شمولیاتی تعلیم کے فروغ کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ تینوں عناصر ہم آہنگ اور مربوط انداز میں کام کریں، تبھی یہ تعلیمی نظام حقیقی معنوں میں سب کے لیے یکساں اور مؤثر ہو سکتا ہے۔ یہ ہم آہنگی ہر اسکول، ہر کلاس روم اور ہر بچے کے لیے تعلیم کو روشن، مساوی اور پُراثر بناتی ہے۔(Booth & Ainscow, 2011)

نتیجہ

شمولیاتی تعلیم صرف تعلیمی نظام نہیں بلکہ ایک سماجی وژن ہے، جو ہر بچے کو بغیر کسی امتیاز کے آگے بڑھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ یہ تعلیم مساوات، رواداری اور باہمی احترام جیسے اقدار کو فروغ دیتی ہے، اور بچوں کو نہ صرف علمی بلکہ اخلاقی طور پر بھی تیار کرتی ہے۔ شمولیاتی تعلیم کا اصل مقصد ہر بچے کی صلاحیت کو اجاگر کرنا اور اسے معاشرتی ڈھانچے میں باوقار مقام دینا ہے۔ اگرچہ وسائل کی کمی، نصاب کی سختی، اساتذہ کی تربیت اور والدین کی محدود آگاہی جیسے چیلنجز موجود ہیں، لیکن مثبت حکمت عملی، کمیونٹی تعاون، اور حکومت کی مؤثر پالیسی نفاذ کے ذریعے یہ سب حل کیے جا سکتے ہیں۔ شمولیاتی تعلیم کے فروغ سے معاشرہ زیادہ ہم آہنگ، مہذب اور پرامن بنتا ہے۔ مزید برآں، شمولیاتی تعلیم عالمی ترقی کے اہداف (SDGs) کے حصول میں بھی کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ لہٰذا شمولیاتی تعلیم کو محض نظریاتی طور پر نہیں بلکہ عملی طور پر اپنانا ضروری ہے۔ یہ تعلیم فرد، ادارے اور معاشرے تینوں کی ترقی کی ضامن ہے۔ شمولیاتی تعلیم کی راہ پر قدم رکھنے والے معاشرے واقعی ایک روشن، پرامن اور ترقی یافتہ دنیا کی تشکیل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

■

Dr Mozaffar Islam
Assistant Professor (Education)
MANUU College of Teacher Education,
Darbhanga-846001 (Bihar)
Email: mislam1@manuu.edu.in

خواتین میں اعلیٰ تعلیم کا فروغ

صائمہ ثمرین

کسی بھی قوم یا معاشرے کی ترقی اور استحکام کا انحصار اس کی تعلیمی ترقی سے ہے۔ قوم اور معاشرے کی تہذیب وثقافت کو مستحکم کرنے میں تعلیم بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ بہتر اور معیاری زندگی کے لیے انسان کا علم حاصل کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ زندہ رہنے کے لیے ہوا اور پانی۔ تعلیم کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن خواتین کی تعلیم کے حوالے سے ابھی بھی بیداری کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

اگر معاشرے کو مہذب، ترقی یافتہ اور ترقی پسند بنانا ہے تو خواتین کی تعلیم کو فروغ دینا ازحد ضروری ہے۔ تاریخ کے صفحات پلٹنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کی اعلیٰ تعلیم کے فروغ کی حمایت میں پانچویں صدی قبل مسیح افلاطون اپنی کتاب 'ری پبلک' میں کہتا ہے کہ:

''انتظام سلطنت میں نہ تو کسی عورت کو محض اس بنیاد پر کہ وہ عورت ہے کسی علم یا کاروبار سے محروم رکھنا جائز ہے اور نہ کسی مرد کو محض اس لیے کہ وہ مرد ہے کوئی علم سیکھنے یا کاروبار کرنے کا کوئی حق ہے۔ خدا کی نعمتوں میں دونوں کو برابر کا حصہ ملا ہے، ان دونوں کے حقوق مساوی ہیں۔'' (مسلم خواتین کی تعلیم از امین زبیری، ص 8)

پانچویں صدی قبل مسیح افلاطون خواتین کی تعلیمی اہمیت و افادیت کو تسلیم کرتا ہے اور مردوں کے مساوی تعلیم کی حمایت کرتا ہے۔ ویدک دور ہو یا بدھیسٹ دور خواتین تعلیمی میدان میں پیچھے نہیں رہیں۔ ویدک دور میں خواتین کو گروکل میں جانے کی اجازت نہیں تھی، اس لیے ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام گھر پر کیا جاتا تھا۔ میتری اور گوشکی اسی تعلیمی نظام کا حصہ تھیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین میں شمار کی جاتی ہیں۔

دہلی سلطنت کی پہلی حکمراں خاتون سلطانہ رضیہ بھی تعلیم یافتہ شہزادی تھیں، اور انھوں نے تعلیم وتعلم کے لیے مدرسے بھی قائم کیے۔ اسی طرح عہد مغلیہ میں بھی کئی مثالیں ایسی شہزادیوں کی ملتی ہیں جو اعلیٰ تعلیم سے مزین تھیں جیسے بابر کی صاحبزادی گلبدن کی تصنیف 'ہمایوں نامہ' سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔

ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کے بعد بھی خواتین کی اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ انگریزوں نے کئی کالج اور یونیورسٹیاں قائم کیں اور مخلوط تعلیم کا رواج عام ہوا۔ وہیں 1720 میں ایک نسواں اسکول کے قیام کا سراغ ملتا ہے۔ جو صرف لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ہی وقف تھا اس صدی کی آخری دہائی تک انگریزوں نے تعلیم کا باقاعدہ نظام قائم کر لیا تھا۔ فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ بیسویں صدی سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اس وقت عورت مردوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کے لیے کوشاں تھیں اور برابر کے حقوق کا مطالبہ کر رہی تھیں۔

اس دور میں مسلم خواتین کی اعلیٰ تعلیم کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ بیسویں صدی کی دو دہائیوں کے بعد ڈگری کالجوں میں لڑکیوں کے نام نظر آنے لگے تھے۔ اس ضمن میں امین زبیری اپنی کتاب 'مسلم خواتین کی تعلیم' میں رقمطراز ہیں:

''1923 میں نورالنسا' نامی خاتون نے بی۔اے اور انگریزی مضمون نگاری میں انعام حاصل کیا۔ 1924 میں نورجہاں ورنس یوسف جہاں نے ایم اے کی ڈگری لی اور اول الذکر نے اسلامیہ گرلس اسکول میں معلّمہ کی خدمت اختیار کی۔ پنجاب میں خدیجہ بیگم نے پردے کی پابندی کے ساتھ ایم اے اور مس محبوب عالم، مس فیروز الدین نے بی اے کیا۔ کلکتہ میں فرخ سلطان نے فارسی میں ایم اے اور خاور سلطان نے بی اے کیا اور تاریخ کے مضمون میں اول رہیں۔ فرخ سلطان نے عربی، فارسی، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں مہارت حاصل کی ان کی بڑی بہن بیگم سلطان پہلی مسلمان خاتون ہیں جنھوں نے قانون کی سند حاصل کی۔''

متذکرہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم خواتین کو تعلیم میں کس قدر ذوق وشوق تھا۔ مسلم طالبات میں بیرون ملک جانے والی پہلی لڑکی عطیہ بیگم فیضی تھیں جنھوں نے تعلیم کی غرض سے یوروپ کا سفر کیا۔ عطیہ بیگم فیضی کی ذہانت کا لوہا علامہ اقبال اور شبلی نعمانی جیسے دانشور بھی مانتے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے بعد خواتین کی اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ بتدریج آج تک جاری وساری ہے۔

سماجی ترقی

خواتین کی اعلیٰ تعلیم سے ایک بہتر سماج کی تشکیل ہوتی ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں بچوں کی تربیت کا بار صرف ماں پر ہوتا ہے اور وہ ماں بہرکیف ایک عورت ہی ہوتی ہے۔ ماں کی گود بچے کا پہلا مدرسہ اور ماں بچے کی پہلی مدرس ہوتی ہے۔ اگر یہی ماں تعلیم یافتہ اور باشعور ہوتی ہے تو بچے کو ایک باشعور انسان اور ذمہ دار شہری بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس طرح قوم وسماج کی ترقی ایک خاتون کی تعلیم پہ منحصر ہوتی ہے۔ اہل مغرب نے دو صدیاں قبل خواتین کی تعلیم کا نعرہ بلند کیا تھا۔ جس وقت خواتین بدترین حالت میں زندگی بسر کر رہی تھیں تب نپولین بونا پارٹ نے کہا تھا کہ:

''تم مجھے پڑھی لکھی مائیں دو، میں تمھیں ترقی یافتہ قوم دوں گا۔''

اقتصادی استحکام

کسی بھی ملک یا ریاست کی معاشی ترقی میں خواتین کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ ملک کی معیشت کو بھی بہتر بنانے کی وہ اہلیت رکھتی ہیں اور معاشی مواقع حاصل کر کے اپنے خاندان کے مردوں کا بوجھ ہلکا کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔

خواتین کی حصے داری ہر میدان میں نظر آتی ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ یونین پبلک سروس کمیشن میں کئی سال سے لڑکیاں اول پوزیشن لا رہی ہیں اور تمام عہدوں پر مردوں سے بڑھ کر خدمات انجام دے رہی ہیں۔ خواتین بیرون ملک میں نوکری کر کے اپنے ملک کی معیشت کو مضبوط کر رہی ہیں۔

شعبہ صحت میں بہتری

تعلیم یافتہ خواتین صحت وصفائی کا خیال رکھتی ہیں۔ وہ ذمہ داری سے غذائیت اور صحت سے جڑی تمام باتوں کا خیال رکھتی ہیں۔ وہ موذی بیماریوں سے بچاؤ اور دیگر بیماریوں کی جانکاری رکھتی ہیں۔ اس طرح ایک صحت مند قوم وجود میں آتی ہے۔ اور صحت مند معاشرہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ صحت مند جسم میں ہی صحت مند دماغ ہوتا ہے۔ ایک عورت ہی مضبوط و مستحکم نسل کی تشکیل کر سکتی ہے۔ آج کل کے حالات کو دیکھتے ہوئے زنانہ ڈاکٹر کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ کو اپنی بیٹی و بہو کے لیے زنانہ ڈاکٹر درکار ہے تو پہلے ان کو ڈاکٹر بنانا ہوگا۔ یہ تمام باتیں اسی وقت ممکن ہو سکتی ہیں جب خواتین اعلیٰ تعلیم کے حصول میں کامیاب ہوں گی۔

خواتین کے لیے کالجز کا قیام

برصغیر ہند و پاک میں خواتین کی تعلیم بہت مشکلات سے گزر رہی تھی۔ ایک طرف خواتین اپنے حقوق کے لیے لڑ رہی تھیں تو دوسری طرف نام نہاد مصلحین قوم اپنی تقریر و تحریر سے خواتین کی تعلیم پہ فتوی دے رہے تھے، لیکن چند ترقی پسند اور روشن خیال افراد خواتین کی اعلیٰ تعلیم کی سفارش بھی کر رہے تھے، جن کا ماننا تھا کہ خواتین کی تعلیم سے ہی قوم و ملک کی ترقی کی راہیں ہموار ہو سکتی ہیں۔ خواتین کی تعلیم میں تمام معاشرہ کا مفاد مضمر ہے۔

خواتین کی تعلیم کے لیے انگریزی مشنریوں نے سب سے پہلے غور و خوض کیا۔ انھیں لڑکیوں کی خواندگی کی شرح دیکھ کر اندازہ ہوا کہ تعلیم نسواں پر زور دینا بہت ضروری ہے۔ اس لیے ان مشنریوں نے خواتین کے لیے ادارے قائم کرنا شروع کیے۔ ان اداروں میں ایک عیسائی ادارہ ازابیلا تھوبرن کالج کی بنیاد رکھی گئی۔

ازابیلا تھوبرن کالج

ازابیلا تھوبرن کالج جنوبی ایشیا میں خواتین کا پہلا عیسائی کالج تھا۔ اس کالج کو قائم کرنے والی محترمہ ازابیلا تھوبرن 1869 میں ہندوستان کا سفر کرنے والی پہلی مشنری خاتون تھیں۔ اور انھوں نے ہندوستان میں خواتین کی خواندگی میں ترقی کر کے اپنی جڑیں اور مضبوط کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کالج کو قائم کرنے کا مقصد ہندوستانی عورتوں کو تعلیم یافتہ بنا کر ان سے کام لینا تھا۔ اس کالج کو خصوصاً لڑکیوں کے لیے محض ایک کمرے میں محترمہ ازابیلا تھوبرن نے 18 اپریل 1870 میں شروع کیا تھا، شروعات چھ لڑکیوں سے ہوئی، چند دنوں میں ہی لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو کالج کی اراضی میں توسیع کی غرض سے لال باغ میں اودھ کے خزانچی کے گھر منتقل کیا۔ 1886 میں اسی اسکول کا نام ویمنز کالج رکھ دیا گیا اور کلکتہ یونیورسٹی کی نگرانی میں فنون لطیفہ کی جماعتیں شروع ہوگئیں۔ اس کے بعد 1894 میں یہ کالج الہ آباد یونیورسٹی سے ملحق ہو گیا اور 9101 میں مس تھوبرن کے انتقال بعد اس کالج کا نام پھر سے ازابیلا تھوبرن کالج رکھ دیا گیا۔ 1923 میں محترمہ فلورنس نکولس کی پرنسپل شپ میں کالج ایک الگ ادارہ بن گیا اور تقریباً 32 ایکڑ رقبہ میں چاند باغ میں منتقل ہو گیا جہاں یہ آج تک برقرار ہے۔ یہ پراپرٹی کبھی شاہی باغ تھی لیکن اس میں اب انگریزوں کا کالج قائم ہو چکا ہے:

ازابیلا تھوبرن کالج اب لکھنؤ یونیورسٹی سے ملحق ہے۔ 1920 میں اس کالج کی توسیع ہوئی اور چاند باغ میں جو تعمیرات تھیں ان میں لڑکیوں کے ہاسٹل، لیکچر روم، لائبریری، لیبوریٹری اور ایک بڑا ہال بنایا گیا۔ کالج میں پانچ انڈر گریجویٹ کورسز پڑھائے جاتے ہیں۔ جس میں بی اے، بی کام، بی ایڈ، بی ایس سی، بی ایل آئی ایس سی کی ڈگری شامل ہے۔ اس کے علاوہ اس کالج میں پوسٹ گریجویٹ کورسز کے نو مضامین میں ڈگری فراہم کی جاتی ہیں۔ چونکہ یہ کالج عیسائی مشنری کا تھا اس لیے اس میں عیسائی لڑکیوں کی بہتات تھی علاوہ ازیں اس میں مسلمان لڑکیاں بھی داخلہ لینے میں پیچھے نہیں تھیں۔ مسلم خواتین کے تعلیم میں پسماندہ ہونے کی وجہ ان کا پردہ تھا۔ اور مخلوط تعلیم کی وجہ سے والدین بھی اسکول بھیجنے سے گریز کرتے تھے۔ ازابیلا تھوبرن کالج کے قیام سے مسلم خواتین میں بھی کالج جانے کا جذبہ بیدار ہوا اور شروع میں مسلمانوں کی دو لڑکیوں نے کالج میں داخلہ لیا۔ جس کے متعلق امین زبیری رقمطراز ہیں:

''1907 میں پہلی مرتبہ کشمیر کی دو مسلمان نوجوان طالبات اس کالج میں داخل ہوئیں جو پردہ کرتی تھیں۔ اس کے بعد ہر سال مسلم طالبات کی تعداد بڑھتی رہی۔ چنانچہ 1927 میں 57 طالبات نے داخلہ لیا صوبجات متحدہ، پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بعض ریاستوں سے آئی تھیں۔ پھر تو یہ ایک کل ہند ادارہ بن گیا۔ بمبئی، حیدرآباد دکن، بھوپال، بنگال، بہار، صوبۂ متوسط و برار، راجپوتانہ غرض کہ ہر جگہ کی طالبات آنے لگیں۔

پہلی مسلمان لیڈی ڈاکٹر، شاید تمام مسلم دنیا میں پہلی، اسی کالج کی گریجویٹ تھی جس کا نام گلزار محمد علی تھا۔'' (ص 153)

ازابیلا تھوبرن کی تعلیم یافتہ گریجویٹ مسلمان عورتوں نے اعلیٰ قسم کی ملازمتیں بھی کیں۔ ان میں سے ایک بہت مشہور و معروف نام قرۃ العین حیدر کا ہے۔ یہ کالج تقریباً ڈیڑھ صدی سے اپنی خدمات اسی جذبہ اور جوش و خروش کے ساتھ انجام دے رہا ہے۔

عبداللہ گرلس کالج، ویمن کالج علی گڑھ

ویمن کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک اہم حصہ ہے۔ جو ہندوستان کی بے شمار طالبات کو حصول تعلیم کی طرف راغب کرتا ہے۔ کالج کا مقصد خواتین کی اعلیٰ تعلیم کا فروغ ہے۔ یہ کالج تمام طالبات کو حوصلہ افزائی کے ساتھ چیلنجنگ پروگرام میں شرکت کی دعوت دیتا ہے۔ اس کالج کا قیام 19 ویں صدی کی پہلی دہائی میں ہوا۔ جس کے بنیاد گزاروں میں شیخ عبداللہ اور ان کی بیگم شامل ہیں۔ کالج کو بنانے میں جس محنت و مشقت اور زندہ دلی کا ثبوت دیا تھا وہ قابل ستائش ہے۔ ویمن کالج سب سے پہلے انسان دوستی اور شعوری بیداری کو اجاگر کرتا ہے۔

عبداللہ کالج کو قائم کرنے میں بڑی مشقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن شیخ محمد عبداللہ اور بیگم وحید جہاں نے اپنی تمام تر کوشش صرف کر دی اور ہر آنے والے چیلنجز کا مقابلہ نہایت سلیقگی، صبر و تحمل اور بہادری سے کرتے رہے۔ شیخ عبداللہ نے جیسے ہی نسواں مدرسے کی تجویز

لوگوں کے سامنے رکھی کہ ان کی مخالفت شروع ہو گئی۔ کئی اجلاس میں شیخ عبداللہ نے تعلیم نسواں کی ترقی کے لیے لوگوں سے مشورہ کیا تو ان کے احباب نے کہا کہ خواتین کے مدرسے کا ذکر نہ کر کے استانیاں تیار کرنے کے لیے ایک معمولی مدرسے کا قیام عمل میں لانے کی تجویز رکھی جائے۔ جس سے مخالفین کا واویلا کم ہو۔ اس طرح نارمل استانیوں کے اسکول کا ایک ریزولیشن پاس ہو گیا اور یہ مدرسہ علی گڑھ میں ایک کرائے کے گھر میں چند لڑکیوں اور ایک دہلی کی استانی (جو معمولی اردو اور قرآن پڑھانا جانتی تھیں) سے شروع ہوا۔ باقاعدہ طور پر مدرسہ کا آغاز 1907 میں ہوا جب لڑکیاں ڈولی اور کہاروں کے ساتھ آنے لگیں۔ بیگم عبداللہ اور ان کی بہنیں لڑکیوں کو پڑھانے لگیں۔ جب لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو بیگم عبداللہ نے لڑکیوں کے رہنے اور کھانے کا بھی نظم کر دیا۔ اور اس طرح 1921 میں یہ مدرسہ ترقی کر کے ہائی اسکول تک ہوا، 1922 میں انٹرمیڈیٹ کالج اور 1937 میں اسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں گریجویٹ کالج کے طور پر ضم کر دیا گیا۔

ویمن کالج خواتین کی اعلی تعلیم کے ادارے کے طور پر جانا جاتا ہے جس میں سائنس، سوشل سائنس، ہیومانٹیز، اور کامرس کورسز کرائے جاتے ہیں۔ اس کالج کا مقصد خواتین کو بااختیار بنانا اور ان کو نئے زمانے کے تقاضوں سے مقابلہ کرنا سکھانا ہے۔ اس وقت اس کالج میں ملک عزیز کے علاوہ بیرون ممالک کی طالبات بھی زیر تعلیم ہیں۔

ویمن کالج شیخ عبداللہ کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں کوشاں ہے۔ اور عصری تقاضوں جیسے جدید ٹکنالوجی نئے تعلیمی نصاب و پالیسی سے ہم آہنگ ہے۔ یہ کالج لڑکیوں کو پیشہ ورانہ تربیت بھی فراہم کر رہا ہے اس کے علاوہ مستقبل میں کیریئر کے بارے میں مشاورت کر کے انھیں معاشی آزادی کے لیے بھی تیار کرتا ہے۔ کالج کا زور اس بات پر ہے کہ وہ بانیان کالج کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرتے ہوئے ملک کے تمام طبقوں کی خواتین کو تعلیم یافتہ کر کے انھیں بااختیار بنانا ہے۔

کرامت حسین ڈگری کالج لکھنؤ

کرامت حسین گرلس پی جی کالج مسلم لڑکیوں کا رہائشی ادارہ ہے۔ اس ادارہ کا قیام بھی خواتین کی فلاح و بہبود کے لئے عمل میں آیا۔ جس کا مقصد بلاتفریق ہر قوم و ملت کی لڑکیوں کو تعلیم یافتہ بنانا ہے۔ اس ادارے کے بانی سید کرامت حسین جب انگلینڈ سے قانون کی پڑھائی کر کے واپس آئے تو انھوں نے دیکھا کہ ہندوستان کی مسلم لڑکیوں کے لیے کوئی تعلیمی نظم نہیں ہے جب کہ ہندوستانی لڑکے بیرون ملک جا کر ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں لڑکیوں کی تعلیم کو یکسر نظر انداز کیا جا رہا ہے، اس لیے مسلم کمیونٹی میں سماجی بحران کی اتھل پتھل زیادہ ہی تھی۔، اور ان میں دنیا کا کوئی شعور نہیں ہے، کیونکہ وہ پڑھائی لکھائی سے بالکل نابلد ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر کرامت حسین نے لڑکیوں کی تعلیم کا ایک منصوبہ

> **ویمن کالج خواتین کی اعلی تعلیم کے ادارے کے طور پر جانا جاتا ہے جس میں سائنس، سوشل سائنس، ہیومانٹیز، اور کامرس کورسز کرائے جاتے ہیں.اس کالج کا مقصد خواتین کو بااختیار بنانا اور ان کو نئے زمانے کے تقاضوں سے مقابلہ کرنا سکھانا ہے.اس وقت اس کالج میں ملک عزیز کے علاوہ بیرون ممالک کی طالبات بھی زیر تعلیم ہیں.**

بنایا اور 1890 میں ہونے والی تعلیمی کانفرنس الہ آباد میں لڑکیوں کی تعلیم کی ایک قرارداد پیش کی، بدقسمتی سے ان کی اس تجویز کو مسترد کر دیا گیا۔ ہر طرف سے مولوی کرامت حسین کو مایوسی ملی تو انھوں نے عزم مصمم کر لیا کہ انھیں لڑکیوں کے لیے ایک ادارہ قائم ہی کرنا ہے۔

1912 میں کرامت حسین لکھنؤ واپس ہوئے اور قیصر باغ کی کبوتر والی کوٹھی میں مسلم لڑکیوں کے اسکول کی بنیاد ڈالی۔ اس اسکول کی بنیاد بھی محض چھ لڑکیوں پر مشتمل تھی۔ وہ چھ لڑکیاں معروف اور صاحب حیثیت خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جس سے انھیں اعتراضات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کرامت حسین کی کوشش پسماندہ طبقے کی لڑکیوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے اور انھیں جہالت کے اندھیرے سے نکالنے کی تھی۔ پسماندہ طبقہ کو باضابطہ تعلیمی نظام کو اپنانے کے لیے اکسایا جائے۔ ابتدائی دور میں مسلم کمیونٹی تعلیم کے خیال سے ہی بے زار ہوئی اور لڑکیوں کو گھروں سے بے نقاب کرنے اور بار بار نقل و حرکت سے بزرگ پریشان اور اور خوف و ہراس سے دوچار تھے۔ اور وہ اپنی لڑکیوں کا گھر سے باہر نکلنا ممنوع سمجھتے تھے۔ پردہ کے نظام کو مدنظر رکھتے ہوئے اسکول کے قیام کے اگلے دن ہی لڑکیوں کے لئے ہاسٹل کی سہولت کا بھی انتظام کر دیا گیا۔ 1925 میں یہ اسکول گومتی ندی کے کنارے نشاط گنج میں منتقل کر دیا گیا جہاں آج بھی یہ اپنی شان و بان سے کھڑا ہے۔ اس ادارے کا نام اس کے بانی کرامت حسین کے نام پر رکھا گیا۔ اس اسکول کی پہلی پرنسپل انگریز خاتون آمنہ پوپ تھیں جو 1910 میں ہندوستان آئی تھیں۔

وقت کے ساتھ یہ اسکول ترقی کے منازل طے کرتا رہا اور 1924 میں یہ ہائی اسکول تک پہنچا، 1936 میں انٹرمیڈیٹ کی حیثیت اختیار کر لی۔ اور بالآخر 1946 میں مینیجر سید شعیب احمد کی محنت و کاوش کے نتیجے میں یہ کالج ڈگری کالج میں تبدیل ہو گیا۔ اس وقت کرامت حسین مسلم گرلس پی جی کالج میں بی ایڈ، بی کام، بی ایس سی، وغیرہ کی ڈگری فراہم کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کالج میں بہت سے شعبے قائم کیے گئے ہیں۔ یہاں پوسٹ گریجویٹ تک تعلیم کا اہتمام کیا گیا ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ یہاں لڑکیوں کے کھیل اور دوسری مہارتوں کا بھی عمدہ نظم و نسق ہے، این ایس ایس، ہاکی، بھالا پھینک، بیڈمنٹن باسکیٹ بال وغیرہ کی باقاعدہ ٹیمیں ہیں۔ کرامت حسین کالج کی گرلس ہاکی ٹیم اتر پردیش کی بہترین ٹیم شمار کی جاتی ہے، جس کو قومی سطح پر جیتنے کا امتیاز حاصل ہے۔

کرامت حسین گرلس ڈگری کالج تعلیمی مہارتوں کے ساتھ ساتھ خواتین کو جدید ٹکنالوجی سے جوڑنے کے لیے پر عزم ہے۔ کالج کرامت حسین کے خوابوں کی تکمیل کے لیے ہر لمحہ کوشاں ہے۔

یہ چند ادارے ہیں جو تاریخی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔ ان اداروں کو قائم کرنے میں خواتین کی تعلیم اور بہبودی کے لیے کام کرنے والے بہی خواہان قوم و ملت نے بہت قربانیاں پیش کی ہیں، اور ان کالجوں کو معیاری تعلیمی ادارہ بنانے میں انتھک محنت کی ہے۔ ان کی جدو جہد اس لائق ہے کہ انھیں خراج تحسین پیش کیا جائے اور ان سے نئے کاموں کے لیے تحریک حاصل کی جائے۔

■

Dr. Sayma Samreen
F-33.Sescond Floor , Shaheen Bagh
Abul Fazal Enclave Part - 2
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025
saymasamreenjnu@gmail.com

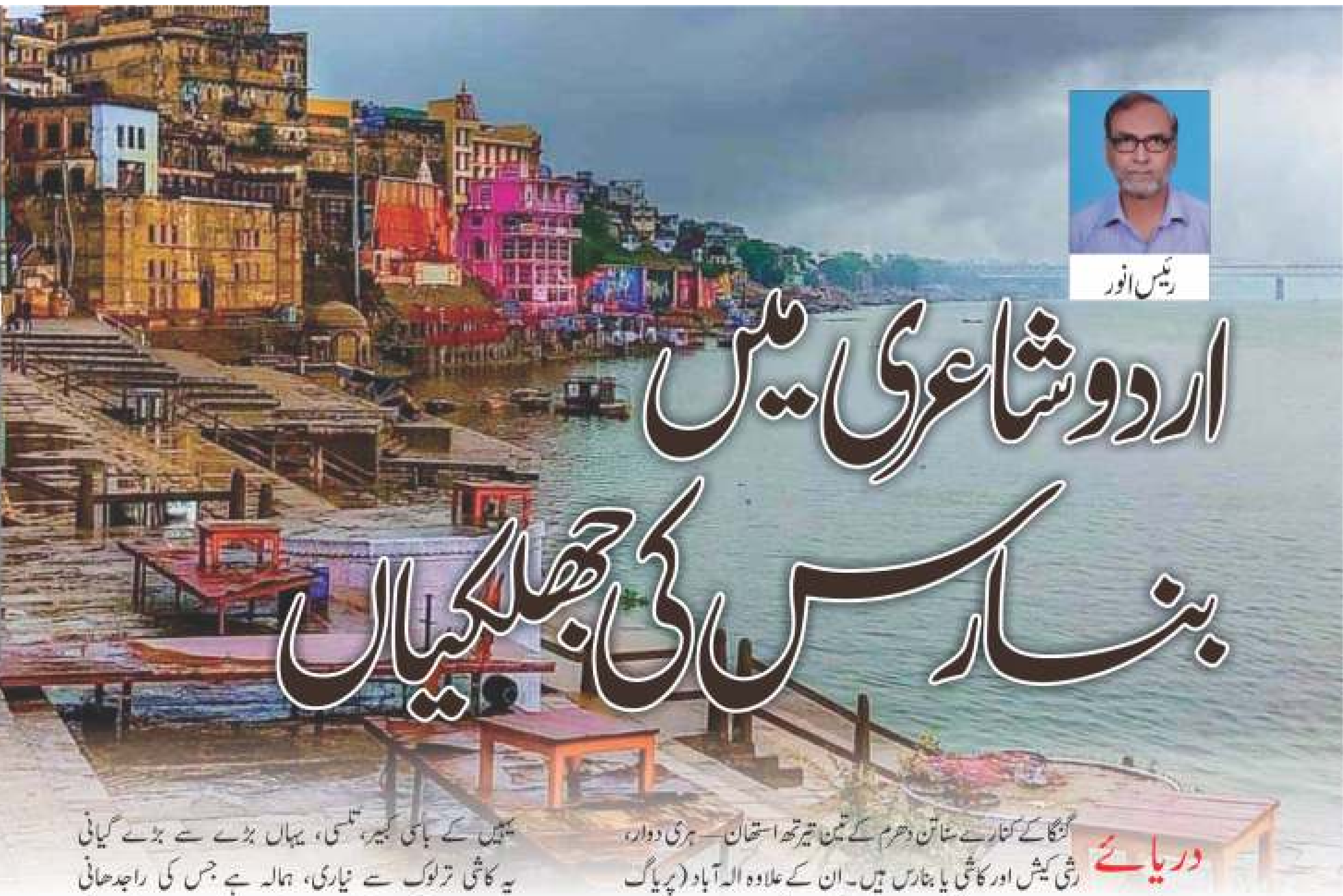

رئیس انور

اردو شاعری میں بنارس کی جھلکیاں

دریائے گنگا کے کنارے سناتن دھرم کے تین تیرتھ استھان — ہری دوار، رشی کیش اور کاشی یا بنارس ہیں۔ ان کے علاوہ الہ آباد (پریاگ راج) ایک اہم تیرتھ استھان ہے جو گنگا اور جمنا کے سنگم پر واقع ہے۔ ان چار شہروں میں بنارس کو تاریخی اہمیت اور قدامت حاصل ہے۔ اس کا سرکاری نام 'وارانسی' ہے۔ ویسے یہ شہر بنارس اور وارانسی کے ساتھ ساتھ کاشی کے نام سے مشہور ہے۔ اسے سناتن دھرم کی طرح بودھ مت اور جین مت میں بھی بہت مقدس مانا جاتا ہے۔ وہاں ایک سو کے آس پاس مندر ہیں اور کم و بیش اسی تعداد میں مرد و زن کے لیے اشنان گھاٹ ہیں۔ ہندو دیومالا کے مطابق یہ شہر کرہ ارض کا مرکز ہے اور ہزاروں سال پہلے بھگوان شیو کے ذریعے بسایا گیا تھا۔ اس کا قدیم نام 'کاسی' ہے۔ دراصل 'کاسی'، سنسکرت کے لفظ 'کاس' سے نکلا ہے جس کے معنی 'روشنی' یا 'چمک' ہیں۔ کثرت استعمال سے لفظ 'کاسی' کاشی بن گیا۔ وہاں کے دشوامیدھ گھاٹ پر شام کے وقت ہونے والی گنگا آرتی کی قدیم روایت ہے۔ اس رعایت سے کاشی کو 'روشنیوں کا شہر' (City of illumination) بھی کہا جاتا ہے۔

بنارس دریائے گنگا کے بائیں کنارے پر آباد ہے۔ شہر کے اتر میں 'ورونا' اور دکھن میں 'اسی' دو چھوٹی چھوٹی ندیاں ہیں جو گنگا سے نکلی ہیں۔ اس طرح پورا شہر تین طرف سے چھوٹی بڑی ندیوں سے گھرا ہوا ہے اور بڑا سرسبز و شاداب اور پرفضا بن گیا ہے۔ دونوں چھوٹی ندیوں یعنی 'ورونا' اور 'اسی' کے بیچ تقریباً دس کیلومیٹر کے میدانی علاقے میں آباد ہونے کے سبب 'وارانسی' کہلانے لگا۔ امتداد زمانہ کے ساتھ یا بعض مورخین کے مطابق انگریزوں کے زمانے میں لفظ 'وارانسی' بگڑ کر 'بنارس' ہو گیا۔

زمانہ قدیم سے بنارس اور اس کے آس پاس کا علاقہ بشمول سارناتھ مختلف مذہبوں کے لیے اہم اور مقدس تھا۔ وہاں ہندو، بودھ، جین اور اسلام کی عبادت گاہیں قائم تھیں نیز مذہبی پیشواؤں، عالموں، راجاؤں اور بادشاہوں کی آماجگاہ اور علوم و فنون کا گہوارہ بھی تھا۔ وہاں کی تاریخ کی ہلکی سی جھلک نذیر بناری کے ان شعروں میں ملتی ہے۔

یہیں کے باسی کبیر، تلسی، یہاں بڑے سے بڑے گیانی
یہ کاشی ترلوک سے نیاری، ہمالہ ہے جس کی راجدھانی
یہاں پہ اس کی ہے جنم بھومی، بنی جو جھانسی میں جاکے رانی
فرنگی سینا سے لڑتے لڑتے لٹادی جس نے بھری جوانی

عبادت گاہوں کے علاوہ دوسری قدیم تعمیرات میں لاٹ، گنبد، حویلیاں، باغ باغیچے، تالاب، گھاٹ وغیرہ میں سے اکثر اب تک موجود ہیں جب کہ بعض کے آثار اور کھنڈر کہیں کہیں ملتے ہیں۔ چینی سیاح فاہیان (422-337) اور ایرانی سیاح ابو ریحان البیرونی (1048-973) نے اپنے تاریخی سفرناموں میں بنارس کے حدود اربعہ، مذہبی تصورات، سماجی رسومات، ثقافتی اختصاصات اور لسانی امتیازات کی نشاندہی کی ہے۔ کبیر کوثر بھوپالی اپنی نظم کے ایک بند میں اس شاندار ماضی کی جھلک دکھاتے ہیں۔

تمدن جس جگہ ابھرا رہا، سنورا کیا برسوں — تعلم جس جگہ ٹھہرا رہا، پھیلا کیا برسوں
جہاں علم خودی چھایا رہا، برسا کیا برسوں — مذاق شاعری ڈوبا رہا، ابھرا کیا برسوں
بنارس ارض بھارت پر، خدا کی شان ہے گویا — فنون و علم و درس و فقر کی میزان ہے گویا

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اب بنارس بالکل بدل چکا ہے۔ گنگا کنارے مندروں کے اردگرد ماضی کے مٹتے نقوش مل جاتے ہیں لیکن بنارس کا اصل حسن تاریخ کے پنوں میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ پچھلی ایک صدی میں تعلیمی اداروں، رہائشی کالونیوں، تجارتی کوٹھیوں، طرح طرح کی دکانوں بھیڑ بھاڑ والے مال اور شاہراہوں کا ایک جال بچھ گیا ہے۔ ہتھ کرگھا کی قدیم صنعت کی جگہ پاور لوم نے لے لی ہے۔ ان تبدیلیوں اور ترقیوں سے زندگی تیز رفتار ضرور ہوئی ہے تاہم شہر کا نقشہ کیا بدلا، اس کی روح پرور شادابی اور خوشگوار ماحول مغربی طرز ترقی اور صارفیت کی اوٹ میں اوجھل ہونے لگا ہے۔

بہر کیف یوں تو بنارس اردو شعر و ادب کی وسیع تاریخ میں نہ دکن، دہلی، لکھنو اور عظیم آباد کی طرح کوئی دبستانی حیثیت رکھتا ہے اور نہ رام پور، مرشد آباد، کلکتہ اور

لاہور کی طرح کا کوئی مرکز ہے۔ پھر بھی ہر دور میں یہ شہر عقیدت مندوں کے ساتھ ساتھ شاعروں، ادیبوں اور دوسرے فنکاروں کا دل لبھاتا رہا ہے۔ اردو فارسی کے کئی شاعروں اور ادیبوں نے بھی اس پر توجہ مرکوز کی ہے۔ انھوں نے وہاں کی سیر کی ہو یا نہیں، اس کا ذکر بڑے احترام اور اہتمام سے کیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی خصوصیتیں ہیں، جن کی بنا پر ارباب علم و ہنر کے ذہن میں بنارس صرف تیرتھ استھان کے طور پر نہیں، ایک خوشنما فطری قوس قزح کی طرح ابھرتا ہے۔ اس تناظر میں ادبی مطالعے سے اس شہر کی درج ذیل خصوصیتیں سامنے آتی ہیں جو فنکاروں کے لیے باعث کشش ہیں:

1 گنگا کنارے صبح کا منفرد اور دلکش نظارہ ہوتا ہے۔ ابھرتے سورج کی نرم نرم کرنیں گنگا کی بل کھاتی لہروں پر رقص کرتی ہیں اور ٹھنڈی ٹھنڈی فرحت بخش ہوائیں روحانی آسودگی دیتی ہیں۔

2 بڑی تعداد میں موجود عالمی شہرت یافتہ گھاٹ پر اشنان سے ایک الگ لطف ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اشنان ظاہری و باطنی تازگی کا سبب ہے۔

3 شان بے نیازی سے جھومتی ہوئی گنگا کی لہروں کے کنارے سورج کے غروب ہونے کا ایک دلفریب منظر ہوتا ہے۔

4 دشوامیدھ گھاٹ پر ہونے والی شام کی گنگا آرتی قابل دید ہوتی ہے۔ اس میں پنچ مکھی دیپ کی گردش ناظرین کو مسحور کر دیتی ہے۔

5 ناقوس (سنکھ) کی آواز دھارمک ماحول بناتی ہے۔

6 قدرت نے مٹی اور پانی میں ایسی تاثیر دی ہے کہ آم اور پان میں ایک الگ لذت اور ذائقہ ملتا ہے۔

7 عالمی سطح پر پہچان رکھنے والی نفیس اور خوش رنگ ساڑیاں اور دوپٹے (دونوں بغیر سلے ہوئے کپڑے) قدیم سودیشی یا کھادی صنعت کی علامت ہیں۔

مذکورہ بالا خصوصیات کا ذاتی مشاہدے سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ سب اردو، فارسی کی علمی و ادبی کتابوں اور تحریروں سے ماخوذ ہیں۔ اگر ادب کے حوالے سے بنارس کی ان خصوصیات پر گفتگو کی جائے تو اس کی شروعات ایرانی شاعر شیخ علی حزیں (وفات 1180ھ/ 1768) کے اس شعر سے ہوتی ہے۔

از بنارس نہ روم معبد عام است ایں جا　　ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است ایں جا

اسی کے ساتھ شہر بنارس کے اس عاشق شاعر کی یہ رباعی بھی تذکرے میں آتی ہے۔

پری رخان بنارس ہزار رنگا رنگ　　پئے پرستش مہدیو چوں کنند آہنگ
بہ گنگ غسل کنند و بہ سنگ پا مالند　　زہے شرافت سنگ و زہے لطافتِ گنگ

اس کے بعد غالب کی فارسی مثنوی 'چراغ دیر' کا ذکر کیا جاتا ہے جس میں انھوں نے شہر بنارس کے حسین نظاروں کی پرشکوہ ترجمانی کی ہے۔ دراصل اپنے سفر کلکتہ کے دوران جب وہ بنارس میں مقیم ہوئے تو بالکل جوان تھے۔ ان کے حواس خمسہ میں ہندوستان کی مٹی اور ماحول کی بوباس سمائی ہوئی تھی نیز وہ ملک کے بدلتے ہوئے حالات اور مسائل سے بھی نبرد آزما تھے۔ زوال آمادہ مشرقی اقدار و آداب کے امین ہونے کے باوجود مغرب کے استحصالی رویوں، معاشی، تہذیبی اور ثقافتی بندشوں سے سمجھوتا کرنے پر مجبور تھے۔ کبھی کبھی ماحول کی کربناکیوں سے فرار اختیار کرتے ہوئے ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' میں بھی مبتلا ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی ان کی طرز زندگی، انداز گفتار، فکری روش اور احساس حسن پر یہ جذبہ حاوی ہو جاتا تھا۔ غالب کی اردو شاعری ہو یا فارسی دونوں میں موضوعات اور اسالیب کا یہ رنگ کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ بر چندان کے بقول۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ　　بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

غزل پر تو نہیں، ہاں مثنوی پر غالب کا یہ خیال صادق آتا ہے اور اس کی زندہ مثال ان کی مثنوی 'چراغ دیر' ہے جو بڑی رواں اور شگفتہ فارسی زبان میں لکھی ہوئی ایک شاہکار مثنوی ہے۔ اس میں ایک نوجوان ہندوستانی کے مشاہدوں سے برانگیختہ ہونے والے خیالات، جذبات اور احساسات سرایت کر جاتے ہیں۔ چہار سو حسن و جمال کے گوناگوں نظارے جوان دلوں کی دھڑکنوں میں اضافہ کرتے ہیں اور شعری

> یوں تو بنارس اردو شعر و ادب کی وسیع تاریخ میں نہ دکن، دہلی، لکھنو اور عظیم آباد کی طرح کوئی دبستانی حیثیت رکھتا ہے اور نہ رام پور، مرشد آباد، کلکتہ اور لاہور کی طرح کا کوئی مرکز ہے۔ پھر بھی ہر دور میں یہ شہر عقیدت مندوں کے ساتھ ساتھ شاعروں، ادیبوں اور دوسرے فنکاروں کا دل لبھاتا رہا ہے۔ اردو فارسی کے کئی شاعروں اور ادیبوں نے بھی اس پر توجہ مرکوز کی ہے۔ انھوں نے وہاں کی سیر کی ہو یا نہیں، اس کا ذکر بڑے احترام اور اہتمام سے کیا ہے۔

اظہار کا ایک اہم محور بن جاتے ہیں۔ یوں تو اس مثنوی کے کئی شعری اور نثری ترجمے ہوئے ہیں مگر حنیف نقوی کے شعری ترجمے سے واضح ہو گیا ہے کہ مثنوی کا بنیادی آہنگ اپنی اسلوبیاتی اور لفظیاتی کیفیتوں کے ساتھ اردو میں ضم ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر اور ان کے تراجم دیکھیے:

1 غالب: نفس با صور دمساز ست امروز　　خموشی محشر راز ست امروز
نقوی: خموشی آج دمساز فغاں ہے　　نفس پر صورِ محشر کا گماں ہے

2 غالب: تعالیٰ اللہ بنارس چشم بد دور　　بہشت خرم و فردوس معمور
نقوی: بنارس نام اس کا چشم بد دور　　بہشت خرم و فردوس معمور

3 غالب: بخوشی پُرکاریٔ طرزِ وجودش　　ز دہلی می رسد ہر دم درودش
نقوی: مناظر اس کے ہیں اتنے دل افروز　　سلام آتے ہیں دلّی کے شب و روز

4 غالب: بہ لطف از موجِ گوہر نرم روتر　　بہ ناز از خونِ عاشق گرم روتر
نقوی: کرم میں موجِ گوہر کی روانی　　ستم میں خونِ عاشق کی جوانی

5 غالب: ز رنگیں جلوہ ہا غارت گر ہوش　　بہار بستر و نوروز آغوش
نقوی: فروغ حسن سے غارت گر ہوش　　بہار بستر و نوروز آغوش

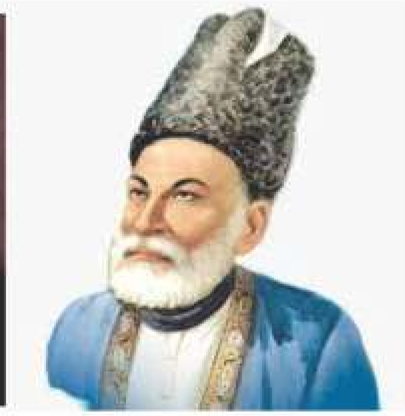

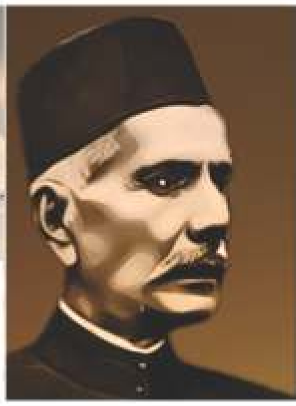
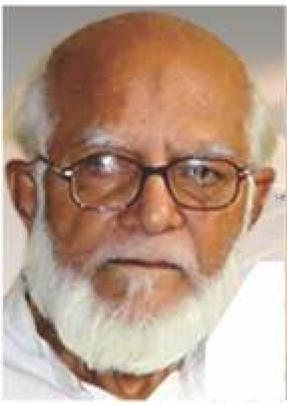

اس میں شک نہیں کہ حنیف نقوی نے خیال اور الفاظ دونوں کا محتاط، متوازن اور عالمانہ ترجمہ کیا ہے۔ اردو فارسی شعریات پر ان کی مضبوط گرفت ہر جگہ عیاں ہے۔ بعض شعر میں الفاظ، ترکیبیں اور مصرعے جوں کا توں رہنے دیئے ہیں۔ اس بنا پر ترجمہ میں تخلیقی حسن پیدا ہوگیا ہے۔ باشعور قارئین اس کے آہنگ، شگفتگی اور روانی سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

غالب نے بنارس کی تعریف وتوصیف صرف اس مثنوی میں نہیں کی ہے، وہ اپنے فارسی خطوط میں بھی شہر کی سحر آفرینی کا ذکر کرتے نہیں تھکتے۔ اس کی تفصیل خلیق انجم کی کتاب 'غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ' میں درج ہے۔ مضمون کو شاعری تک محدود کرتے ہوئے اگر قدامت کی تحقیق کی جائے تو ولی دکنی (1667-1707) کا یہ شعر اہم ہے۔

کوچۂ یار عین کاسی ہے
جوگیِ دل وہاں کا باسی ہے

ہوسکتا ہے، ولی سے پہلے کے اردو شاعروں نے بھی بنارس کے متعلق شعر کہے ہوں تاہم میرے مطالعے میں ایسا کوئی شعر نہیں آیا۔ بہار کے ایک مشہور کلاسیکی شاعر شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی (1748-1823) جو اولاً مرزا محمد علی فدوی عظیم آبادی (وفات: 96-1795) کے شاگرد تھے بعدہٗ محمد تقی میر (1723-1810) سے اصلاح لی۔ وہ نواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھنو جاتے ہوئے بنارس میں مقیم ہوئے تھے اور وہاں کے قدرتی حسن سے متاثر ہوکر اپنے جذبات کا اظہار ایک عشقیہ مثنوی 'کشش عشق' میں اس طرح کیا۔

زہے شہر محسود باغ بہشت
زن و مرد سب حور و غلماں سرشت
مئے خالص حسن دلکش سے مست
جفا پیشہ و سنگ دل بت پرست
انھوں کے رخ خوب ماہِ تمام
کرے صبح عاشق کو زلف ان کی شام

....

پڑے چشم جس گوشۂ بام پر
خدا ہی کی آجائے قدرت نظر
لب بحر جاوے اگر کوئی واں
تو دیکھے عجب طرح کا اک سماں

شہر کے پرشکوہ مناظر کے علاوہ کنارِ گنگا اور صبح کا قدرتی حسن شاعروں کا دل موہ لیتا ہے۔ صفی لکھنوی کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

ہے لب دریائے گنگ اب کی بہار آئی ہوئی
کوثر آشاموں کی ہر سو چھاؤنی چھائی ہوئی
ہر طبیعت حسن کے منظر پہ لہرائی ہوئی
لب پہ اک موج تبسم آنکھ شرمائی ہوئی
ڈوب کر کیوں کر نکلتے ہیں ستارے دیکھ لو
یہ تماشا آؤ گنگا کے کنارے دیکھ لو

صبح دم سے اکثر شاعر لطف اندوز ہوئے ہیں۔ احسان دانش بھی ان لمحوں سے پھڑک اٹھتے ہیں اور بڑی چابکدستی سے پو پھٹنے کا منظر لفظوں میں سمیٹ لیتے ہیں۔

ظلمت کی نقابیں چاک ہوئیں، جلووں کی ردائیں پھیل گئیں
موجوں کے سفینے لے لے کر وارفتہ ہوائیں پھیل گئیں
گنگا میں شہابی رنگ گھلا، ساحل پہ ضیائیں پھیل گئیں
یہ صبح بنارس کیا کہیے، افسوس کہ تم سے دور ہوں میں
جلووں میں اندھیرا ڈوب گیا، میدان نے دامن پھیلائے
پانی کے مچلتے دھاروں پر ملاحوں کے نغمے لہرائے
موجوں میں جھکولے تیز ہوئے، گردابوں کے جھونکے چکرائے
یہ صبح بنارس کیا کہیے، افسوس کہ تم سے دور ہوں میں

حفیظ بنارسی نے بھی علی الصباح گنگا کی مستانہ لہروں پر اُگتے سورج کی بکھرتی کرنوں کی خوبصورت تصویر اتاری ہے۔

یہ اس پار سورج کا اوپر نکلنا
یہ پانی پہ کرنوں کا گر کر مچلنا
یہ سونے کا حدِ نظر تک پگھلنا
کسی دیوتا کی جبیں دیکھتا ہوں
بنارس کی صبح حسیں دیکھتا ہوں

عرش ملسیانی کا یہ شعر بھی لاجواب ہے۔

کہتی ہے راز سرمدی
صبح بنارس کی زباں

سیماب اکبرآبادی کے یہ دو شعر بھی منظر کشی کے عمدہ نمونے ہیں۔

طلوع آفتاب صبح ہے گنگا کے ساحل سے
حسیں جس طرح کوئی جھانکتا ہو چاک محمل سے
ہوائیں غسل کرنے آرہی ہیں رود گنگا میں
جو نزہت ہے لب دریا وہ نزہت ہے صحرا میں

اختر شیرانی اپنی نظم 'بنارس' میں رومانی ماحول کی حسین عکاسی کرتے ہیں۔ گنگا کنارے گھاٹ کے پرکشش نظارے، مندر کی گھنٹیوں کی مدھر آواز اور صبح کی جاں بخش ہوا میں ایک روح پرور منظر ابھرتا ہے۔

ہر اک کو بھاتی ہے دل سے فضا بنارس کی
وہ گھاٹ اور وہ ٹھنڈی ہوا بنارس کی
وہ مندروں میں پجاریوں کا ہجوم
وہ گھنٹیوں کی صدا، وہ فضا بنارس کی

بنارس کے مندر اور اشنان گھاٹوں کی الگ الگ تراش خراش، ڈھرا اور ڈھنگ ہے۔ اشنان کرنے والوں کے ہجوم کی بھی اپنی علیحدہ علیحدہ پہچان ہے۔ پجاریوں، ارادت مندوں اور حسیناؤں کے اشنان کے منفرد انداز ہیں۔ دیکھیے شاعروں نے کس کس طرح انھیں لفظوں میں قید کیا ہے۔

تماشا کی وہ ارزانی، وہ گنگا، وہ صنم خانہ
بنارس کی سحر، اشنان کی تقریب روزانہ
حرم والے ذرا کاشی کا منظر دیکھتے جائیں
کہیں دیکھیں گے جنت اور ابھی دیکھیں صنم خانہ
عقیدت کیش تھٹ کے تھٹ پری زادوں کا اک جمگھٹ
سہانی صبح اور پنگھٹ جواں، رسم قدیمانہ
ہیں پریاں گھاٹ پر یا مانگ میں کاشی کی تارے ہیں
بنارس خود دلہن ہے اور گنگا آئینہ خانہ

(انجم رضوی)

نکلے ہے نہاکے کوئی چالاک   جپ کرتی ہے کوئی بند کر ناک
سورج ہی کی کوئی کرکے پوجا   کہتی ہے نہیں ہے تجھ سا دوجا
بیٹھی ہے بچھائے کوئی آسن   کہتی ہے یہی کہ اے برہمن
آ مجھ کو تنک تلک لگادے   صورت مجھے شیو کی دکھادے
سورج سے کوئی نظر ملاکر   پانی کو ہتھیلی میں اٹھاکر
چک پھیری کے جلد پڑھ کے کچھ ساتھ   لے جاتی ہے لب سے مانگ تک ہاتھ

(سعادت یار خاں رنگین)

زن و مرد کا تھا بہت واں ہجوم   سر آپ آتش پرستوں کی دھوم
تھے آمادۂ غسل اس جائے سب   کوئی ان میں گل چہرہ کوئی غنچہ لب
ہر اک سمت خیل پری وش زناں   بہم گرم بازی و غوطہ زناں
کوئی دست بستہ سوئے آفتاب   کوئی شرمگیں ہے کوئی بے حجاب

(راسخ عظیم آبادی)

اٹھ رہی ہے یوں شوالوں سے صدا ناقوس کی   چھیڑ دے جیسے کوئی برہا کی ماری راگنی

(عشرت کرتپوری)

سناتن دھرم کے ماننے والے بنارس کے مندروں کے ساتھ ساتھ دریائے گنگا کے پاک و مقدس پانی سے گہری عقیدت رکھتے ہیں مگر افسوس کی بات ہے کہ پچھلے چالیس پچاس برسوں میں دریائے گنگا کی صفائی پر بہت کم دھیان دیا گیا ہے۔ اس میں غلاظت اور گندگی بڑی بے دردی سے ڈالی جارہی ہے جس کی وجہ سے اس کے پاک و صاف پانی کی شفافیت پر سوال اٹھنے لگا ہے۔ اس کی طرف نذیر بنارسی نے اپنی نظم 'گنگا پردوشن' میں توجہ مبذول کرائی ہے۔

ڈرتا ہوں رک نہ جائے کو یتا کی بہتی دھارا   میلی ہے جب سے گنگا، میلا ہے من ہمارا
قبضہ ہے آج اس پر بھینسوں کی گندگی کا   اسنان کرنے والو جس پر ہے حق تمہارا
شردھائیں چیختی ہیں، وشواس رو رہا ہے   خطرے میں پڑ گیا ہے پرلوک کا سہارا

دوسری نظم 'جس کو کہتے ہیں بنارس' کا یہ شعر بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

گندگی لہروں کی دیکھو دھیان سے پیارے صنم
یہ وہی گنگا ہے ہم نے جس کی کھائی تھی قسم

جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے، بنارس کی زراعی پیداوار میں آم اور پان کا مفرح ذائقہ ہے۔ ہر چند وہاں کے لنگڑا آم کی کاشت اب برصغیر کے مختلف علاقوں میں ہونے لگی ہے، بنارس کے لنگڑا آموں کا مزہ اور چاشنی منفرد ہے۔ نذیر بنارسی اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

بنارس کی قسم رس سے بھرا ہے   یہی اک پھل ہے جو سب کا سگا ہے
ملاکر منہ سے منہ کرتا ہے باتیں   یہ لنگڑا آم کتنا منہ لگا ہے
کسے اس دور میں فرصت ہے پیارے   کہ تجھ کو بیٹھ کر چاقو سے چھیلے
ادھر آ میں تجھے منہ سے لگالوں   مرے لنگڑے مرے بانکے رسیلے

ظریف شاعر ساغر خیامی کا یہ قطعہ بھی لنگڑا آم کی عوامی پسندیدگی پر دال ہے۔

تجربہ ہے ہمیں محبت کا   دل حسینوں سے پیار کرتا ہے
آم تیری یہ خوش نصیبی ہے   ورنہ لنگڑوں پہ کون مرتا ہے

اکبر الہ آبادی نے علامہ اقبال کو لنگڑا آموں کا تحفہ پارسل سے بھیجا تھا پھر پارسل ملنے کی خبر آنے پر اپنے مخصوص انداز میں ایک پر مزاح شعر کہا تھا۔

اثر یہ تیرے انفاس مسیحائی کا ہے اکبر   الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

بنارسی پان کی پورے ملک میں اپنی ایک پہچان ہے۔ شوقین لوگ اسے بطور تحفہ بھی لے جاتے ہیں۔ اس میں دھیمی دھیمی خوشبو اور الگ مزہ ہوتا ہے۔ اس کے ملائم اور ذائقہ دار پتوں کا نفاست سے گلوری بنانا اور دھیرے دھیرے چبانا تہذیب اور توقیر کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ یہ محبوب کے ہونٹوں کی لالی اور حسن و جمال میں اضافے کا سبب بھی ہے۔ اس ضمن میں دو شعر دیکھیے۔

مسّی کوئی آئی ہے لگاکر   آئی ہے دھڑی کوئی جماکر
کوئی کرکے گلوری پان کی ٹھیک   پھینکے ہے چباکے بس وہیں پیک

(رنگین)

اس میں شک نہیں کہ مختلف مذاہب کے لوگ نہ صرف بنارس میں آباد ہیں بلکہ وہاں سے جذباتی وابستگی اور روحانی ارادت رکھتے ہیں۔ یہ سلسلہ سیکڑوں برسوں پر محیط ہے۔ دوسری زبانوں کے قلمکاروں کی طرح اردو شاعروں نے بھی گاہے گاہے، بنارس کے رنگا رنگ فطری ماحول و منظر اور مذہبی ریتی رواج کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے نیز اپنے جذبات و احساسات کا حسین ملفوظی مرقع پیش کیا ہے جو ادبی تاریخ میں قابل ذکر اضافے کا باعث ہے۔

ماخذ و مصادر

2 تاریخ بنارس (دو جلدیں) مصنفہ سید مظہر حسن مطبوعہ بنارس، 1916-1926
2 سخنوران بنارس مصنفہ امرت لعل عشرت مطبوعہ وارانسی، 1968
3 صبح بنارس مرتبہ عشرت کرتپوری مطبوعہ دہلی، 1963
4 غالب اور بنارس مرتبہ شاہد ماہلی مطبوعہ دہلی، 2010
5 مثنوی چراغ دیر مع پانچ اردو تراجم مرتبہ پروفیسر صادق مطبوعہ دہلی، 2015
6 غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ مصنفہ خلیق انجم، مطبوعہ نئی دہلی، 2005
7 کلیات نذیر بنارسی مرتبہ ناصر حسین خاں، مطبوعہ دہلی، 2014

■

Prof. Rais Anwer
Maheshpatti
Raj Toli Lane
Darbhanga-846004
Cell: 7903767402 , 9471642697
rais.anwer4@gmail.com

اقبال مجید کی افسانہ نگاری

ریاض توحیدی کشمیری

"تخلیقی عمل کی طرح تخلیقی مطالعہ بھی ہوتا ہے۔"

(آر ڈبلیو ایمرسن)

تخلیقی کام جتنا معیاری ہوگا اتنا ہی اس کا تجزیہ تخلیقی نوعیت کا ہونا چاہیے کیونکہ ایک ناقد تخلیقی تجزیے کے دوران تخلیق کے فنی و موضوعاتی اسرار و رموز کی توضیح کرتے اور جائزہ لیتے ہوئے اپنی فکر و دانش، تجربہ و مشاہدہ اور معلومات کو بھی شامل کر دیتا ہے تاکہ اس تخلیق کی فنی و معنوی جہات کی روشن کرنیں جگمگا اٹھیں، اور اقبال مجید جیسے تخلیقی فنکار (Creative Artist) کی معیاری تخلیقات، تخلیقی تجزیے کا علمی و فنی تقاضا کرتی ہیں۔

اقبال مجید (جولائی 1934 - جنوری 2019) طویل عرصے تک جہانِ فکشن کو اپنی تخلیقات سے نوازتے رہے اور اس طویل تخلیقی دورانیے (Creative space) میں، ان کے جتنے بھی افسانے سامنے آئے ان میں کہیں بھی موضوع کو دہرانے کا عمل نظر نہیں آتا ہے بلکہ انھوں نے ہمیشہ اپنی تخلیقات میں تخلیقی و فکری اور موضوعاتی گہرائی و گیرائی (Depth and hold) کو تازہ رکھا جس کی وجہ سے، ترقی پسند فکر کا حامل ہونے کے باوجود ان کی فکشن نگاری میں موضوعاتی یکسانیت دکھائی نہیں دیتی ہے یا کئی لوگوں کی طرح فقط لفظوں کی کھوکھلی بیساکھی کے سہارے آگے نہیں بڑھے، بقول حسن شکیل مظہری۔

نہ جذبوں میں کوئی شدت نہ گیرائی نہ گہرائی
فقط لفظوں کی بیساکھی پہ ہے ساری شناسائی

تخلیقی جوہر کی یہی خوبی اقبال مجید کو کسی مخصوص ادبی یا سیاسی نظریے کے اندر محدود نہیں رکھتی ہے بلکہ وہ ایک حقیقی تخلیق کار کی حیثیت سے ادبی افق پر چھائے ہوئے ہیں۔ اقبال مجید کی تخلیقی بصیرت کا احاطہ کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی رقمطراز ہیں:

"...اقبال مجید کی مجموعی بصیرت جس میں ان کی فنی استعداد بھی شامل ہے ہمیں خاص طور پر متوجہ کرتی ہے اور اپنے ہم عصروں میں وہ ہمیں اس لیے بھی ممتاز دکھائی دیتے ہیں کہ ایک تو ان کی تخلیقی سرگرمی پچھلے چند برسوں میں پہلے سے بڑھی ہوئی ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کے تخلیقی ضبط میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ وہ اب کہانی کو پھیلانے سے زیادہ اس کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے تجزیے کی مفصل تشریح سے زیادہ اس کی تخلیقی تعبیر پر توجہ صرف کرتے ہیں۔"

(بحوالہ کتاب 'اقبال مجید کی ادبی کائنات: مرتبہ راشدہ حیات، ص 98)

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ابتدا میں اقبال مجید کے افسانوں کا پلاٹ توضیحی نوعیت کا تھا یعنی وہ موضوع کو پیش کرتے ہوئے اس کو اس طرح کھولتے رہتے تھے کہ فنی چابکدستی ڈھیلی پڑ جاتی تھی تاہم رفتہ رفتہ ان کا تخلیقی اپروچ بدلتا گیا۔ انھوں نے توضیحی اسلوب کے بجائے فنی اسلوب کی طرف رخ کر لیا۔ بقول شمیم حنفی 'تخلیقی تعبیر پر توجہ' دیتے رہے۔ اقبال مجید کے افسانوی نشیب و فراز کی یہ مثالیں ان کے درجہ ذیل افسانوی مجموعوں میں دیکھی جا سکتی ہیں:

'دو بھیگے ہوئے لوگ' (1970)، 'ایک حلفیہ بیان' (1980)، 'شہر بدنصیب' (1970)، 'تماشا گھر' (2003)، 'آگ کے پاس بیٹھی عورت' (2010)، 'قصہ رنگ شکستہ۔ منتخب افسانے' (2011)، 'خاموش مکالمہ' (2017)۔

فکشن میں زیادہ تر خارجی مشاہدے کو داخلی جذبے کا حصہ بنا کر تخلیق کرنا پڑتا ہے تو ہی ایک تخلیقی فن پارہ وجود میں آتا ہے، بجائے اس کے کہ اگر صرف خارجی مشاہدے کو من و عن تھوڑا بہت واقعاتی رنگ میں رنگ کر پیش کیا جائے تو اس میں افسانوی فسوں (Fiction Enchantment) زائل ہی ہو جائے گا۔

فکشن میں فسوں آمیز کیفیت تخلیقی شعور سے پیدا ہو جاتی ہے اور اقبال مجید کا بالیدہ تخلیقی شعور فکشن میں فسوں آمیز کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے کیونکہ ان کے بیشتر افسانوں کی یہ فسوں آمیز کیفیت ہی ان کے فنی معیار کو بلندی عطا کرنے میں کلیدی رول نبھاتی ہے اور انھیں اردو کے معتبر فکشن نگاروں میں شامل کر دیتی ہے، جیسا کہ پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، ان کے افسانوں میں تخلیقی شعور کی بالیدگی کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان کے فکشن میں خارجی دنیا کا شعور ان کے تخلیقی شعور پر حاوی نہیں، بلکہ وہ خارجی دنیا کو اپنے تخلیقی شعور کے ہی ذریعے سے پرکھتے اور پہچانتے ہیں۔"

یہ تخلیقی شعور کی بلندی اور فنی و تکنیکی تجربہ کاری، اقبال مجید کے کئی افسانوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جیسے 'دو بھیگے ہوئے لوگ'، 'سرنگیں'، 'کھنڈر قندیلیں' اور 'خاموشی'، 'میراث'، 'پیٹ کا کیچوا'، 'آخری پتہ'، 'ملک یاقوت کا نوحہ'، 'آگ کے پاس بیٹھی عورت'، 'حکایت ایک نیزی کی'، 'شہرِ بدنصیب'، 'نقد بھکتان'، 'سڑی ہوئی مٹھائی'، 'پیشاب گھر آگے ہے'، 'ہائی وے پہ ایک درخت'، 'جنگل کٹ رہے ہیں'، 'آخری پتہ'، 'تماشہ گھر' وغیرہ۔

اقبال مجید کا افسانوی سفر ترقی پسند افسانہ اور جدیدیت کے علامتی و تجریدی ہنگامہ خیز دور میں شروع ہوا اور دونوں کے اثرات قبول کرنے کے باوجود انہوں نے اپنے افسانوں میں فن اور موضوع کو افسانوی اسلوب میں ہی پیش کیا نہ کہ جدید بننے کی رواروی میں فن کو ہی

نظر انداز کر دیا۔ البتہ اطلاعاتی اسلوب (Informative style) یعنی خبریہ انداز کے برعکس فنی لوازمات کا خیال رکھتے ہوئے علامتی واستعاراتی اسلوب کے ساتھ ساتھ رمز و کنایہ کو بھی استعمال میں لائے جس سے ان کے افسانوں کا افسانوی رنگ برقرار رہا ہے۔ افسانہ 'دو بھیگے ہوئے لوگ' کی شروعات بظاہر اچانک ہونے والی برسات سے ہوتی ہے اور جب افسانے کے دو کردار 'میں' اور 'وہ' بارش سے بچنے کے لیے سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی چھت کی پناہ میں آجاتے ہیں۔ اس دوران دونوں کے درمیان تھوڑا بہت مکالمہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک افسانہ بظاہر راست بیانیہ میں موسم کی اچانک خرابی، بارش کے برسنے سے دونوں کرداروں کی الجھن اور چھت کے نیچے بیٹھ کر بارش رکنے کا انتظار وغیرہ منظر اور بارش سے بھیگنے کے ذہنی تناؤ کا ماجرہ ہی سامنے آتا ہے لیکن یہ سب صورت حال اس وقت علامتی اور رمزیہ صورت اختیار کر جاتی ہے جب یہ دونوں دوبارہ چائے کی ایک دکان پر ملتے ہیں اور پھر دونوں کی گفتگو افسانے کے تھیم اور بنیادی پیغام کو سامنے لاتی ہے۔ مرکزی کردار پہلے اس کردار پر بارش کے باوجود چھت سے اس کے ساتھ نہ نکلنے پر طنز کرتا ہوا 'کاہل، کوڑھ مغز، پست ہمت اور مردہ کہتا ہے جب کہ خود کو جدید دور کا آدمی ثابت کرتے ہوئے 'کاوش' 'Exploration'، اور تلاش کا رسیا ظاہر کرتا ہے۔ دوسرا آدمی اس کی باتیں سن کر مسکراتا رہتا ہے لیکن یہ خود غصے کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ بالآخر افسانہ تکنیکی سطح پر اس وقت پہلے والے موضوعاتی منظر کو ایک جھٹکے میں بدل دیتا ہے جب پہلا کردار کافی ہاوس (جدید تہذیب) کے برعکس روایتی قسم کی سرخ انگاروں والی بھٹی (قدیم تہذیب) کے نزدیک اپنے بھیگے کپڑے سکھانے کے لیے فرحت محسوس کرتا ہے اور دوسرا کردار بھی وہاں آتا ہے اور مکالمہ شروع ہو جاتا ہے۔ پہلا کردار جب اسے کپڑے بھیگنے کے ڈر سے چھت سے باہر نہ آنے پر طنز کرتا ہے تو دوسرا کردار سب کچھ سننے کے باوجود صبر سے کام لیتا ہے اور دونوں کے درمیان مکالمہ شروع ہو جاتا ہے جو افسانے کے بنیادی مقصد کو سامنے لاتا ہے:

''آپ کے پاس جوتے، قمیص، ریزگاری کے علاوہ کوئی چیز نہیں لیکن میرے پاس ہے، آپ کے لیے اگر جوتے، قمیص، پتلون اور ریزگاری بھی بھیگ جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن میں جوتے اور کپڑوں کے بھیگ جانے پر بھی اس چیز کو بچانا چاہتا ہوں۔''

''کس چیز کو؟'' میں طیش میں آکر چیخ پڑا۔

''وہی چیز جو میرے پاس ہے، آپ کے پاس نہیں۔''

یہی جواب پہلے کردار کو حیران کر دیتا ہے کیونکہ دوسرے کردار کے پاس تہذیب وتمدن، انسانیت واخوت، اپنائیت اور ہمدردی ومحبت کا روایتی سرمایہ موجود ہوتا ہے جو وہ جدید دور کی چکا چوند زندگی پر فریفتہ ہو کر گنوانا نہیں چاہتا تھا جبکہ پہلا کردار سب کچھ گنوا کر بس زندگی جینے کے بجائے زندگی کاٹ رہا تھا اس طرح افسانہ

زندگی کے فطری سرمایے اور جدید دور کے مصنوعی ماحول کو سبق آموز پیغام کے ساتھ اجاگر کرتا ہے۔ افسانے کے بظاہر دو کردار ہونے کے باوجود جیسے یہ ایک ہی انسان کے دو روپ نظر آتے ہیں، جو قدیم اور جدید زندگی کی رسا کشی کا اشاریہ بن جاتا ہے اور تکنیکی طور پر ایک ہی کردار کی فکر کے دوہرے احساسات (Dual feelings) کو فنی قالب میں ڈھالا گیا ہے۔

فکشن کی کئی اقسام ہیں جن میں ہارر فکشن بھی شامل ہے جو کہ 'Speculative' fiction کے زمرے میں آتا ہے۔ ہارر فکشن میں ایک ایسی کہانی پیش کی جاتی ہے جس میں خوف انگیز ماحول خلق کیا جاتا ہے جو کہ عموماً مافوق الفطرت مخلوق (Supernatural Beings) جیسے بھوت پریت، جنات وغیرہ کرداروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ روایتی ادب میں ہارر فکشن زیادہ تر لوک کہانیوں (Folk tales) یا داستانوں کا حصہ رہا ہے، تاہم فکشن میں بھی یہ رائج ہو کر ادب کا حصہ بن گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہارر فکشن میں جنگلوں کی خوفناک صورت حال کے دل دہلانے والے مناظر بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ انگریزی فکشن کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی ہارر فکشن لکھا گیا ہے۔ اقبال مجید کا ایک افسانہ 'کھنڈر، قندیلیں اور خاموشی' ہارر فکشن کی اچھی عکاسی کرتا ہے کیونکہ نیم داستانی اسلوب کا حامل یہ افسانہ اپنی پُراسرار فضابندی میں خوف انگیز ماحول تشکیل دینے میں کامیاب نظر آتا ہے اور ابتدائی حصے میں سرائے کے تصوراتی ہارر اور پھر ایک پہاڑی قبیلے کے لوگوں کے ساتھ فوج اور دوسری ایجنسیوں کے دہشت ناک برتاؤ کے خوف کا دوسرا منظر سامنے لاتا ہے۔ ابتدائی توہم آمیز خوف کی عکاسی افسانے کے شروعات میں اس طرح سے ہوئی ہے:

''عجیب پُراسرار اور بھید بھرا علاقہ تھا وہ۔ ایک طرف پہاڑیاں اور دوسری جانب گھنا طویل جنگل۔

پہاڑوں کی وادی میں کچھ تاریخی اجڑے ہوئے خاندانوں کے تقریباً ایک ہزار گھروں کی ایک عجیب وغریب بستی تھی۔''

تو ابتدا ہارر تکنیک سے شروع ہو جاتی ہے اور راوی بصورت صیغہ واحد مرکزی کردار کا تقرر اس دور افتادہ پہاڑی علاقے کے ایک خیراتی اسپتال میں بطور سرجن ہوا تھا۔ اسپتال کے پچھواڑے کے کچھ فاصلے پر ایک کھنڈر تھا جو کہ کسی زمانے میں ایک سرائے تھی اور پرانے زمانے کے عملداروں یا راجاؤں نے بنوائی تھی۔ اس طرح ابتدا میں ہی افسانہ نگار فنی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے، ہارر فکشن کے لیے جس قسم کی پلاٹ سازی اور اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے، کو برتنے میں شعوری طور پر کامیاب نظر آتا ہے کیونکہ یہی اسلوب قاری کو افسانہ پڑھنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ افسانہ نگار خود بھی اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے آگے کے قصے کے بیان کے لیے تجسس آمیز اشارہ کرتا ہے کہ ''اس کے بعد جو کچھ ہوا اور جس کی حیرت خیزی میں، میں گلے گلے ڈوبتا گیا، چاہتا ہوں کہ اس کا بیان بھی کچھ ایسے انداز میں ہو کہ اس حیرت خیزی کا رنگ نہ دھندلانے پائے۔''

افسانے کا ایک اور کردار کمپاونڈر طغرل خان بیگ بھی راوی کو کھنڈر کے اندر کسی خفیہ تہہ خانے سے

متعلق مطلع کرتا ہے اور ایک دفعہ راوی کو بھی کھنڈر کی جانب عجیب وغریب آہٹیں محسوس ہوتی ہیں اور کھنڈر کے آخری کنارے پر اونچے قد والے چند سیاہ سائے کچھ پلوں کے لیے متحرک ہوکر اندھیروں میں سمائے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اس طرح راوی فکری طور پر اس پُراسرار کھنڈر کی حیرت زا صورت حال سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ افسانے میں طغرل خان بیگ کے علاوہ ایک خاتون کردار 'جوجو' بھی ہے جو نصف افسانے کی کہانی میں اہم رول نبھاتی ہے کیونکہ اسی کے ذریعے قبائلی لوگوں پر ہورہے مظالم اور استحصال کی کہانی سامنے آتی ہے۔ جبکہ طغرل خان بیگ افسانے میں اکثر راوی یعنی مرکزی کرداراول کو کھنڈر، بستی اور لوگوں کے بارے میں اس طرح سے بتاتا رہتا ہے کہ راوی کے خوف وڈر اور وہم میں اضافہ ہی ہوجاتا ہے۔ خوف وڈر اور وہم کی اسی نفسیاتی کیفیت کے دوران ایک بار راوی کو ایک رات ایسے محسوس ہوتا ہے جس کا اظہار افسانے میں اس طرح سے کیا گیا ہے:

''میں بے چین نیند سویا، مجھے لگا کوارٹر کی دیواروں میں کچھ موٹی موٹی جنگلی بلیاں اپنی خونخوار آنکھوں کی ہیبت ناک مشعلیں جلائے دبے دبے بے آواز قدموں سے چل رہی ہیں اور جلتی ہوئی مقناطیسی آنکھوں کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر اور گردن موڑ موڑ کر بار بار میری خوابگاہ کو یوں گھور رہی ہیں جیسے اپنے شکار کو گھورتی ہیں۔''

لیکن یہ افسانہ نگار کا وہم ہوتا ہے جو کہ اس علاقے میں پہنچنے کے بعد وہاں کی مجموعی حیرت انگیز صورت حال کا نفسیاتی نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد افسانہ اصلی خوف ناک صورت حال کی طرف مڑ جاتا ہے جو کہ راوی یعنی سرجن کو رفتہ رفتہ خود بھی پتہ چلتا ہے اور خصوصی طور پر دوسرے کردار 'جوجو' کی مایوسی اور پھر بعد میں جب وہ صحافی بن جاتی ہے، سے بیس سال بعد ملنے سے واضح ہوجاتی ہے۔ انجام میں افسانہ نگار نے ایک اخلاقی پیغام دیا ہے جو کہ 'جوجو' کی گرفتاری کے بعد راوی سے نہ ملنے کے فیصلے سے سامنے آتا ہے۔ سرجن جب اسے جیل میں ملنے کے لیے جاتا ہے تو وہ وکیل کے ذریعے یہ کہہ کر ملنے سے انکار کرتی ہے کہ ''وہ قبروں میں سوئے ہوئے گونگے لوگوں سے نہیں زندہ لوگوں سے مل سکتی ہے جنھیں محسوس کرنا اور بولنا آتا ہو۔''

''جوجو' اصل میں اسی قبیلے کی ایک جرأت مند

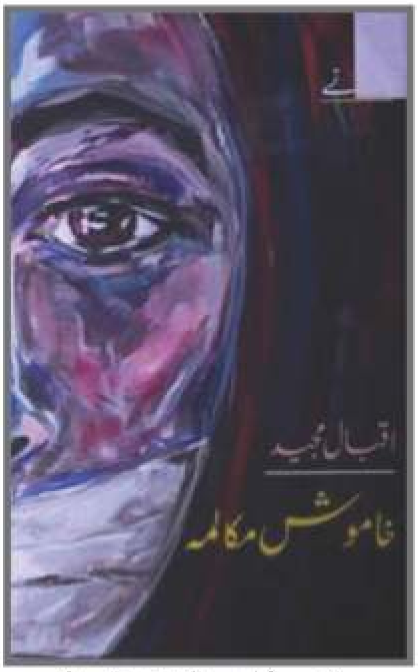

عورت ہوتی ہے جو عملی طور پر ظلم سہتی رہتی ہیں لیکن اس کے باوجود اپنے قبیلے پر ہورہے ظلم وستم کو ایک صحافی بن کر دنیا کے سامنے لاتی ہے۔ اس طرح سے افسانہ نفسیاتی وسماجی خوف کی عمدہ عکاسی کرکے قاری کو متاثر کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔

افسانہ 'دو بھیگے ہوئے لوگ' کے کردار کے دوہرے احساسات کی طرح افسانہ 'پیٹ کا کیچوا' بھی فکری سطح پر ایک ہی کردار کے دوروپ سامنے لارہا ہے، جو کہ ذات کے داخلی اور خارجی تصادم (Inter and outer clash) کی فنی عکاسی کرتا ہے اور بیانیہ میں تمثیلی اسلوب (Allegoric style) کے توسط سے کہانی کو موثر بنایا گیا ہے۔ فکری سطح پر افسانے کا بنیادی قضیہ ذات کا داخلی وخارجی تصادم ہے جس کا موضوعاتی محرک مادیت اور روحانیت کی کشمکش ہے۔ مادیت بصورت عقلیت پسندی (Rationalism) مرد (شوہر) کے کردار سے ظاہر کردی گئی ہے اور روحانیت بصورت مذہب پرستی (Religionism) عورت (بیوی) کی کردار نگاری سے سامنے آتی ہے۔ مرد فکری سطح پر مذہب بیزار ہوتا ہے جبکہ عورت دین پسند ہوتی ہے لیکن مرد کے اندر عقلیت اور مذہبیت کا فکری تصادم اس وقت اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے جب ان کے فوت شدہ بیٹے کی تکفین وتدفین، جو کہ دینی احکامات کے مطابق ہی انجام دینا ضروری بن جاتا ہے۔ کا مسئلہ کھڑا ہوجاتا ہے۔

افسانے کا عنوان 'پیٹ کا کیچوا' موضوع کے ساتھ عمدہ ربط رکھتا ہے۔ کیچوا (Earthworm) ایک ایسا کیڑا جو عام طور پر برسات میں زمین کی نمی میں پیدا ہوجاتا ہے، کشمیری میں اسے 'بوم سیم' کہتے ہیں۔ تاہم کیچوا کا ایک اور معنی پیٹ کے اندر کا وہ کیڑا ہے جو معدے کی خرابی کے باعث بنتا ہے اور یہ مٹی کے کیچوے کی طرح ہوتا ہے۔ اسے کرم شکم (Helminthic) بھی کہا جاتا ہے۔ اب افسانے میں پیٹ کے کیچوے کی جو تخلیقی صورت سامنے لائی گئی ہے وہ ایک ملحد (Athiest) کے فکری کیچوے کی عکاسی کرتی ہے جو ہمیشہ عقل کے گھوڑے دوڑاتا رہتا ہے اور دنیا کی زندگی کو ایک میکینکل پروسس سمجھتا ہے جس کی وجہ سے وہ دین و مذہب اور خدا و عقیدے کو ماننے سے انکار کرتا رہتا ہے۔ جیسے وہ ایک دفعہ بیوی سے کہتا ہے جب وہ اماں کو برا لگنے کی بات کہتی ہے:

'' ان سے کہہ دو کہ میں خدا کو نہیں مانتا، میں مذہب کو ایک غیر ضروری چیز سمجھتا ہوں۔''

یا یہ جملہ:

''پرواہ نہیں۔'' میں بولا'' میں نے تم سے شادی کی ہے تمہارے عقیدے سے نہیں۔''

شوہر سنی ہوتا ہے اور بیوی شیعہ، لیکن افسانے میں شیعہ سنی کا مسئلہ نہیں بلکہ شوہر ملحدانہ فکر کا حامل ہوتا ہے۔ اب اس کی مشکل یہ بن جاتی ہے جب وہ اپنے علاقے سے دور کسی اور جگہ ہوتا ہے اور اس کا سات برس کا بیٹا 'راجہ' مر جاتا ہے۔ اب اس کی بیوی بچے کی تجہیز وتکفین مذہبی طور طریقوں سے انجام دینا چاہتی ہے جبکہ اس کا شوہر مادیت پرستانہ سوچ کے مطابق کفن دفن کے اخراجات کا حساب کرتا رہتا ہے۔ افسانے کی بنیادی تھیم، ایسے نازک موقعے پر مرکزی کردار ملحد شوہر کا فکری تصادم ہے جو اس کی بے بسی اور عقل اور عقیدے کے مابین رسا کشی کو فنی ڈسکورس بنا رہا ہے۔ اور پیٹ کا کیچوا اس کی ذات کا وہ دوسرا کردار ہے جو اس کی ملحدانہ سوچ وفکر پر طنز کے تیر چلاتا رہتا ہے۔ کردار جب پڑوس کے گھروں سے مایوس ہوکر لوٹتا ہے تو افسانہ اس کا منظر یہ کھینچتا ہے:

''میں مردہ قدموں سے اپنے کمرے میں اندھیرے میں جاکر پھر بیٹھ گیا۔ اس کا میرا بڑا پرانا ساتھ تھا۔ وہ میری کمزوریوں کو خوب جانتا تھا، لیکن اس بار وہ ہمیشہ سے زیادہ حربے استعمال کررہا تھا۔ میری آنتوں میں

رینگتے ہوئے بولا:

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ زندگی ہو یا موت، پیسے کے علاوہ بھی کچھ ہونا چاہیے۔''

''کیا مطلب۔'' میں نے مری سی آواز سے پوچھا۔

''مطلب یہ'' اس کا لہجہ اداس تھا،'' کہ تمھارے پاس دوسو روپے موجود ہیں، لیکن پھر بھی تم بے بس ہو، لوگوں کے گھروں کی کنڈیاں کھٹکھٹاتے پھر رہے ہو۔''

''دیکھو میں بہت پست ہوگیا ہوں'' میں نے خوشامد کی۔'' خدا کے لیے مجھ پر یوں تیر نہ چلاؤ۔''

راجہ کی لاش اپنے عقیدے کے مطابق دفنائی جاتی ہے، جس سے اسے تھوڑی بہت راحت محسوس ہوتی ہے لیکن پیٹ کا کیچوا اس کی فکری گمراہی پر پھر بھی کچوکے لگاتا رہتا ہے اور بالآخر اپنی فکری گمراہی پر اسے افسوس ہوہی جاتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ'' میں اسے بڑی مشکل سے کہہ سکا، میں ایک صحت مند انسان کب ہوں۔''

ذاتی طور پر مجھے افسانہ'پیٹ کا کیچوا' فنی اور تکنیکی تجربے کے علاوہ پلاٹ سازی میں عمدہ موضوعاتی برتاؤ کے پیش نظر افسانہ'دوبھیگے ہوئے لوگ' سے زیادہ معیاری لگا۔ کیونکہ اس کے پلاٹ میں گہرائی، کردارنگاری میں سنجیدہ پن اور موضوع کا منطقی وفنی ربط ایسی فنی صنعت گری کا مظہر ہے کہ دلچسپ اور قابل بحث مکالمے کی راہ ہموار کرتا ہے اور ایک معنی خیز کہانی سامنے لاتا ہے۔ جزئیات نگاری بھی کمال کی ہے اور افسانوی رنگ بھی واضح جھلکتا ہے۔

افسانے میں اگر داستانی رنگ وآہنگ شامل ہوجائے تو اس کا افسانوی رنگ نکھر جاتا ہے۔ اقبال مجید کے چند افسانوں میں یہ داستانی رنگ وآہنگ بھی نظر آتا ہے، جس کی وجہ سے یہ افسانے اپنا افسانوی رنگ دکھانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان میں افسانہ'شہر بدنصیب' بھی شامل ہے۔ ابتدا میں افسانہ واقعاتی اسلوب سے شروع ہوا ہے یعنی جب راوی ایک رات اس کے گھر کی کھڑکی کھلی رہنے کے بعد ایک مشہور تاریخی یا داستانی کردار'حاتم طائی' کو کھڑکی سے اندر آنے کے بعد صوفے پر بیٹھتا دیکھتا ہے۔ حاتم طائی، جو کہ عرب کے قبیلہ طائی کا ایک مشہور ومعروف سخی گزرا ہے جو کہ اب اپنی سخاوت کی وجہ سے تاریخی اور داستانی کردار بن چکا ہے۔ جب راوی اسے دیکھتا ہے تو معلوم ہونے پر وہ حیرت وانبساط سے سرشار ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد افسانہ پہلے مکالمہ نگاری سے شروع ہوجاتا ہے اور جب حاتم طائی اپنی پیاس بجھانے کے لیے اس سے بادام کا شربت مانگتا ہے تو راوی کو غصہ آتا ہے اور یہ دیکھ کر حاتم اور راوی کے درمیان غصے پر مکالمہ ہوجاتا ہے:

''غصہ آرہا ہے تو آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔''

وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

''خدا کا شکر کیوں؟''

''اس لیے کہ بڑے بدقسمت ہوتے ہیں وہ لوگ اور قومیں جنھیں غصہ نہیں آتا۔''

اس کے بعد افسانہ آگے بڑھتا ہے اور پھر داستانی اسلوب اختیار کرجاتا ہے جس میں حاتم کی زبان سے غصہ نہ کرنے کی کہانی اور اس کے منفی اثرات کی کہانی 'شہر بدنصیب' کے واقعہ سے پیش کی جاتی ہے جہاں پر اتنا اخلاقی انحطاط (Moral Decadence) پھیلا ہوا تھا کہ لوگ کسی بھی سماجی واخلاقی برائی پر غصہ نہیں ہوتے تھے اور پھاٹک کا داروغہ حاتم طائی کے غصے سے اتنا خوش ہوجاتا کہ وہ اسے مہمان بناتا ہے۔ دونوں کے درمیان مکالمہ دیکھیں:

''اے مرد خدا یہ کیا راز ہے؟ پہلے تو تُو نے مجھے گالیاں دیں اور پھر محبت کے ساتھ میرا استقبال کیا۔''

داروغہ یہ سن کر اداس ہوگیا اور بولا:

''گالیاں اس لیے دیں کہ تجھے غصہ آئے اور گلے اس لیے لگایا کہ تو پہلا مسافر ہے جس کا ہم برسوں سے خواب دیکھ رہے تھے۔''

تب وہاں حاتم کو پتہ لگا کہ جس شہر میں وہ داخل ہوا ہے اس شہر کا نام'شہر بدنصیب' ہے کیونکہ وہاں کسی کو کسی بات پر غصہ نہیں آتا تھا۔

لیکن جب داروغہ حاتم طائی سے پوچھتا ہے کہ وہ کس شہر کا باسی ہے تو داروغہ جواب سن کر حیران ہوجاتا ہے جب حاتم کہتا ہے کہ وہ بھی شہر بدنصیب کا رہنے والا ہے، پوچھنے پر وہ بتاتا ہے:

''وہ ایسے'' حاتم نے جواب دیا'' کہ میرے شہر میں لوگ چھوٹی سی چھوٹی بات پر بھی غصہ کرتے ہیں۔''

اس کے بعد مرکزی موضوع یعنی غصے کی نفسیات کے منفی اور مثبت پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے کہ کہاں پر غصہ کرنا جائز ہے اور کہاں پر ٹھیک نہیں ہے۔

داروغہ جب جب حاتم سے سوال کرتا ہے کہ اب اس کی منزل کدھر ہے تو حاتم شہر خوش نصیب کی طرف جانے کا بتاتا ہے:

پھر داروغہ نے حاتم سے سوال کیا۔

''اے نیک بخت تیری منزل کدھر ہے اور تو کس لیے جارہا ہے؟''

''سنا ہے آگے کہیں ایک شہر خوش نصیب بھی ہے۔'' حاتم بولا'' جہاں لوگ غصے کو ایک ایسی طاقت بناچکے ہیں جو برتر کو قائم کرنے اور کم تر کو ختم کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے، اسی کی تلاش میں جارہا ہوں۔''

اس طرح سے افسانہ انسان کی ایک نفسیاتی اور اخلاقی فطرت بصورت غصہ اور سماجی بودوباش اور استحکام کے لیے غصے کے منفی اور مثبت استعمال کو افسانوی ڈسکورس بنارہا ہے اور ایک خشک موضوع کو افسانہ نگار نے بڑے سلیقے سے کہانی کے روپ میں ایک حکمت آمیز اخلاقی فلسفہ (Moral Philosophy) کے طور پر پیش کیا ہے۔

افسانے کی بنت کاری میں عنوان، موضوعاتی برتاؤ، پلاٹ سازی، تکنیک، تخلیقی اسلوب اور تخیل آمیزی، کردار نگاری، جزئیات نگاری وغیرہ بنیادی فنی وسائل (Artistic Devices) ہوتے ہیں۔ اقبال مجید کی افسانہ نگاری میں بنت کاری، پلاٹ سازی، تکنیک، موضوعاتی برتاؤ، تخلیقی اسلوب کے ماہرانہ تجربے نظر آتے ہیں اور تخیل کے رنگارنگ جلوے افسانوی فضا کو فسوں خیز بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری... افسانوی روایت کی پاسداری بھی کرتی ہے اور ان کے افسانے جدید تجربات سے بھی آراستہ نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے افسانوں میں اس طرح سے افسانوی فضا تشکیل پزیر ہوئی ہے کہ قاری تخلیقی وفنی اور موضوعاتی وکہانی پن سے محظوظ ہوجاتا ہے اور کئی افسانے اس کے حافظے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس کے افسانوں کی ایک اور اہم خوبی عنوان کا انتخاب ہے کہ کہانی کے دوران اپنی معنوی اہمیت جگہ جگہ ظاہر کرتا ہے۔ انھیں فنی خوبیوں کی بنا پر اقبال مجید کا شمار اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

■

Dr. Reyaz Ahmad Bhat
Wadipora,
Handwara- 193221 (Kashmir)
Mob.:9906834877
drreyaztawheedi777@yahoo.com

اقبال احمد

جموں میں اردو زبان کی صورت حال

ہندوستان کی ریاست جموں وکشمیر ماضی میں تین حصوں پر مشتمل تھی: جموں، کشمیر اور لداخ۔ لیکن 31 اکتوبر 2019 کو اسے دو یونین ٹیریٹریز (ایک جموں وکشمیر اور دوسری لداخ) میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس طرح یہ ریاست جو تین خطوں پر مشتمل تھی دو حصوں میں بٹ گئی۔ جموں رقبے کے لحاظ سے پہلے نمبر پر جب کہ آبادی کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہے۔ جموں اس خطے کا مرکزی شہر ہی نہیں بلکہ سرمائی راجدھانی بھی ہے۔ جموں علمی، ادبی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دور سے لے کر اکتوبر 2019 سے تک جموں وکشمیر ہندوستان کی واحد ریاست تھی جہاں صرف اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا، یہ اس وقت ریاست کے تینوں خطوں میں رابطے اور بول چال کی زبان تھی۔ جموں وکشمیر آفیشل لینگویجز ایکٹ 2020 کے مطابق اب اردو کے ساتھ کشمیری، ڈوگری، ہندی اور انگریزی بھی جموں وکشمیر کی سرکاری زبانیں ہیں یعنی اب اس یونین ٹیریٹری کی پانچ سرکاری زبانیں ہیں۔

اردو زبان کا داخلہ جموں وکشمیر میں مغلیہ عہد میں ہوا جب کہ سکھوں کے دور حکومت میں اور خاص طور سے ڈوگرہ حکمرانوں کے زمانے میں اس کا فروغ ہوا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے دور حکومت (1846 سے 1856) میں ہمیں اردو زبان کے استعمال کے آثار نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس سے قبل اردو کے چلن کے متعلق وافر معلومات دستیاب نہیں ہیں۔

مہاراجہ گلاب سنگھ کے دربار میں ہندوستان سے آنے والے ملازمین اردو بولتے تھے اور مقامی لوگ اسے آسانی سے سمجھ لیتے تھے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں فارسی دفتری اور درباری زبان تھی لیکن جموں میں ڈوگری کا چلن عام تھا۔ ڈوگری لسانی اعتبار سے پنجابی اور اردو کے زیادہ قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب گلاب سنگھ نے بقیہ ہندوستان سے سیاسی اور ثقافتی تعلقات استوار کیے تو ڈوگری زبان نے جلد ہی اردو کے اثرات قبول کرنا شروع کر دیے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد حکومت میں اردو کی اشاعت ومقبولیت میں موسیقی نے نمایاں رول ادا کیا۔ ان کے عہد کے آخری ایام کی سرکاری کارروائیوں کی زیادہ تر نقلیں فارسی زبان میں ہیں لیکن چند ایک اردو میں بھی مل جاتی ہیں۔ اگرچہ مہاراجہ کے عہد حکومت میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ نہیں ملا لیکن یہ زبان عوام میں کافی حد تک مقبول ہو گئی تھی۔

مہاراجہ گلاب سنگھ کے بعد حکومت کی باگ ڈور مہاراجہ رنبیر سنگھ (1857-1887) نے سنبھالی۔ وہ علم وادب کا شیدائی تھا اور ریاستی عوام کو جدید علوم سے روشناس کرانا چاہتا تھا اسی مقصد سے اس نے ایک دارالترجمہ بھی قائم کیا تھا۔ اس کے علاوہ ریاست کی پہلی ادبی انجمن بدیا بلاس 1867 میں قائم کی جس سے اردو زبان و ادب کو فروغ ملا۔ مہاراجہ موصوف کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو زبان اس خطے میں اس قدر مستحکم ہوئی کہ تمام سرکاری اور غیر سرکاری ذمہ داریاں نبھانے کے قابل ہو گئی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں کئی اچھے شاعر اور ادیب بھی ابھر کر سامنے آئے جن میں پنڈت دیوان شیو ناتھ کول، پنڈت نند رام، بلبل کاشمیری، پنڈت واسودیو جی، پنڈت لچھمن نارائن بھان، سید انور شاہ اور رسول میر وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کی وفات کے بعد جب مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے عنان حکومت سنبھالی تو اس وقت تک اردو زبان ریاست میں عام طور پر رائج ہو چکی تھی۔ عوام بڑی تعداد میں اردو پڑھنے لکھنے کی جانب راغب ہو گئے اور اردو زبان ان کے خیالات کے اظہار کا ایک خوبصورت، مؤثر اور دلکش وسیلہ بن چکی تھی۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر ایک تاریخی فیصلہ لیا اور ریاست کے تینوں خطوں جموں، کشمیر اور لداخ کو ایک لسانی دائرے میں لانے کے لیے 1889 میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا جس سے اس زبان کو پھلنے اور پھولنے کے زیادہ مواقع میسر ہوئے۔

جموں مختلف مذاہب، تہذیبوں اور زبانوں کا سنگم ہے اور یہ اردو زبان وادب کے لیے بھی ایک زرخیز میدان ثابت ہوا ہے۔ یہاں اردو کے شعری، نثری، تحقیقی اور تنقیدی شعبوں میں قابل قدر خدمات انجام دی گئی ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی جموں میں ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس وقت کے دو رسائل 'ڈوگرہ گزٹ' 1911 اور 'مہاجن نیتی پتر' 1912 خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں اکثر مذہبی، سیاسی اور سماجی مضامین چھپتے تھے۔

ملک راج صراف نے یہاں کے ادیبوں کو جمع کرکے جموں میں اردو کی ایک انجمن 'بزم سخن' کے نام سے 1912 میں قائم کی جو بعد میں 'بزم ادب' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس انجمن نے صوبہ جموں میں اردو زبان وادب کے کے فروغ میں کافی اہم کردار ادا کیا۔ جموں کے جن ادیبوں، شاعروں اور ڈرامہ نگاروں نے اس خطے کے اردو ادب کے دامن کو اپنی تخلیقات کے ذریعے کافی وسعت دی ان میں محمد عمر، نور الٰہی، قیس شیروانی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی اور بیسویں صدی کی ابتدا میں چونکہ ریاستی حکومت یہاں کوئی بھی اخبار جاری کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی اس لیے متعدد کشمیری ملک کے دوسرے حصوں سے اخبارات جاری کرکے ریاست میں بھیجتے تھے اور یہاں کے عوام بیرون ریاست کے قلمکاروں کی اردو تخلیقات سے مستفید ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں خورشید عالم خان لکھتے ہیں کہ:

''مہاراجہ رنبیر سنگھ (عہد حکومت 1885-1857) اور پرتاپ سنگھ (عہد 1925-1885) کے ادوار میں کئی اہل دانش وبینش نے ایک آزاد منصب اخبار جاری کرنے کی اجازت طلب کی تو انھیں مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا، حکمرانوں کا سخت رویہ دیکھ کر کئی اصحاب فکر بیرون ریاست ہجرت کر گئے اور لاہور، سیالکوٹ، امرتسر اور لکھنؤ سے اپنی صحافتی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر کشمیر میں ہو رہے مظالم اور بنیادی حقوق کی خلاف ورزیوں کو ایک موہوم سی تصویر دنیا کے سامنے لانے میں جٹ گئے۔''

(اردو صحافت کے سنگ میل، پیش لفظ، خورشید عالم خان ص 14 قاسمی کتب خانہ جموں 2013)

جون 1924 میں اُردو کا پہلا مکمل اخبار 'رنبیر' منظر عام پر آیا۔ اخبار 'رنبیر' کے اجرا سے جموں میں اُردو زبان وادب کی ترویج میں تیزی آئی۔ خورشید عالم خان 'رنبیر' کے متعلق لکھتے ہیں:

''1924 میں لالہ ملک راج صراف اپنی تین برس کی جدوجہد کے بعد مہاراجہ کو اس بات پر قائل کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ وہ اخبار جاری کرنے کی اجازت دے۔''

(اردو صحافت کے سنگ میل خورشید عالم خان ص 63-53، قاسمی کتب خانہ جموں 2013)

اخبار 'رنبیر' میں جن شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات شائع ہوئیں ان میں مبارک علی بیگ، محمد عمر، نور الٰہی، پنڈت کشن سمیل پوری، قیس شیروانی، عرش صہبائی اور غلام حیدر چشتی وغیرہ کے نام کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

مہاراجہ گلاب سنگھ کے بعد حکومت کی باگ ڈور مہاراجہ رنبیر سنگھ (1887-1857) نے سنبھالی۔ وہ علم وادب کا شیدائی تھا اور ریاستی عوام کو جدید علوم سے روشناس کرانا چاہتا تھا اسی مقصد سے اس نے ایک دارالترجمہ بھی قائم کیا تھا۔ اس کے علاوہ ریاست کی پہلی ادبی انجمن بدیا بلاس 1867 میں قائم کی جس سے اردو زبان و ادب کو فروغ ملا۔ مہاراجہ موصوف کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو زبان اس خطے میں اس قدر مستحکم ہوئی کہ تمام سرکاری اور غیر سرکاری ذمہ داریاں نبھانے کے قابل ہوگئی۔

جموں میں اردو کے فروغ میں ادبی انجمنوں کا اہم رول رہا ہے۔ ادبی انجمنیں ادبی ذوق رکھنے والے افراد کے رجحانات کی عکاس ہوتی ہیں اور ان انجمنوں کا مقصد سیمینار، ادبی کانفرنسیں، مشاعرے وغیرہ منعقد کروانا ہوتا ہے۔ جموں کے تمام اضلاع میں ادبی انجمنیں قائم ہیں۔ 1935 میں بزم ادب کشتواڑ وجود میں آئی۔ یہ بزمِ ادب اُردو نشاط کشتواڑی، عشرت کاشمیری وغیرہ شاعروں اور ادیبوں کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اب اس بزم میں جمود سا آگیا ہے۔ بزم ادب بھدرواہ اپریل 1968 میں وجود میں آئی۔ اس کے ذریعے علاقے کے اہل سخن کو ملک کے دیگر ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں سے روشناس ہونے کا موقع ملا جن میں وہاں کے مشہور شاعر رسا جاودانی (مرحوم) کا نام سرفہرست ہے۔ بزم کے زیر اہتمام یادگاری مشاعرے، کانفرنسیں منعقد کی گئیں جن میں شام مہجور، یوم اقبال، شام رسا وغیرہ خصوصیت کی حامل ہیں۔ ڈوڈہ کی 'فریدیہ بزم ادب' کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کے ذریعے چار کل ہند مشاعرے منعقد کیے گئے، اس کے علاوہ اس بزم نے کتابیں بھی شائع کیں۔ اُن میں انوار فریدیہ اور ضلع ڈوڈہ کی ادبی ثقافتی تاریخ اہم ہیں۔ بزم ادب بانہال (1972)، کرشن چندر لٹریری کلب پونچھ، کرشن چندر میموریل، بزم ادب سرنکوٹ، انجمن فروغ اردو جموں، بزم ادب اُردو جموں، ادبی کنج جموں، انجمن محبانِ اُردو جموں، انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ جموں وغیرہ بھی اُردو کی ترقی وترویج کے لیے سرگرم رہی ہیں۔

البتہ جموں میں اُردو درس و تدریس کی معیاری کتابوں کا ہمیشہ بحران رہا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہاں کے کتب فروش اُردو کی بہت کم کتابیں فروخت کرتے ہیں۔ اس کی خاص وجہ ایک تو یہ ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں اُردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد کم ہے۔ دوسرے یہ کہ اُردو کتابیں قیمتیں زیادہ ہونے کے باعث اکثر فروخت بھی نہیں ہوتیں۔ اُردو اکادمیوں سے شائع ہونے والی کتابیں وہ فروخت نہیں کرتے کیونکہ انھیں اس میں مالی فائدہ بہت کم نظر آتا ہے۔

اُردو کی ترقی و ترویج کے لیے شعبہ اُردو جموں یونی ورسٹی، جموں بھی ایک اہم رول ادا کر رہا ہے۔ شعبہ اُردو کے زیر اہتمام سیمینار، کانفرنسیں اور ریفریشر کورس منعقد کیے جاتے رہے ہیں۔ جموں میں اُردو کے فروغ کے لیے غیر مقامی اُردو عالموں اور اہل زبان کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ادیب و شاعر جو ریاست میں ملازمت کی غرض سے آئے اور انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اور قیمتی وقت اُردو کی خدمت میں صرف کیا۔ ان کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ اُن میں جموں یونیورسٹی، جموں سے تعلق رکھنے والے پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر جگن ناتھ آزاد،

اُردو کی ترقی و ترویج کے لیے شعبہ اُردو جموں یونی ورسٹی، جموں بھی ایک اہم رول ادا کر رہا ہے۔ شعبہ اُردو کے زیرِ اہتمام سیمینار، کانفرنسیں اور ریفریشر کورس منعقد کیے جاتے رہے ہیں۔ جموں میں اُردو کے فروغ کے لیے غیر مقامی اُردو عالموں اور اہلِ زبان کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

پروفیسر شیام لال کالڑا، پروفیسر منظر اعظمی، پروفیسر خورشید مراصدیقی اور پروفیسر ریاض احمد کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ یہاں کے مقامی اساتذہ میں پروفیسر ظہور الدین، پروفیسر نصرت چودھری، پروفیسر سکھ چین سنگھ، پروفیسر وجے دیو سنگھ، پروفیسر ضیا الدین، پروفیسر شہاب عنایت ملک، پروفیسر چمن لال بھگت اور پروفیسر عبدالرشید منہاس وغیرہ ہیں۔ اگرچہ ان میں سے اکثر و بیشتر ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں مگر اب بھی تحقیقی وتنقیدی کاموں میں مصروف ہیں۔

ریاستی کلچرل اکادمی، جموں، انجمن فروغ اُردو، انجمن ترقی اُردو اور دیگر اداروں نے بھی تحقیق وتنقید کے شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ کلچرل اکادمی کا 'شیرازہ' اور 'ہمارا ادب'، محکمہ انفارمیشن کا 'تعمیر'، فروغ اُردو جموں، تسکین جموں، کشمیر عظمی جموں، سندیش جموں، دھنک راجوری، چوگان کشتواڑ، شاہین اور سراج بھدرواہ وغیرہ وہ مشہور رسائل و اخبارات ہیں جنھوں نے اُردو کی ترقی میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

ریڈیو کشمیر، جموں بھی اُردو کی ترقی میں اچھا کردار ادا کر رہا ہے۔ یہاں کے مقامی ادیبوں اور شاعروں کو ریڈیو پروگراموں میں مدعو کیا جاتا ہے۔ ریڈیو اسٹیشن جموں سے ایک زمانے میں 'آبشار' کے نام سے ایک ادبی پروگرام ہوا کرتا تھا جواب 'خرمن' کے نام سے نشر ہو رہا ہے اور اب 'آبشار' ٹی وی پر دکھایا جارہا ہے۔ اس پروگرام میں ملک کے نامور شعرا کی شخصیت اور کارناموں کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس خطے کے طلبہ اور اُردو شعر و ادب کا شوق رکھنے والوں کے لیے یہ 25 منٹ کا پروگرام بہت معلومات افزا اور دل چسپ ہوتا ہے۔ اس پروگرام کی تحقیق، ترتیب وتشکیل و پیش کش ایک عرصہ تک اردو کے نامور محقق و شاعر اور شعبہ اردو کے استاد پروفیسر ایس ایل کالڑا، عابد پشاوری صاحب انجام دیتے رہے، ان کے انتقال کے بعد یہ خدمت مختلف لوگوں سے لی جاتی رہی اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ ریڈیو اسٹیشن جموں، خطہ جموں کی نمائندگی کرتا ہے۔ کافی دنوں تک یہاں سے اُردو میں خبریں نشر نہیں کی جاتی تھیں لیکن اب اُردو ادب اور ہندی کے ملے جلے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

اس وقت اردو زبان کو کئی چیلنجز درپیش ہیں، لیکن مستقبل کے حوالے سے کئی امید افزا امکانات بھی موجود ہیں:

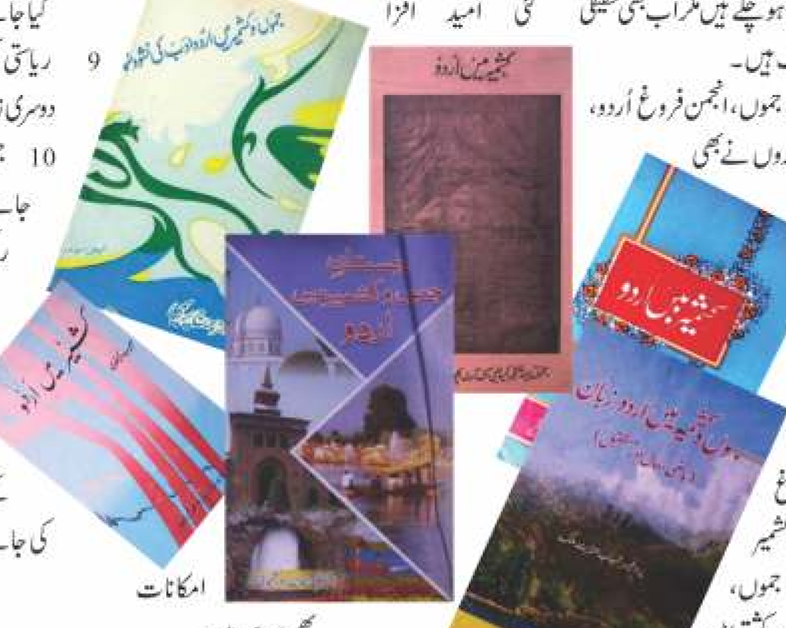

1 حکومت ہند کی نئی قومی تعلیمی پالیسی (NEP 2020) بچوں کو مادری زبانوں میں تعلیم دینے پر زور دیتی ہے۔ اس سے اردو کو ابتدائی سطح پر بطور تدریسی زبان دوبارہ رائج کیا جا سکتا ہے۔

2 اردو اب صرف قلم و کاغذ تک محدود نہیں رہی۔ یوٹیوب، فیس بک، واٹس ایپ، بلاگنگ اور پوڈ کاسٹ کے ذریعے اردو اپنی نئی شکل میں ابھر رہی ہے۔

3 جموں کے کئی نوجوان اردو شاعری، کہانی نویسی اور تحقیق میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ اگر ان کی مناسب رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی جائے تو یہ مستقبل میں بڑے ادیب اور دانشور بن سکتے ہیں۔

4 ٹیکنالوجی کا استعمال کرکے اگر اردو میں ای لرننگ، ای کتابوں، اور آن لائن کلاسز کو رواج دیا جائے تو یہ زبان جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہوسکتی ہے۔

5 اردو زبان کو سرکاری دفاتر میں فعال طور پر رائج کیا جائے۔

6 اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری پر خاص توجہ دی جائے۔

7 اردو ادب کے فروغ کے لیے ادبی اداروں کو مالی واخلاقی مدد فراہم کی جائے۔

8 نئی نسل کو اردو کی طرف مائل کرنے کے لیے دلچسپ، جدید اور ٹیکنالوجی سے لیس نصاب تیار کیا جائے۔

9 ریاستی سطح کے تمام مقابلہ جاتی امتحانوں میں دوسری زبانوں کی طرح اُردو بھی شامل کی جائے۔

10 جموں میں اُردو اکادمی کا قیام عمل میں لایا جائے تاکہ اس خطے میں بھی اردو سے شغف رکھنے والوں اور اردو زبان کو ترقی و ترویج کے مواقع میسر ہوں۔

11 اُردو کتب کی فروخت رعایتی نرخوں پر کی جائے اور ان کی طباعت معیاری ہو۔ اشاعت کے سلسلے میں مصنفین کو مالی معاونت فراہم کی جائے تاکہ اردو ادب کی ترویج ممکن ہوسکے۔

■

Dr. Iqbal Ahmed
Lecturer Dept of Urdu
Govt. Degree College, Darhal,
Rajori- 185135 (J & K)
Mob.: 8409242211
ahmadnesar2211@gmail.com

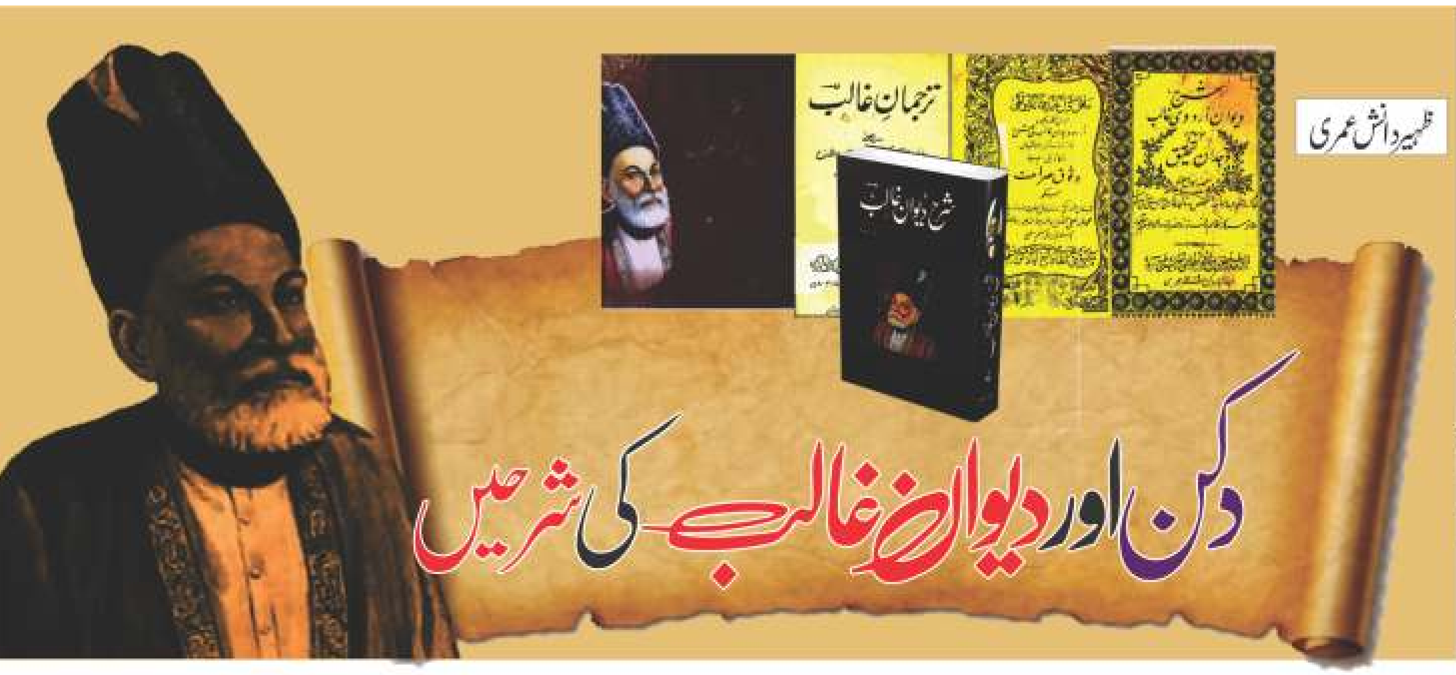

دکن اور دیوانِ غالب کی شرحیں

ظہیر دانش عمری

مرزا اسداللہ خاں غالب ایک ایسے شاعر کا نام ہے جن کا نام اور کلام ہر زمانے میں غالب رہا ہے، کیا شمال اور کیا جنوب ان کی شاعری اور شخصیت پر ہر دو مقام پر کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے، دکن کے حوالے سے عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں غالب پر کام نہ ہونے کے برابر ہے لیکن جب اس حوالے سے تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ دکن میں غالب شناسی کی ایک مضبوط روایت رہی ہے، غالب کے حوالے سے ان کی مختلف جہتوں پر یہاں کام ہوا ہے، یہاں دیوان غالب کی شرحیں لکھی گئیں، ان کی شخصیت پر رسائل وجرائد کے خصوصی شمارے شائع کیے گئے، ان کی شخصیت پر لکھی گئی دیگر کتابوں کے تراجم اردو میں کیے گئے، یہاں غالب کے چار شاگردوں حبیب اللہ ذکا نلوری، منشی میاں داد خان سیاح، مرزا قربان علی بیگ سالک، غلام حسین قدر بلگرامی کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

جہاں تک دیوان غالب کی شرحوں کا تعلق ہے تو دکن سے درج ذیل پانچ کتابیں شائع ہوئی ہیں:

1 وثوق صراحت از عبدالعلی والہ حیدرآبادی مدراسی
2 شرح دیوان غالب از سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی
3 وجدان تحقیق از عبدالواجد
4 شرح دیوان غالب از ضامن کنتوری
5 ترجمان غالب از شہاب الدین مصطفیٰ

ان میں سے سب سے پہلی وثوق صراحت نامی شرح 1895 میں حضرت عبدالعلی والہ حیدرآبادی کی تصنیف ان کے فرزند عبدالواجد نے شائع کروائی، جو خود غالب اور ان کی شاعری کے قدردان تھے، طویل عرصے تک انھیں اور ان کے فرزند کو دیوان غالب پڑھانے کا تجربہ حاصل رہا ہے۔

وثوق صراحت میں غالب کے 1132 اشعار کی شرح ہے، تشریح بہت مختصر ہے، کہیں مشکل الفاظ کے معنی پیش کیے گئے ہیں تو کہیں مختصر اشارہ کر دیا گیا ہے، کہیں کسی تلمیح کی وضاحت کر دی ہے تو کہیں شعر کا معنی بالکل نہیں دیا گیا ہے، شاید ان کے لحاظ سے جو جو شعر بہت آسان ہیں وہاں شعر کا معنی پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

اس کی وجہ عبدالواجد یوں تحریر کرتے ہیں کہ:

''اگرچہ اس شرح پر نظر ثانی نہیں کی گئی لیکن نظر اول ہی میں جو کچھ لکھا ہے نہایت غنیمت اور قابل قدر ہے، کیونکہ ایک فرد کامل، سخن گو، سخندان، سخن فہم اور مسلم الثبوت استاد کی تصنیف ہے، اختصار کے ساتھ دقائق کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ مقصود قابل فوت نہ ہو، کہیں فوراً کہیں کچھ خوض وتامل سے طالب علم کے ذہن نشین ہو جائے، حضرت مرحوم کی یہ عادت تھی کہ شرح کو بلا ضرورت ہرگز طول نہیں دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ شرح مختصر مفید ہونی چاہیے۔''

(وثوق صراحت، ص:2، مقدمہ از عبدالواجد، عبدالعلی والہ حیدرآبادی، 1895، مطبع: مطبع نامی فخر نظامی حیدرآباد)

اس کے علاوہ اس شرح میں کہیں کہیں اساتذہ کے اشعار اور ضرب الامثال بھی پیش کیے گئے ہیں۔

اس میں بطور تقریظ مولوی عبدالحی مددگار پیمایش و بندوبست علاقہ سرکار عالی کی منظوم تحریر شامل ہے جس میں وہ مولوی عبدالواجد کو اپنا استاد بتاتے ہیں نیز ان کی جادو بیانی وشیریں سخنی کا اعتراف کرتے ہیں، شاعری نیز زبان وبیان پر ان کی قدرت کی بہت تعریف کرتے ہیں۔

غالب کے پہلے شعر۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کی شرح میں صرف ایک لفظ پیرہن کاغذی کی تشریح لکھتے ہیں کہ فریادیوں کا لباس جو قدیم میں دستور تھا، یہ کنایہ ہے عجز و بے چارگی سے۔

اسی طرح دوسرے شعر میں صرف شوق کا معنی، پانچویں اور چھٹے شعر میں شعر کے معنی پیش کیے بغیر ایسے ہی گزر جاتے ہیں۔ ان کی فہم کے مطابق جو اشعار نہایت آسان اور تشریح طلب نہیں ہیں، ان کی تشریح کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

اسی شرح کے اخیر میں مولوی عبدالعلی والہ حیدرآبادی مدراسی کے فرزند مولوی عبدالواجد یوں تنقید کرتے ہیں کہ:

''اس شرح میں نہ اشعار کے معنی ہیں اور نہ لفظوں کے، اور نہ دقایق و نکات شاعری کا بیان ہے بلکہ دو دو لفظوں کے معنی لکھے ہیں جن کا عدم وجود مساوی ہے، لہٰذا یہ شرح غیر مفید و بے کار ہے فقط واجد''

(ایضاً، ص193)

دوسری شرح شرح دیوان غالب ہے جسے نظم طباطبائی نے لکھا ہے، یہ شرح پہلی بار 1900 میں شائع ہوئی، غالب پر لکھی گئی شروحات میں اس شرح کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ طباطبائی عربی فارسی کے بہت بڑے عالم تھے، نظام کالج میں پروفیسر رہے، غالب کی شاعری پر ان کی بہت گہری نظر تھی، انھوں نے بہت ہی دقت نظر کے ساتھ اس شرح کو تحریر کیا ہے۔ ایک شعر کے جتنے معنی ممکن ہو سکتے ہیں انھوں نے بیان کر دئے ہیں، ایک شعر کی تشریح یوں بیان کرتے ہیں:

''جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

دم کے معنی سانس اور باڑھ اور یہاں دونوں معنی تعلق ومناسبت رکھتے ہیں کہ سینۂ شمشیر کہا ہے۔ مطلب یہ کہ میرے اشتیاق قتل میں ایسا جذب وکشش ہے کہ تلوار کے سینہ سے اس کا دم باہر کھنچ آیا''

(شرح دیوان غالب، نظم طباطبائی، ص: 2، مطبع: انوار المطابع لکھنؤ، اشاعت 1900)

تیسری شرح **وجدان تحقیق** از واجد حیدرآبادی فرزند عبدالعلی والہ حیدرآبادی 1902 میں شائع ہوئی، یہ شرح حضرت والہ حیدرآبادی کے نکات کی تشریح پر مبنی ہے، اگرچہ یہ مکمل شرح نہیں ہے اس میں صرف ردیف الف سے ختم ہونے والے اشعار کی تشریح پیش کی گئی ہے۔ اس شرح کے دو نام ہیں ایک تو وجدان تحقیق، دوسرا توضیح اشارات والہ۔

اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انھوں نے میر محبوب علی خان کی مدح میں ایک قصیدہ کہا اور اسے اس شرح کی زینت بنایا، جیسا کہ اس دور میں رواج تھا، اس کے بعد وثوق صراحت پر منظوم ومنثور تبصرے جو اخبار جریدۂ روزگار مدراس، رسالہ معارف پانی پت، گلدستۂ خدنگ نظر لکھنؤ گلدستہ معیار لکھنؤ میں شائع ہوئے۔

بعدازاں وجدان تحقیق پر تاریخی قطعات ہیں، پھر اصل شرح شروع ہوتی ہے، ایک ایک شعر کی تشریح انھوں نے دو دو تین تین صفحات پر پھیلادی ہے اور بہت سی ادھر اُدھر کی باتیں طوالت کے شوق میں راہ پاگئی ہیں، اپنی بات کو مدلل کرنے کے لیے عرفی شیرازی، صائب تبریزی، ابن نصوص شیرازی وغیرہ کے کلام کو جزو کتاب بنایا گیا ہے۔

دیوان غالب کے پہلے شعر کی تشریح کا کچھ حصہ پیش کیا جاتا ہے:

''چونکہ تصویر اکثر کاغذ پر ہوتی ہے لہٰذا تصویر کو کاغذی پیرہن یعنی پوشاک کاغذی دارندہ قرار دیا ہے، اس شعر کے اتنے معنی ہوسکتے ہیں کہ تصویر زبان حال سے تظلم وفریاد کرتی ہے مگر ان معنوں میں کوئی لطف اور نزاکت نہیں کیونکہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور تاویل وتعبیر میں بہت کچھ گنجائش ہے چنانچہ بعض لوگ اس شعر کو تصوف میں لیے جاتے ہیں اور صوفیانہ معنی بیان کرتے ہیں مگر خود ان کو یقین نہیں کہ مقصود قائل یہی ہو''

(وجدان تحقیق، عبدالواجد، اشاعت 1902، مطبع فیض منبع فخر نظامی، حیدرآباد، ص 3)

چوتھی شرح ترجمان غالب ہے جسے جناب سید مصطفیٰ نے تحریر کیا ہے۔ یہ مولانا وحید الدین سلیم کے ممتاز شاگردوں میں تھے، اس لیے انھوں نے اپنی اس شرح کو وحید الدین سلیم، سید اشرف شمسی اور مولانا عبدالحمید خان بگش کے نام معنون کیا ہے، ان کی شاگردی میں رہنے کا شرف ان کو حاصل رہا ہے۔

دیگر شروحات سے انھوں نے بہت کم استفادہ کیا ہے اور انھوں نے خود جو نتائج اخذ کیے ہیں ان کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لکھنے والے کی شخصیت کا عکس اگر اس کی تحریر پر نہ پڑے تو پھر وہ تحریر کیا؟

اسی کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے:

''حضرت بے خود کی پوری شرح دیکھی لیکن کوشش یہی رہی کہ اپنی ذاتی کاوش اور فکر کے نتائج سپرد قلم کیے جائیں، البتہ یادگار غالب میں مولانا حالی نے اور اردوئے معلی وعود ہندی میں خود شاعر نے جن اشعار کی تشریح فرمائی ہے وہ جوں کی توں ان کتابوں کے حوالہ سے نقل کردی گئی ہے''

(ترجمان غالب، شہاب الدین مصطفیٰ، ص 2، مطبع: مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد، اشاعت 1956)

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

اس شعر کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ

''کاو: کاوش، خلش، تکلیف

فرماتے ہیں شب تنہائی ہمارے لیے غم کا ایک پہاڑ ہے جو کاٹے نہیں کٹتا رات تمام کرب وبے چینی، کاوش وخلش میں گزرتی ہے شب ہجر کا صبح کرنا اتنا ہی مشکل اور جانکاہ ہے کتنا کہ فرہاد کے لیے کوہ بے ستون کو کاٹ کر جوئے شیر لانا کاوش طلب تھا'' (ایضاً، ص 2)

سب سے پہلے شعر میں جو مشکل الفاظ ہیں ان کے معنی بیان کردیتے ہیں بعد ازاں شعر کا مطلب آسان لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تشریح نہ بہت مختصر ہے اور نہ بہت طویل بلکہ متوسط طریقے سے انھوں نے اپنے خیالات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

پانچویں شرح شرح ضامن کنتوری ہے جو 1935 کے آس پاس لکھی گئی لیکن 2012 میں شائع ہوئی۔

ضامن کنتوری کے تعارف میں صرف ایک بات کہنی کافی ہوگی کہ مشہور زمانہ شاعر حضرت امجد حیدرآبادی آپ کے شاگردوں میں سے تھے، ان کی تشریح کافی بسیط ہے۔ اشعار کی تشریح کے سلسلے میں انھوں نے نہایت شرح وبسط سے کام لیا ہے، محترمہ اشرف رفیع اس کتاب کے مقدمے میں ان کی تشریح کے انداز پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

''فارسی میں شرح نویسی کی جو طاقتور روایت کارفرما رہ چکی ہے وہ کثیر الجہات تھی، یعنی شرح لکھنے والا شعر کا مفہوم لکھنے کے ساتھ اس شعر سے متعلق ضروری نکات بھی لکھتا تھا یہی انداز اس شرح کا بھی ہے، اشعار کی شرح کے ذیل میں زبان وبیان محاورۂ دہلی ولکھنو بلاغت وفصاحت، عروض وقافیہ وفلسفہ ومنطق کے بہت سے مسائل بکھرے ہوئے ہیں''

(شرح دیوان غالب از ضامن کنتوری، ص: 17، مرتبہ اشرف رفیع)

ضیاء الدین احمد شکیب نے جب 'غالب اور حیدرآباد' لکھی تب یہ شرح شائع نہیں ہوئی تھی اس لیے اس کی اہمیت اور اس کی اشاعت کی طرف انھوں نے توجہ مبذول کروائی۔

جگہ جگہ انھوں نے حافظ خسرو کے کلام سے استدلال بھی کیا ہے۔

''تغافل بدگمانی بلکہ میری سخت جانی ہے ناز کو
نگاہ بے حجاب ناز کو بیم گزند آیا

اس شعر کو نظم کرنے میں تسامح ہوگیا۔ مرزا یہ کہنا چاہتا تھا

تغافل بدگمانی بلکہ نگاہ بے حجاب کو
میری سخت جانی بیم گزند نظر آیا

اس کو وزن میں لانے کی خاطر کیا یہ تغافل وبدگمانی کو سخت جانی پر عطف کردیا جس سے یہ مطلب نکلا کہ میرے تغافل میری بدگمانی اور میری سخت جانی کو دیکھ کر نگاہ ناز ڈر گئی۔ اعتراض یہ پیدا ہوا کہ تغافل وبدگمانی انداز معشوقانہ ہیں نہ کہ شیوۂ عشاق اس لیے شعر معناً غلط ہے۔'' (شرح دیوان غالب، ضامن کنتوری، ص 26)

ان شروحات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکن میں دیوان غالب کی شرحیں اگرچہ مختصر لکھی گئیں لیکن معیار کے لحاظ سے یہ شرحیں اپنی ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔

■

Dr. Zaheer Danish Umri
Editor Qtly 'Irteaash'
Kadpa (Odisha)
s.zaheerdanish@gmail.com

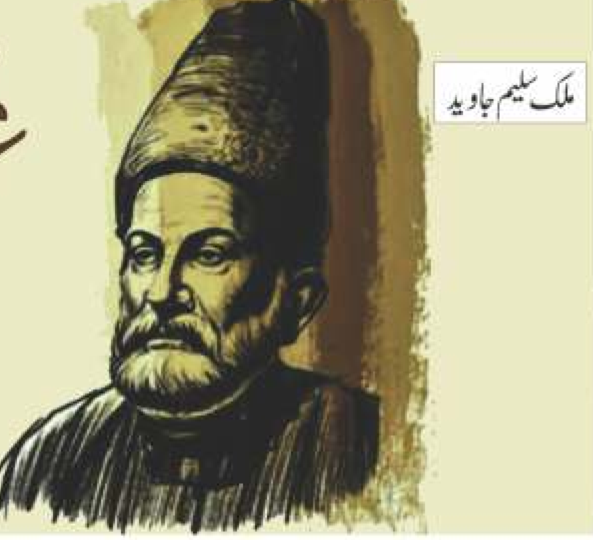

غالب کی فارسی شاعری

ملک سلیم جاوید

مرزا اسداللہ خاں غالب نہ صرف اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے بلکہ وہ اس دور کی خاص شاعرانہ روایات کے بہترین ترجمان بھی ہیں۔ غالب نے شعرا کی بڑی خصوصیت معاملہ بندی کو وسعت اور بلندی دے کر انسانی فطرت کی عمیق گہرائیوں کا مطالعہ بنا دیا اور انسانی زندگی اور حسن وعشق کی نسبت وہ نئے نئے نکتے اور دلآویز باتیں بیان کیں کہ ان کا کلام شعروادب کا سدابہار باغ بھی ہے اور ضیافت غور وفکر کا سامان بھی۔

غالب کی فارسی تصانیف حسب ذیل ہیں:

دیوان غالب فارسی، دستنبو، پنج آہنگ، سبدچین، مہرنیم روز، تیغ تیز، لطائف غیبی، درفش کاویانی، سرمۂ بینش، درد و داغ، چراغ دیر، رنگ و بو، باد مخالف، ابر گہربار، باغ دودر

غالب کا فارسی دیوان بہت ضخیم اور دس ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے۔ مختلف اسکالرس نے ان کے دیوان کو کئی دفعہ شائع کروایا ہے۔

غالب ایک ذہین اور صاحب فکر انسان تھے، ان کے کلام میں عشق و محبت کے مشاہدات واحساسات کے علاوہ حقائق حیات سے بڑی گہری بصیرت ملتی ہے۔ بیسیوں ایسے اشعار ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب صرف شاعر ہی نہیں بلکہ حکیمانہ بصیرت بھی رکھتے تھے۔ غالب کے اشعار میں جذبے کی حرارت کے ساتھ ساتھ فکر کی گہرائی، مشاہدات کی تازگی اور انفرادیت ہر جگہ نمایاں ہے۔ یہی خوبیاں ان کی شاعری میں عظمت پیدا کرنے کا باعث ہیں۔ غالب کو فارسی زبان پر غیر معمولی عبور حاصل تھا اور کیوں نہ ہو انھوں نے تو فارسی زبان وادب کی تعلیم اہل زبان سے حاصل کی تھی۔ اس حیثیت سے غالب اپنے معاصر شعرائے فارسی میں ممتاز اور منفرد ہیں۔ ان کی نظم ونثر دونوں میں بالکل ایرانی طرز کے محاورات، ترکیبات، ضرب الامثال، افکارونظریات نظر آتے ہیں۔ امیر خسرو کا طرز بیان سبک ہندی تھا برخلاف اس کے غالب کا انداز بیان خالص ایرانی ہے اور کیوں نہ ہو کسی نے بالکل درست کہا ہے کہ ہندوستان میں فارسی شاعری ترک لاچین نے شروع کی اور ترک ایبک پر ختم ہوئی۔ یہاں ترک لاچین سے مراد امیر خسرو اور ترک ایبک سے اشارہ غالب کی طرف ہے۔

غالب نے فارسی تراکیب کی مدد سے نہایت لطیف جذبات واحساسات کی بڑی کامیابی کے ساتھ ترجمانی کی ہے۔ غالب کے ابتدائی کلام میں مشکل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب بڑی کثرت سے ملتی ہیں۔ غالب نے اپنے کلام میں حسن وعشق کے جذبات بھی بیان کیے ہیں اور فلسفہ وفکر کی گہرائی اور گیرائی بھی ان کے کلام میں موجود ہے۔ غزل کی شاعری میں غالب پہلا مرد عاشق نہیں بلکہ اس سے پہلے بھی کئی شاعر اپنے اپنے محبوبوں کے مخصوص تصور سے اپنی اپنی مردانگی کے اظہار کی کوشش کر چکے ہیں۔ اردو میں قلی قطب شاہ سے لے کر آج کے غزل گو شعرا تک اور فارسی میں رودکی سے لے کر غالب تک کے غزل گو شعرا کی اکثریت کے روایتی عشقیہ مضامین باندھتے رہنے کے باوجود بہت سے شعرا میں نفسیاتی رجحانات، ذاتی زندگی، جذباتی حادثات اور جنسی میلانات سے جنم لینے والی مردانہ انفرادیت کی بنا پر واضح طور سے امتیاز بھی کیا جاسکتا ہے۔ عنصری، سنائی، عطار، رومی، اوحدی، شیخ سعدی، حافظ، خواجو، شفائی، شرف قزوینی، وحشی یزدی، محتشم کاشی، سحابی، نظیری، عرفی، ظہوری، کلیم، غنی، برہمن، خسرو، حسن اور غالب تک سیکڑوں شاعر جوق درجوق غزل یعنی عشقیہ شاعری کے میدان میں اترے۔ اسی طرح اردو میں بھی ولی، میر، جرأت، مومن، داغ، حسرت اور فراق وغیرہ کے نام سے ہی ہمارے سامنے ان کے عشق کا ایک مخصوص تصور اور محبوب کی ایک واضح تصویر ابھر آتی ہے، بلکہ ژرف نگاہی برتنے پر اس سے ہم شاعر کی شاعرانہ انفرادیت کی تفہیم کے ساتھ ساتھ بعض شخصی اور نفسی میلانات کا کھوج بھی لگا سکتے ہیں۔ اسی سلسلے میں ایک اور نکتہ بھی روشن ہوتا ہے کہ کچھ شعرا نے عشق، اس کی مختلف النوع کیفیات اور ان کے زیراثر دل کی رنگ بدلتی دنیا کی عکاسی پر زیادہ توجہ دی ہے۔ جب کہ بعض محبوب کو مرکز بنا کر اس کے گرد جذبات، احساسات، خیالات اور تصورات کا ایک طلسم خانہ تعمیر کرتے ہیں۔ قلی قطب شاہ، ولی اور میر اول الذکر اور بقیہ شاعر موخرالذکر گروہ سے وابستہ سمجھے جاتے ہیں۔ بظاہر عشق اور محبوب ایک ہی سکہ کے دورخ ہیں بلکہ بعض تو مترادف بھی معلوم ہوتے ہوں گے لیکن ان میں نازک سا فرق بھی ملتا ہے مگر ہم کسی طور سے بھی عشق یا محبوب سے متعلق مضامین کی خانہ بندی نہیں کرسکتے۔

ان نمائندہ شعرا میں غالب کا نام شعوری طور سے نہیں لیا گیا کیونکہ غالب نے عشق اور محبوب دونوں ہی کے بارے میں اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز سے تو سوچا مگر جس چیز سے اس کی عشقیہ شاعری انفرادیت حاصل کرتی ہے وہ اس کی ایک اور ہی معنویت ہے یعنی محبوب سے تعلقات کا بیان۔

غالب سے پہلے دبستان لکھنؤ کے شعرا نے تصوف کے زیراثر جنم لینے والے عشق کے مجرد تصور کوختم کرکے اسے زندگی کی عام سطح پر لاکر جنسی جذبات اور حیاتیاتی تہیجات سے ہم آہنگ کرکے اگرچہ غزل کی روایت میں ایک نیا تجربہ کیا، مگر طوائفیت اور معاشرہ کی انحطاط پذیری نے انھیں ابتذال، سستی لذتیت اور سوقیانہ پن

کے مراحل سے گذار کر ریختی کے ولدل میں پھنسا دیا۔

غالب غزل کی روایت سے بغاوت نہ کر سکتا تھا کیونکہ دیگر شعرا کے مانند اس کے شعری احساس کی اساس غزل اور اس کی روایت پر ہی مبنی تھی۔ ذاتی اپج اور انفرادیت کے باوجود وہ اظہار کے اس سانچے میں ڈھلنے والے روایتی مضامین ادا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ محبوب کے سراپا یا اس کے حسن سے پیدا شدہ کیفیات کے ابلاغ میں بالعموم انہی تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا ہے جن میں غزل کے مزاج سے ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

غالب سیاسی انحطاط اور قدروں کے تغیر سے جنم لینے والے عبوری دور کا مرد تھا۔ ایک حساس فن کار کی مانند اس کی شاعری میں ماحول اور فرد کے تصادم سے جنم لینے والی کئی کیفیات ملتی ہیں۔ اس کی شاعری کا اصل مزاج تو فلسفیانہ ہے جس سے اس نے اپنے دور اور اس دور کے انسان کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن یہ فلسفی فن کا مرد بھی تھا اور اس کے ذہن میں وہ تمام پیچیدہ نفسی کیفیات ملتی ہیں جو جنسی ترغیب اور جنسی گریز کے درمیان ایک نقطۂ توازن کی صورت اختیار کر کے اس کی مردانہ انفرادیت اجاگر کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ محبوب اس کے لیے اہم سہی مگر داغ کی مانند اس کے اعصاب پر سوار بھی نہیں۔ غالب نے اپنی فکر، اسلوب اور جدت طرازی کے ذریعے اپنے بعد کے بہت سے شعرا کو بھی متاثر کیا ہے، جو اس کی عظمت کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ حکیمانہ افکار اور متصوفانہ خیالات کے ذریعے بھی غالب نے اپنے کلام میں وسعت اور تنوع پیدا کیا۔ ایرانی شاعری کو مدنظر رکھتے ہوئے غالب نے سعدی، جامی اور حافظ کی تقلید شروع کی اور عرفی، نظیری اور فیضی کا دقیق مطالعہ کیا، جس کی وجہ سے وہ ایک صاحب طرز شاعر بن گیا۔ غالب کی شاعری میں حافظ کی والہانہ رندی و سرمستی، نظامی کی زبان دانی اور واقعہ نگاری، سعدی کی رعنائی اور تغزل، عرفی کی غضب آلود نگاہ، آزاد خیالی وابج اور معنی آفرینی، بیدل کا فلسفہ، فیضی کا زور بیان اور ذہنی تشکک، صائب اور کلیم کی تمثیلات اور معاملہ بندی، نظیری کا سوز و گداز، تغزل اور حسن بیان سب نمایاں ہیں۔ فصاحت و بلاغت سے بھی غالب کے اشعار بھرپور ہیں۔ ساتھ ہی ان سب سے جو چیز غالب کو ممتاز کرتی ہے وہ ہے اس کی شوخی، ظرافت، بے تکلفی، بیباکی اور بلند خیالی جس میں حلاوت اور ملائمیت بھی ہے، درد و رقت بھی ہے، نشاط و طرب بھی اور جس کے اندر آلام و مصائب کے صدہا تیر و نشتر پنہاں ہیں۔

یہ اس کی شخصیت کا کمال تھا کہ بہت سی آفتوں کو سہنے اور ہولناک مناظر کو دیکھنے کے باوجود انہوں نے اپنی شوخی اور ظریفانہ حس کو برقرار رکھا۔ بالآخر انہوں نے جو رنگ اختیار کیا وہ شاعر کی اپنی شخصیت کا پرتو ہے۔ غالب ہندوستانی فارسی اور اردو ادب کے وہ تنہا خوش نصیب ادیب و شاعر ہیں جن کے بارے میں لکھنے کا سلسلہ ایک صدی سے زائد عرصے سے جاری ہے۔

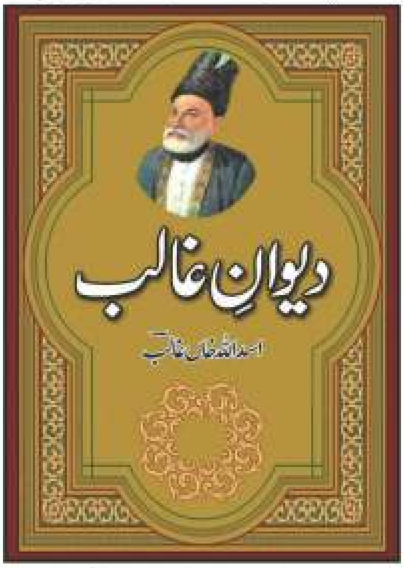

غالب نے اپنے کلام میں ہر صنف سخن جس میں مثنوی، قطعہ، قصیدہ، ترجیع بند، ترکیب بند، غزل، رباعی وغیرہ موجود ہیں، اپنے کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے مضامین میں مدح، ہجو، مذہب، آیت قرآنی، حدیث نبویؐ، تاریخی واقعات، اخلاقی اور اساطیری داستان، ضرب المثل، شاعری کی صنعتیں جن میں تشبیہ، کنایہ، استعارہ، ایہام، تلمیح اور تصوف، فلسفہ، اخلاق، رندی، سرمستی، عشق اور مناظر فطرت وغیرہ بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ غالب کی نثر بھی بہترین انشاپردازی کا نمونہ ہے۔ انھیں فارسی زبان والفاظ ومحاورات کی تحقیق بیان پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔

غالب کی شاعری میں طنز و مزاح کی چاشنی ملتی ہے وہ اپنے کلام میں اسلامی، ادبی و اساطیری تلمیحات کا بخوبی استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے سلیمان، نوح، اسماعیل، مسیحا، نمرود، زلیخا، کلیم، فرعون، حسین بن منصور حلاج، حضرت خضر، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور دیگر پیمبروں کا بارہا ذکر کیا ہے۔ داستانوں میں بیان کیے گئے افراد جیسے فرہاد، قیس، لیلیٰ، شیرین، ضحاک، فریدون، رستم، سہراب کے ساتھ آب حیوان، چشمۂ حیوان، جمل، فدک نقش خاتم، نیل نگین سلیمان وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

ان کے کارنامے تاریخ کے آئینہ دار ہیں اور ان کی شاعری سبک ہندی کا بہترین نمونہ ہے۔ قدرت نے غالب کی فکر میں جو ملکہ ودیعت کیا تھا وہ ظہور و نمود کے فطری جوش میں فوارے کی شکل میں موجود ہیں، ان کی فکری جلوہ آرائیاں اور بوقلمونیاں یکساں طور پر جاذب نظر ہیں۔ اپنی نظم و نثر میں غالب نے اپنے لیے ترک، سلجوقی، افراسیابی، مرزبان زادہ سمرقندی جیسے لفظوں کا استعمال بھی کیا ہے۔

ان کی غزل میں تخیل کی بلندی، معاملہ بندی، داخلی وخارجی مسائل، زندگی تازہ، توانائی وحرکت، استاد مسلم الثبوت، مرد کامل وغیرہ کا تصور پہلی بار سامنے آیا۔ ان کی شاعری میں ظہوری، نظیری اور عرفی کا تتبع نظر آتا ہے۔

ان کے کلام کو سمجھنے کے لیے ترکی اور اصفہانی اسلوب شاعری کو بھی سمجھنا ہوگا ورنہ تو ہمارے لیے ان کا کلام معمہ بنا رہے گا۔ غالب کے اشعار میں فلسفۂ حیات انسانی مضمر ہے۔ وہ ایک صوفی منش شاعر تھے۔ انھوں نے خدا کی شان میں بہت سے اشعار کہے ہیں۔ ان کی مثنوی 'مثنوی گوہر باز' اس بات کی ایک عمدہ مثال ہے۔ انھوں نے ہر صنف سخن میں بے حد خوب صورت اشعار میں اپنے مشاہدات، تجربات، احساسات اور جذبات کا اظہار کیا ہے۔

ماخذ

1 کلیات نظم فارسی: غالب، اسداللہ خاں، دہلی 1835

2 درفش کاویانی: غالب، دہلی، 1865

3 سبد چین از مالک رام: غالب، دہلی، 1949

4 غالب کا تفکر: احتشام حسین، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، 2012

5 کلیات غالب تحقیق وتدوین: از تقی عابدی، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، 2008

6 دیوان غالب: تصحیح محمد حسین حائری، چاپ کسری، ج اول، 1377۔

7 غالب کی تفہیم: صدیق الرحمن قدوائی، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، 2009

8 نقشہائے رنگ رنگ، انتخاب کلام غالب (فارسی) مرتبہ عطا کاکوی، لیبل لیتھو پریس، پٹنہ، جون 1969۔

■

Malik Saleem Javed
Associate Professor, Dept of Persian
Zakir Husain, Delhi College
New Delhi- 110002
Mob:9811897218
msjavedzhc@gmail.com

عبدالرزاق زیادی

غالب کی شاعری اور تمنا کا دوسرا قدم

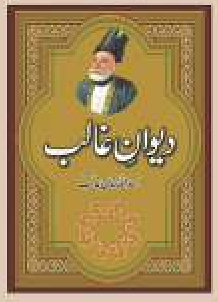

مرزا اسداللہ خاں غالب (1869-1797) اردو شاعری کا وہ تابناک اور درخشاں ستارہ ہے جس نے اپنی تابانیوں سے نہ صرف انیسویں صدی کے شعری منظرنامے کو روشن رکھا بلکہ بعد کے ادوار میں بھی اپنی روشنی لٹاتا رہا۔ اردو شاعری میں بھلے ہی میر کو تقدم حاصل ہے، لیکن آج بھی استادی کا شرف صرف غالب ہی کو حاصل ہے۔ غالب کی استاذی، فکر وفن کا کمال اور عظمت کا یہ اعتراف ہی ہے کہ اب تک ان پر جتنا اور جتنے زاویوں سے لکھا جا چکا ہے اتنا شاید کسی اور اردو شاعر پر لکھا گیا ہو۔ لیکن غالب کی استاذی اور عظمت کا راز محض اس امر میں پوشیدہ نہیں کہ وہ ایک شاعر کے ساتھ ساتھ ایک نثر نگار بھی تھے، اس بات پر بھی نہیں کہ وہ ایک فلسفی شاعر تھے، اس وجہ سے بھی نہیں کہ انھوں نے اپنی شاعری میں بڑی مشکل پسندی سے کام لیا ہے، بلکہ ان سب کے برخلاف اس کی بنیاد ایسی باتوں پر ہے جن کی تلاش وجستجو اور تعبیر وتشریح میں آج تک ہزار صفحات سیاہ کیے جا چکے ہیں اور بقول محمد حسن 'غالب ایک ایسا تاج محل ہے جس کے گرد تنقید وتشریح کا جنگل اُگ آیا ہے۔ اس جنگل میں محض کوڑا کرکٹ، کانٹے اور زقوم ہی نہیں، صندل کے قطعے اور گلاب کے مہکتے تختے بھی ہیں، جن سے دامن کشاں گذر جانا آسان نہیں۔ تنقید وتشریح ہی کا نہیں نقادوں اور محققوں کا بھی ایک جنگل غالب اور نثر ونظم غالب کے تاج محل کے ارد گرد آباد ہے'۔ بلاشبہ غالب کا یہ تاج محل ان کی شاعری کے ان فکری وفنی عناصر سے ہی تشکیل پاتا ہے جو انھیں دنیائے شاعری میں ایک عجوبہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

غالب کی شاعری کوئی عامیانہ شاعری یا محض تک بندی وقافیہ پیمائی نہیں بلکہ اس میں وہ شاعرانہ اختصاص وامتیاز بھی موجود ہے جو اسے عظمت کی اس بلندی پر فائز کر دیتا ہے۔ مضمون آفرینی، خیال بندی، تمثیل نگاری، نزاکت خیال اور طرفگی بیان جہاں غالب کی شاعری کی انفرادیت تسلیم کی جاتی ہے وہیں ان کی شاعری اپنی تشبیہات واستعارات، نکتہ رسی ونکتہ سازی، بذلہ سنجی و ظرافت اور ندرت خیال و جدت خیال کی بدولت نہ صرف قارئین کو قدم قدم پر چونکاتی اور انھیں ایک سے زائد بار پڑھنے پر مجبور کرتی ہے بلکہ ہمیشہ ہمیش کے لیے انھیں اپنے دائرہ اثر اور سحر آفرینی کا حصہ بنا لیتی ہے۔ غالب کی یہی وہ سحر انگیزی اور اثر آفرینی ہے کہ جہاں وہ عظمت کی بلندیوں پر فائز ہو جاتے ہیں وہیں وہ ہر خاص و عام کے لیے ایک محبوب شاعر بن جاتے ہیں اور ان کا دیوان نسبتاً سب سے زیادہ شائع ہونے والی کتاب قرار دی جاتی ہے۔ علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

''غالب اردو کا محبوب ترین شاعر ہے جسے اقبال نے گوئٹے کا ہم نوا قرار دیا ہے۔ گذشتہ سو سال میں دیوان غالب کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں اور بے شمار مضامین لکھے گئے ہیں۔ نقاد اور پڑھنے والے نے اپنے مذاق اور مزاج کے لیے غالب کے اشعار میں گنجائش دیکھی۔ کبھی خراج تحسین نے عقیدت کی شکل اختیار کی، کبھی سنجیدہ تجزیے کی، اور کبھی اس مبالغے کی جو آرٹ کا حسین زیور ہے۔''[1]

عام طور پر جب بھی غالب کی شاعری اور اس کے تعین قدر کی بات ہوتی ہے تو اس میں غالب کی شخصیت، خانگی زندگی اور اس کے نشیب وفراز کے ساتھ ساتھ اس کے فکر وفن کو بھی ضروری طور پر موضوع بنایا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ تو غالب کی شاعری کی کوئی تعبیر سامنے آسکتی ہے اور نہ ہی غالب کی شاعرانہ عظمت کا کوئی سراغ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ جہاں تک غالب کی فکر کا تعلق ہے تو اسے ظ۔ انصاری کے الفاظ میں اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ 'غالب محض ایک فکری شاعر نہیں، زندگی کے مختلف پیچ در پیچ گوار اور ناگوار مظاہر میں وہ ایک زندہ وتوانا وجود کا مردانہ برتاؤ، ایک سوچا سمجھا Dialectical Approach اور اپنے ارد گرد کے ساتھ ایک نپا تلا Attitude بھی ہے۔ یہ برتاؤ یا اپروچ حیرت وحسرت کی کسک رکھنے کے باوجود ماضی کی نوحہ خوانی اور حال پر چاک دامانی سے نہ شروع ہوتا ہے، نہ اس پر تمام ہوتا ہے۔ اس کے ہاں تاسف اور انفعال کی کیفیت طاری نہیں، بلکہ شگفتگی اور سرشاری کی، زندگی کے آلام سے رستہ کشی، فعال زندگی بسر کرنے کی اور رنج وراحت کی ہر موج کے منتھن سے امرت کی بوندیں ٹپکا لینے کی ہمت پائی جاتی ہے۔'[2]

گویا غالب کی فکر عام شعری روایت کے حامل شعرا کے افکار سے مختلف بلکہ کئی اعتبار سے متصادم و متضاد بھی ہے۔ لیکن بغور دیکھیں تو یہی تضاد وتخالف غالب کی فکر کا امتیاز بھی ہے۔ اس میں بھی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں ہمیشہ نشاط کا پہلو غالب رہتا ہے، غالب کے یہاں غم حیات نشاط حیات میں ڈھل جاتا ہے اور ان کی یہ فکر ہمیشہ ہمیں جوش وعمل اور تمنا و شوق کے جذبے سے سرشار کرتی ہے۔ غالب کی فکری

تعمیر وتشکیل کے سیاق میں جہاں اس تہذیب کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے جو خود غالب کے خاتمے اور ان کے انتقال کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے وہیں ان کے فن نے بھی اس کو بال و پر عطا کیے ہیں۔ جہاں تک غالب کے فن کی بات ہے تو پروفیسر محمد حسن نے اس کو تخلیق آفرینی کو حوصلہ بخشنے والا فن کہا ہے۔ حالی کے نزدیک تخلیق آفرینی سے مراد معنی کی تہہ داری ہے۔ ان کے یہاں غالب کے اشعار کے دو یا اس سے زیادہ معنی پر حاوی ہونے کے اشارے ملتے ہیں۔ لیکن بغور دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ غالب کا فن صرف تخلیق آفرینی اور امکان آفرینی کا فن نہیں بلکہ غالب کا فن ان تمام اوصاف کا حامل ہے جن کی بنیاد پر کسی بھی شاعری کو ہم فنی اعتبار سے بڑی شاعری کے درجے میں رکھتے ہیں۔ غالب کی شاعری میں فکر وفن کا جو حسین امتزاج ہے اور اس سے جو ایک خاص رنگ و آہنگ اور اثر و تاثیر پیدا ہوتی ہے اس کو سمجھنے میں عبادت بریلوی کا یہ اقتباس ہمارے لیے بڑی آسانیاں فراہم کرتا ہے:

''وہ قاری کے دلوں کو لبھاتی، حواس پر منڈلاتی اور روح پر سرخوشی بن کر چھا جاتی ہے۔ لیکن اس کا سحر صرف یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس سے ایک قدم آگے وہ فکر کو اذن پرواز بھی دیتی ہے۔ اس کے ہاتھوں ذہن میں اُجالا بھی ہوتا ہے اور وہ ادراک میں تیزی اور شعور میں بیداری بھی پیدا کرتی ہے۔ غالب صرف محسوسات ہی کے شاعر نہیں، ان کے یہاں غور وفکر اور سوچ بچار کا بھی خاصا سامان ملتا ہے۔ وہ زندگی کو دیکھنا اور بسر کرنا ہی نہیں سکھاتے، اس میں حقیقتوں کی تلاش و جستجو کا درس بھی دیتے ہیں۔ اور نہ صرف یہ بلکہ ان حقیقتوں کے مختلف پہلوؤں کا ادراک بھی ان کے پیش نظر رہتا ہے جو بظاہر معمولی سی بات کہتے ہیں، لیکن اس کی تہہ میں انسانی زندگی کی کوئی بڑی ہی اہم حقیقت ہوتی ہے۔ بادی النظر میں وہ کوئی بہت ہی معمولی سا خیال پیش کرتے ہیں، لیکن اس کی تہہ میں بھی کوئی بڑا ہی فلسفیانہ نکتہ ہوتا ہے۔''[3]

غالب کے یہاں موجود یہی وہ فکری کمال، فنی خوبیاں اور تخلیقیت وتہہ داری ہے جن کی بدولت ان کی شاعری کا دائرہ اثر اور حلقہ سحر روز افزوں بڑھتا جا رہا ہے اور ہر ایک کے لیے ان کی شاعری یکساں طور پر حرکت وعمل، حوصلہ و ہمت اور شوق وتمنا کا ایک دوسرا قدم معلوم ہوتی ہے۔

تاریخی سیاق میں دیکھیں تو غالب انیسویں صدی کے شاعر تھے اور انھوں نے اپنے افکار وخیالات کا اظہار اسی صدی کے سیاق میں کیا تھا۔ انیسویں صدی اور موجودہ دور کی زندگیوں میں آسمان و زمین کا فرق و امتیاز پیدا ہو گیا ہے۔ انسانی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہوگا جس میں عروج وترقی کی منازل نہ طے کر لی گئی ہوں۔ بدلتے ہوئے وقت اور زمانے کے ساتھ انسان کے افکار وخیالات، تہذیب ومعاشرت، سماجی و ملی زندگیاں سب کچھ بدل گئیں، آج کے انسان نے ترقی اور کامیابی کی اس قدر منزلیں طے کر لی ہیں کہ اس نے ستاروں پر کمندیں ڈال دی ہیں، چندریان پر اپنا جھنڈا لہرانے کے بعد اب ہمارا رخ اگلی کامیابی اور فتوحات کی طرف ہے۔ ایسے میں اگر کوئی شاعری ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں سب سے زیادہ کامیاب نظر آتی ہے تو بلا شبہ وہ غالب کی ہی شاعری ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غالب کی شاعری ہی کیا ہر عہد کی تخلیق دوسرے ادوار کے لیے بھی اتنی ہی اہمیت وافادیت کی حامل ہو سکتی ہے جتنی کہ وہ اپنے دور کے لیے تھی، ولی، میر، مومن، ذوق اور فیض و فراق اس کی عمدہ مثالیں ہیں لیکن ان میں غالب کی جو انفرادیت ہے وہ مسلم ہے۔ غالب کی شاعری کے دو سو سال گذر جانے کے باوجود آج یہ جس قدر ریلیوینٹ اور زندگی کے ہر پہلو کی عکاس نظر آتی ہے اس کی مثال ہمیں کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ کہی جا سکتی ہے کہ غالب انیسویں صدی کے شاعر تو ضرور تھے مگر ان کی فکر اپنے عہد سے بہت آگے کی تھی۔ غالب ایک ذہین وفطین انسان تھے اور انھیں اپنی غیر معمولی ذہانت و فطانت کی بدولت آنے والے ادوار کا نہ صرف اندازہ تھا بلکہ انھوں نے ان کی نبض پر انگلی رکھنے کا کام بھی کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ناقدین نے غالب کو مستقبل کا رمز شناس اور امانت دار شاعر کہا ہے۔ بقول محمد حسن کہ 'وسط انیسویں صدی نے اردو شاعری کو تین تحفے دیے۔ ایک ماضی کے ارمانوں اور صنائع کے رمز شناس حکیم مومن خاں مومن، دوسرے زمانۂ حال کے رمزداں اور مزاج شناس شیخ ابراہیم ذوق اور تیسرے مستقبل کے امانت دار مرزا غالب'۔[4]
خود غالب کو بھی اپنی اس مستقبل پسندی اور دور بینی و دور اندیشی کا اندازہ تھا تبھی تو انھوں نے کہا تھا کہ

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغ تخیل کی رسائی تا کجا

نیز انھوں نے آنے والے ادوار سے اپنی وابستگی و سروکار کو بھی کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے کہ

تو اور آرائش خم کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

آج جب کہ انسان نے اتنی ترقیاں حاصل کر لی ہیں اور اس بدلے ہوئے وقت وحالات میں غالب کی فکر وفن اور سخن سازی کی گرہیں کھل رہی ہیں۔ آج کا انسان، جب غالب کی شاعری پر غور وفکر کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ غالب نے دو سو سال پہلے انسان کے جن مسائل و مشکلات، فہم و ادراک اور شعور و لاشعور کی گرہیں کھولنے کی کوشش کی تھی، انسانی نفسیات اور اس کے مسائل ومعاملات کا ذکر کیا تھا اس کا مخاطب صرف وہ عہد نہیں تھا بلکہ وہ بھی ہے جس سے آج ہم سب کا تعلق ہے اور جس کو آج ہم جدید دور سے تعبیر کرتے ہیں۔ نمونے کے طور پر غالب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

ان اشعار سے جہاں ہمیں غالب کے فکری وفنی امتیازات کا اندازہ ہوتا ہے وہیں ان کے ان افکار و خیالات، احساسات و جذبات اور مسائل و معاملات کے آئینے میں ہم موجودہ دور کی حسیات ونفسیات اور مشاہدات و تجربات بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کی متعدد مثالیں قدم قدم پر مل جائیں گی جن میں فکر کی بلندی، خیال کے ترفع اور تشبیہات و استعارات کی مدد سے غالب نے بیسویں صدی کے وسطی دور میں اپنے ایسے

مشاہدات وتجربات اور افکار وخیالات کو پیش کر دیا تھا جن میں ہم اپنے عہد اور معاشرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ حسن وعشق کے معاملات ہوں یا درد وغم کا فلسفہ، زندگی وموت کی سچائیاں ہوں یا پھر حیات وکائنات کے مسائل، انسان کی اپنی حسیات ونفسیات ہوں کہ موجودہ دور کے معاملات وترجیحات غرض یہ کہ ہر امر کی عکاسی غالب کے یہاں اسی درد وکرب، شدتِ احساس اور نزاکت ودردمندی کے ساتھ موجود ہے جیسا کہ آج نئی نسل محسوس کر رہی ہے۔ بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے جدید دور کی مادی ومعاشی ترقیوں اور سائنسی ایجادات واختراعات کی تیز رفتاری نے آج انسانی ذہن کو ایک کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، انڈرائڈ موبائل، اسمارٹ واچ اور اب اے آئی جیسی جدید دور کی برکتوں کے باوجود آج کا انسان خود کو ناآسودہ اور تنہا محسوس کر رہا ہے اور اسے مذہب کی طرح ایک ایسی پناہ گاہ کی تلاش ہے جو اس کے جذباتی کرب کو تسکین دے سکے۔ ایسے میں جب کوئی غالب کی شاعری کو گنگنانے لگتا ہے تو اسے اپنے اس درد وغم اور انتشار وتنہائی کی گھڑی میں نہ صرف ایک سہارا مل جاتا ہے بلکہ اسے زندگی کے دکھ درد کو خوشی خوشی برداشت کرنے، آگے بڑھنے اور زندگی کو خوب سے خوب تر کرنے کا حوصلہ بھی ملتا ہے۔

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

کسی بھی شاعر کے شعری پہلوؤں سے بحث کے وقت اس کے شعری مواد کے ساتھ ساتھ اس میں مستعمل لفظیات کو بھی زیرِ بحث لانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ غالب کی شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ غالب جہاں علم بیان اور علم بدیع سے اپنے کلام کو حسن ومعنی کا ہنر بخشتے ہیں وہیں انھوں نے شوق، آرزو، تمنا جیسے الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں جو سفر اور سفرِ مسلسل کا استعارہ ہونے کے علاوہ ہمیں جہدِ مسلسل کی بھی ترغیب دیتے ہیں۔ غالب کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ہمارے رازوں سے واقف ہیں بلکہ وہ ہماری دوڑ بھاگ والی زندگی میں بھی ہمارے ساتھ کھڑے ہیں بلکہ ہمیں پیچھے سے حوصلہ بھی دے رہے ہیں۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کے مکاں اپنا

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

غالب انیسویں صدی کا ایک ممتاز نام ہے۔ انھوں نے اپنی فکر کی بلندی، دور بینی اور فکرو فن کے حسین امتزاج سے اپنی شاعر ی کو وہ حسن لازوال اور عروج کمال عطا کیاہے کہ اس کی تاثیر و معنویت جتنی کل تھی اتنی ہی آج بھی ہے بلکہ کئی حیثیتوں سے موجود ہ دور میں اس کی اہمیت دو چند ہوجاتی ہے اور وہ ہماری زندگی سے سب سے زیادہ ریلیونٹ معلوم ہوتی ہے۔

اسی طرح غالب کی شاعری جہاں ہر عہد کے قاری کو ان کے اپنے احساسات وجذبات، مشاہدات وتجربات اور حسیت وآگہی سے روبرو کراتی ہے وہیں اس میں اس دور کی ناہمواریوں، چال بازیوں اور منافقت کے نقشے بھی کھینچے ہیں۔ نیز اس میں قاری کے لیے اس عہد کی فتنہ سامانیوں سے بچتے بچاتے ہوئے اپنی زندگی کرنے کے لیے بڑے اہم اور کارآمد پند ونصائح بھی موجود ہیں۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

اور پھر ذیل کی غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
نہ سنو گر برا کہے کوئی — نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی

غرض یہ کہ غالب انیسویں صدی کا ایک ممتاز نام ہے۔ انھوں نے اپنی فکر کی بلندی، دور بینی اور فکر وفن کے حسین امتزاج سے اپنی شاعری کو وہ حسن لازوال اور عروج کمال عطا کیا ہے کہ اس کی تاثیر ومعنویت جتنی کل تھی اتنی ہی آج بھی ہے بلکہ کئی حیثیتوں سے موجودہ دور میں اس کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے اور وہ ہماری زندگی سے سب سے زیادہ ریلیونٹ معلوم ہوتی ہے۔ اس سے جہاں ہمیں اپنے احساسات وجذبات کی عکاسی اور مسائل ومشکلات کی ترجمانی کا احساس ہوتا ہے وہیں اس کے مطالعے سے ہمیں اس گھٹن اور چبھن بھری زندگی سے راہ فرار اختیار کرنے کے بجائے فرحت وانبساط، قوت وتوانائی اور حرکت وعمل کے لیے ہمت وحوصلہ ملتا ہے۔ بلکہ بقول شمیم حنفی کہ ’عالمی معیاروں کے مطابق اردو کے عظیم شاعروں، میر غالب، اقبال میں تنہا غالب ہیں جن کے آئینۂ ادراک میں مجھے اپنے عہد کے آشوب اور اپنی روح سے وابستہ سوالوں کا عکس سب سے زیادہ متحرک دکھائی دیتا ہے۔ یہ شاعری میرے لیے فیضان کا ایک مستقل سرچشمہ ہے۔ اس کے رموز کبھی ختم نہیں ہوتے۔ روز مرہ زندگی کی دھوپ چھاؤں، عام انسانوں کے دکھ سکھ، وقت اور کائنات کی بنیادی سچائیوں کا جتنا گہرا اور گہرا شعور ہمیں غالب کی شاعری میں موج زن نظر آتا ہے، اس نے ہمارے لیے اس شاعری کو اپنی روحانی اور داخلی ضرورتوں کی تکمیل کا ایک ذریعہ بنا دیا ہے۔ مجھے غالب کے بغیر اپنی دنیا ادھوری اور خام محسوس ہوتی ہے‘[5]۔ گویا اردو کے تمام شعرا میں صرف غالب ہی وہ ایک ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری روحانی اور داخلی ضرورتوں کی تکمیل میں ایک سرچشمے کی حیثیت رکھتی ہے۔

حواشی

1. پیغمبران سخن، علی سردار جعفری، ایڈیشات پبلی کیشنز ممبئی، ص 131
2. نشاط کا شاعر، ظ۔ انصاری، مشمولہ غالب فکر وفن مرتبہ رشید حسن خاں، غالب اکیڈمی، کراچی، ص 9
3. غالب کی شاعرانہ عظمت، عبادت بریلوی، غالب اور مطالعۂ غالب، سکینہ پبلشنگ ہاؤس، ص 209
4. طرز خیال، محمد حسن، اردو اکادمی، دہلی، ص 65
5. پیش لفظ، غالب کی تخلیقی حسیت، شمیم حنفی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2005

■

Dr. Abdur Razzaque Ziyadi
House No.D-14 Street No.7
Johari Farm Noor Nagar Extn.
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025
Mobile No.: +919911589715
E-mil: arziyadi@gmail.com

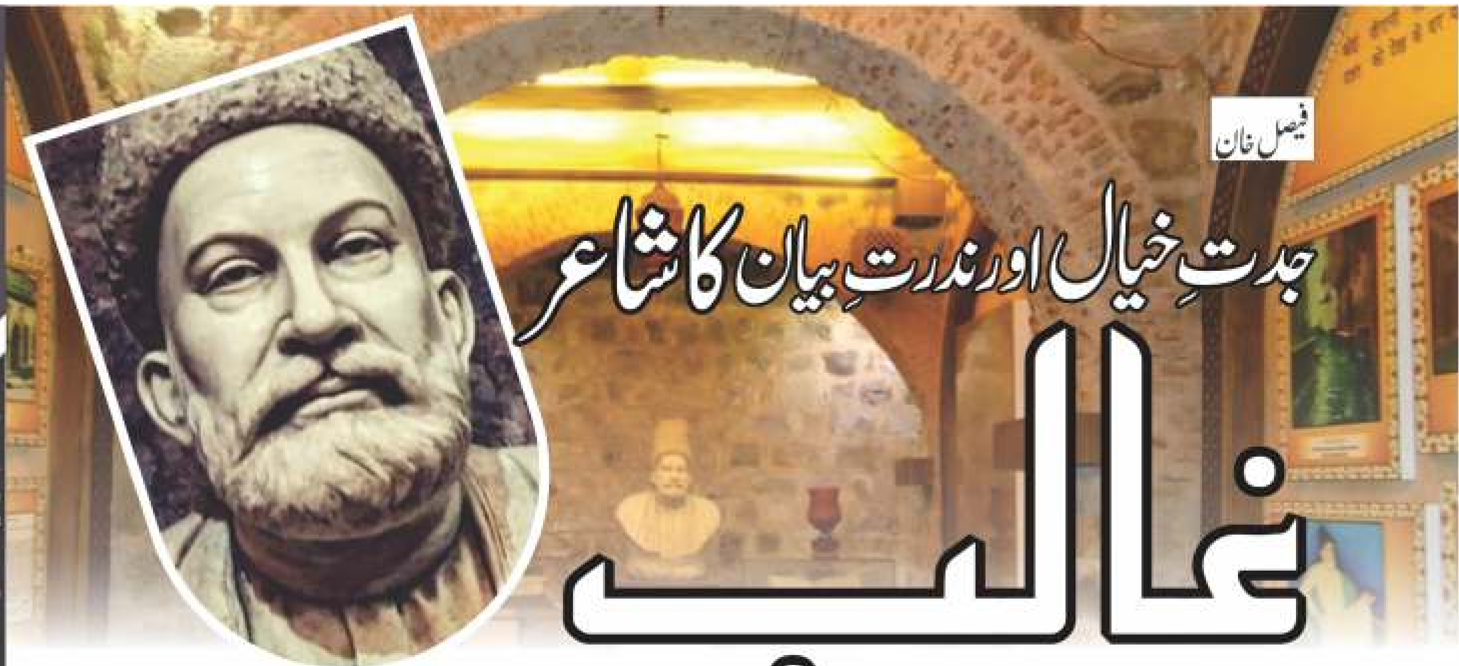

فیصل خان

جدتِ خیال اور ندرتِ بیان کا شاعر
غالب

مرزا غالب کی شاعری افکار و معانی کا مخزن ہے جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ اس کی تفہیم و تعبیر کسی چیلنج سے کم نہیں جس کی جڑیں آفاقیت سے جا ملتی ہیں۔ غالب کی شاعری کو دوام کیوں ہے؟ یا یہ کہیں کہ اس کی زندگی بڑھتی کیوں چلی جا رہی ہے؟ تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے اشعار نئے حالات میں نئے سرے سے اپنا رنگ دکھاتے ہیں اور پڑھنے والے پر نئی کیفیت اُس مخصوص لمحے کے لیے پیدا ہو جاتی ہے جس کا وہ منتظر یا متلاشی ہوتا ہے۔ شعر کو سیدھے سادے الفاظ میں نہ کہہ کر جدّت پیدا کرنے کے لیے انوکھا انداز اختیار کرنا، عام ڈگر سے ہٹ کر چلنا اور عام فہم اسلوب سے گریز کرنا مرزا کی شان ہے۔

مرزا کے مزاج میں ایجاد اور اختراع کا مادّہ بہت تھا، عام شاہ راہ سے ہمیشہ خود کو دور رکھتے تھے اور یہی بات ان کی غیر معمولی قابلیت اور قوتِ استعداد پر اپنی مہر ثبت کراتی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''مرزا کی طبیعت اسی قسم کی واقع ہوئی تھی وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑھاتے تھے... عامیانہ خیالات اور محاورات سے جہاں تک ہو سکتا تھا اجتناب کرتے تھے۔''

(یادگارِ غالب: خواجہ الطاف حسین حالی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی 1996، دوسرا ایڈیشن، ص 115)

مرزا کے دیوان میں موجود غزلیں بحیثیتِ تعداد کے کم ہی کیوں نہ ٹھہریں مگر جس قدر احتیاط سے منتخب اور چنندہ اشعار ان کی غزلوں میں شامل ہیں وہ بڑے بڑے قد آور شعرا کے کلام کے انتخاب پر بھاری ہیں۔

مرزا کی غزلوں میں پائے جانے والے بہت سے مضامین اس سے پہلے اردو غزل میں نہیں برتے گئے، دیگر شعرا کے تخیل کی پرواز ان جیسے مضامین کو اپنے دام میں نہیں لا سکی۔ انھوں نے کچھ روایتی مضامین اس ادا بندی اور طرفگی سے بیان کیے ہیں اور اس میں ایسی لطافت

> ”شعر کو سیدھے سادے الفاظ میں نہ کہہ کر جدّت پیدا کرنے کے لیے انوکھا انداز اختیار کرنا، عام ڈگر سے ہٹ کر چلنا اور عام فہم اسلوب سے گریز کرنا مرزا کی شان ہے۔“

ہے کہ بے ساختہ آفریں کہنے کو دل چاہتا ہے۔ مرزا کے کلام میں پائی جانے والی ان خوبیوں کو ہمارے ناقدین نے مضمون آفرینی، معنی آفرینی، جدّتِ خیال اور ندرتِ بیان جیسی اصطلاحوں سے تعبیر کیا ہے۔

مضمون آفرینی کی دو شکلیں ہوتی ہیں (1) نئی نئی تشبیہات و استعارات کے استعمال سے نئی بات کہنا، جسے جدت خیال سے موسوم کر سکتے ہیں (2) روایتی اور فرسودہ باتوں میں نئے پہلو اختراع کرنا یا انھیں نئے ڈھنگ سے بیان کرنا، اس کے لیے ندرتِ بیان کی ترکیب استعمال کی جا سکتی ہے۔ پہلی صورت کو مشکل گردانا گیا ہے، اس لیے کہ نئی تشبیہیں اور نئے استعارے کی ایجاد تو کسی قدر ممکن بھی ہے لیکن ان کو بنیاد بنا کر کسی انوکھی بات کا کہہ پانا مشکل ترین امر ہے۔ جب کہ دوسری شکل جہاں شاعر پہلے سے کہی ہوئی باتوں کو نئے طریقے اور نئے ڈھنگ سے بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے یا اس میں کچھ نئے پہلو نکالتا ہے جو پہلی قسم سے زیادہ آسان اور سہل ہے۔ مضمون آفرینی کے لیے اردو میں بطور خاص دوسرا طریقہ ہی زیادہ رائج ہے۔ اس تناظر میں فیض احمد فیض کا یہ اقتباس خاص اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے:

''ہم مضمون آفرینی سے یہ مراد لیتے ہیں کہ مضمون کم ہے اور آفرینی زیادہ اگر شاعر کوئی بالکل ناشنیدہ مضمون پیدا کر لے تو ہم اسے مضمون آفرینی نہیں کہتے۔ لیکن اگر کسی پرانے فرسودہ مضمون میں کوئی تفصیل بڑھا دی جائے...... تو مضمون آفرینی مسلّم''

(میزان: فیض احمد فیض، پرنٹ مین، توپسیا ساؤتھ روڈ کولکاتہ 2002، ایڈیشن دوم، ص 46)

'جدت' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی نیا پن، تازگی، اُپج اور ایجاد وغیرہ کے آتے ہیں۔ یہ اصطلاح اردو تنقید میں فارسی اور انگریزی سے مستعار ہے۔

جدت کی اصطلاح میں جدیدیت کی آمیزش نے اسے جدتِ ادا کی صورت عطا کر دی۔ جدت اور جدتِ ادا میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جدّت نام ہے شاعری میں نئے مضمون و معنی کو نئے انداز اور طرفگی سے عصری مسائل کے ساتھ متصف کر کے بیان کرنا۔ جب کہ

جدتِ ادا میں کوئی نئی چیز دریافت نہیں کی جاتی بلکہ پہلے سے موجود مضمون کو نئی ترکیب اور بندشوں کے سہارے نئے رنگ اور ڈھنگ سے پیش کیا جاتا ہے۔

پروفیسر محمد حسن اپنی کتاب 'مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ' میں جدتِ ادا اور تغزل گوئی کو مضمون آفرینی کی توسیع قرار دیتے ہیں۔ درج بالا سطور میں کی گئی گفتگو کے بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ مضمون آفرینی اور جدتِ ادا میں لفظوں کے ہلکے سے تفاوت کے ساتھ ایک ہی قسم کی باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ لہٰذا مضمون آفرینی اور جدتِ ادا کو دو الگ الگ اصطلاح نہ کہہ کر ایک ہی اصطلاح کی دو قسمیں کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں نازک خیالی، خیال بندی، معنیٰ آفرینی اور ندرتِ بیان کو بھی مضمون آفرینی اور جدتِ ادا کی ضمنی شاخیں ہی سمجھنا چاہیے۔ اردو شاعری میں رائج ان تنقیدی اصطلاحات کے معنیٰ ومفاہیم پر بحث کرنے کے بعد ناگزیر ہو جاتا ہے کہ دیوان غالب سے چند مثالیں بھی پیش کر دی جائیں تاکہ مرزا کے کلام میں پائی جانے والی خیال کی ندرت اور نرالے اندازِ بیان کی نشاندہی بھی ہو جائے۔

مرزا کی ندرتِ بیان کا ایجاز یہ ہے کہ دیوان کے پہلے ہی شعر سے انھوں نے جس استعاراتی انداز میں ندرتِ خیال کو نئے حسنِ بیان میں پیش کیا ہے اس کی مثال غالب سے پہلے اردو شاعری میں نہیں ملتی۔ اس شعر کے معنیٰ ومفہوم سے میں گریز کرتا ہوں لیکن کلام غالب میں جو حرفِ اول ہے وہ ندرتِ بیان کا شاہ کار ہے جس کی تعبیر وتفہیم میں شارحین نے قابلِ قدر فکری مواد فراہم کیے ہیں۔ نمونے کے طور پر کچھ اور اشعار مع تشریحات کے ملاحظہ فرمائیں۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

سرسری طور پر تو یہ عام خیال ظاہر ہو رہا ہے اور پہلے مصرعے کا خیال بھی عام فہم ہی ہے، لیکن غور وفکر کے بعد اس کے اچھوتے پن کا احساس تب ہوتا ہے جب ہم دوسرے مصرعے کی طرف رُخ کرتے ہیں جہاں مضمون آفرینی موجود ہے اور یہی اس شعر کا حاصل ہے کہ انسان کا انسان ہونا کار دشوار ہے۔ یہ شعر انسانی اخلاقیات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ پہلے مصرعے میں جو بحث قائم کی گئی تھی دوسرے مصرعے میں اس کی تکمیل ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ دنیا کا چھوٹے سے چھوٹا کام بھی بآسانی نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے بھی ریاضت درکار ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر شخص جو کہ آدمی ہے باوجود اس کے اس کا انسان بننا ایک مشکل امر ہے۔ یعنی دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جن کے اندر انسانیت ہو اور وہ اپنی اخلاقی قدروں کے ساتھ انسانیت کے درجۂ کمال تک پہنچے ہوئے ہوں۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

مرزا کی ندرتِ بیان کا ایجاز یہ ہے کہ دیوان کے پہلے ہی شعر سے انھوں نے جس استعاراتی انداز میں ندرتِ خیال کو نئے حسنِ بیان میں پیش کیا ہے اس کی مثال غالب سے پہلے اردو شاعری میں نہیں ملتی۔

غالب کا یہ شعر گرچہ بہت زباں زد ہے لیکن جدتِ خیال کا حامل ہے خاص طور پر ہوس کو نشاطِ کار کی ہوس کہنا ہماری شاعری کا نیا اندازِ بیان ہے۔ جس قدر اس خیال میں تازگی ہے اتنا ہی یہ مبنی بر حقیقت بھی ہے۔ جینے اور مرنے کی دو متضاد کیفیتوں کا سنگم شعر کے حسن میں مزید دلکشی پیدا کر رہا ہے۔ اس کا موضوع فطرتِ انسانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسانی محنت ومشقت کا انحصار اس بات پر موقوف ہے کہ وہ اپنی چھوٹی سی زندگی میں دنیوی نعمتوں کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے اور یہ عجلت اس لیے کہ موت کا کوئی ٹھکانہ نہیں، بشیر بدر کی زبان میں ''نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے'' لہٰذا جینے کا مزہ بھی اسی میں مضمر ہے، اگر موت کا وقت متعین ہوتا تو جینے کا لطف کہاں باقی رہتا، جسے جبلتِ انسانی سے تعبیر کرنا چاہیے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

جس نرالے انداز سے اس شعر میں غالب نے اپنی ہستی پر اپنے نہ ہونے کو ترجیح دی ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ اسے جدتِ ادا سے ہی تعبیر کیا جائے گا، نئے پن کی ایسی مثال مشکل سے دیکھنے میں آئے گی۔ وہ کہتے ہیں میرا وجود ہی مجھے ڈبوئے دیتا ہے اور یہی میری ناکامی کا سبب ہے۔ یعنی مجموعی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی وجود کے بعد ہی دنیا میں خیر وشر کی ابتدا ہوئی، اگر انسان نہ ہوتے تو دنیا میں فسادات کے سلسلے کا ظہور ہی نہ ہوتا اور خدا کی ذات جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی وہ اسی طرح باقی رہتی۔ گویا اس شعر میں وجودیت کا فلسفہ اپنی اثر آفرینی کے ساتھ پوشیدہ ہے۔

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

اس شعر میں توفیق کا ہمت سے رشتہ قائم کر دینا ہی ندرتِ خیال کی چاشنی کا احساس دلا رہا ہے۔ غالب نے بڑی خوبصورتی سے اسے شعری پیکر میں ڈھال کر اپنی قوتِ استعداد کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔ کسی مہم کو سر کرنے کا اور کسی مقام کو پانے کا اگر جنون سوار ہو اور انسان اس کے لیے تگ ودو بھی کر رہا ہو تو خداوند قدوس بھی غیب سے اُسے اس کی توفیق یعنی ہمت عطا فرما دیتا ہے تاکہ وہ اپنی مراد کو پا سکے۔ جس طرح قطرۂ اشک کی جگہ آنکھوں میں ہے، دریا کی تہوں میں بننے والا موتی اس کی جگہ ہرگز نہیں لے سکتا، بالکل اسی طرح محنت کے بعد کامیابی یقینی ہے اس کا وہی اصل حق دار ہوتا ہے جس نے ریاضت سے کام لیا ہو۔

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

مرزا نے اس شعر میں اہلِ وطن سے شکایت کا انوکھا انداز اختیار کیا ہے اور شکر کے ساتھ شکوہ شکایت کو ایک ہی شعر میں اس طرح ضم کر دیا ہے کہ نئے خیالات کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ یہاں اہلِ وطن سے اہلِ خانہ اور عزیز واقارب دونوں مراد لیے جا سکتے ہیں۔ کسی اجنبی شہر میں زندگی کی آخری سانس لینا کسے پسند ہوگا، لیکن اس کے بعد بھی خدا کا شکر ادا کیا جا رہا ہے کہ پردیس میں بغیر کفن دفن کے پڑے رہے تو بھی کون پوچھنے والا ہے؟ کیونکہ یہاں تو ویسے بھی کوئی اپنا نہیں۔ لیکن اگر اپنے وطن میں مر جانے کے بعد اہلِ وطن اور اہلِ خانہ نے بے وفائی اختیار کی اور یہی سلوک روا رکھا یعنی گور وکفن نہیں دیا تو سخت ذلت اور رسوائی کا سامان ہے۔ چنانچہ

وطنِ غیر میں مرنے پر شکر بجا لائے کہ خدا نے میری بے کسی کی لاج رکھ لی اور اس ذلت سے محفوظ رکھا۔

اس شعر کا ایک معنیٰ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وطن سے دوری غربت کی علامت ہے اور بے کسی بھی غربت کی نشانی ہے۔ لہٰذا وطن سے دور مرنے سے اہلِ وطن پر غربت اور بے کسی ظاہر نہ ہو سکی بلکہ پوشیدہ رہی اور عزتِ نفس پر کوئی حرف بھی نہیں آیا۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

عادتِ رنج سے رنج کی نجات کا پہلو نکالنا ہی شعر کا اصل جز ہے۔ اور جس طرح کثرتِ دشواری کا مقابلہ سہل پسندی سے کیا ہے غلو کی حد میں داخل ہو جاتا ہے۔ صنعتِ تضاد کی ایسی مثالیں کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ ظاہر ہے یہ بالکل نئے انداز کی پیش کش ہے، اس شعر میں مرزا نے انسانی نفسیات کو اُجاگر کیا ہے کہ ہر شخص دنیا میں آنے کے بعد مختلف طرح کے مصائب سے ضرور دوچار ہوتا ہے اور پھر آلام کی کثرت اُسے اس کا سامنا کرنا بھی سکھا دیتی ہے۔ تاہم عادی ہونے کے بعد بڑے سے بڑا دکھ درد اور رنج والم اُسے چھوٹا اور ہلکا لگنے لگتا ہے۔

ملنا ترا اگر نہیں آسان تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

یہ شعر فی الحقیقت سچائی پر مبنی ہے۔ یہاں متناسب الفاظ کے ساتھ لفظوں کی تکرار سے معنی پیدا کیے گئے ہیں۔ اس میں عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کا رنگ یکساں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اب پڑھنے والے کی صوابدید پر ہے کہ وہ اسے کس پر محمول کرتا ہے۔ محبوب کا ملنا (حقیقی ہو یا مجازی) اگر آساں نہیں تو مشکل بھی نہیں اور یہی سب سے بڑی دشواری ہے۔ کیونکہ کسی دشوار کن چیز کا شوق اس کی دشواری کے سبب ماند پڑ سکتا ہے لیکن کسی آسان چیز کی خواہش گرچہ وہ حاصل نہ ہو سکے، اس کی آرزو کبھی ختم نہیں ہوتی اور نہ دل مطمئن ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ غالب نے یہ شعر قاضی عبدالجمیل صاحب جنون بریلوی کے نام ایک خط میں لکھ کر بھیجا تھا۔ جو خطوطِ غالب کی جلد دوم میں موجود ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

یہ شعر تعریفِ حسنِ بیان کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ کسی کے بیان کی سحر انگیزی اور جادو بیانی کی ایسی مدح نہیں دیکھی گئی۔ لذتِ تقریر کا موازنہ خیال دل سے طرفگی کی عمدہ مثال ہے۔ کہنے والا اس ادا کے ساتھ اور ایسی ہنر مندی سے اپنی بات کہہ رہا ہے کہ سننے والے کے دل و جاں میں وہ بات گھر کرتی جا رہی ہے اور سامع یہ محسوس کرنے پر مجبور ہے کہ یہ خیالات تو میرے دل میں پہلے سے موجود تھے گویا یہ میری ہی باتیں کر رہا ہے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

واضح رہے کہ حالی نے یادگارِ غالب میں 'ساغرِ جم' کی جگہ 'جامِ جم' نقل کیا ہے۔ لیکن مختلف دواوین میں ساغرِ جم ملنے کی وجہ سے راقم نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ حالانکہ جامِ جم اور ساغرِ جم دونوں ہم وزن ہونے کے ساتھ ساتھ ہم معنیٰ بھی ہیں۔ بادشاہ کے شراب کے پیالے پر مٹی کے پیالے کو فوقیت دینا اور اس ادا کے ساتھ کہ اگر گر کر ٹوٹ بھی جائے تو غم نہیں بازار سے دوسرا اور پھر تیسرا خرید کر لاتے رہیں گے جدت طرازی کا ہی کمال ہے۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اس شعر میں شوخیِ ظرافت اچھوتی اور نئی طرح کی ہے۔ داغِ گناہ کے ساتھ حسرتِ دل کا شمار معنیٰ آفرینی اور خیال آفرینی دونوں پیدا کر رہا ہے۔ ظاہری اعتبار سے شاعر خدا کے دربار میں یہ عرضی پیش کر رہا ہے کہ اُس سے اس کے گناہوں کا حساب نہ لیا جائے۔ لیکن پسِ پردہ یہ بات بھی پوشیدہ ہے کہ جس کثرت سے میرے دل پر داغ ہیں اتنے ہی میرے گناہ ہیں مگر افسوس کہ اتنی بداعمالیوں اور نافرمانیوں کے بعد بھی بہت سے ارمان دل میں باقی رہ گیے ہیں۔ داغ دیکھ کر اپنے گناہ تو یاد آتے ہیں لیکن حسرتِ دل ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ حالی کی زبان میں ''اگر شراب پینے کو مل گئی تو وصل نصیب نہ ہوا اور وصل میسر آ گیا تو شراب نہ مل سکی''۔ لیکن دوسری جگہ مرزا نے اسی مضمون کو شوخی و ظرافت اور مضمون آفرینی کے سبب ایک اور نیا رنگ دے دیا ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں: اگر ماضی میں کیے گئے گناہوں کی سزا لازم ہے تو ایسے گناہ جن کے کرنے پر قدرت رہی ہو یا نہ رہی ہو مگر وہ نہیں کیے گئے تو اس پر داد و تحسین بھی ملنی چاہیے۔ وہ شعر دیکھیں۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اس شعر کی شرح بیان کرتے ہوئے اس مضمون کی جدت کے حوالے سے نظم طباطبائی لکھتے ہیں:

''اس شعر کی داد کون دے سکتا ہے؟ میر تقی (ف 1810) کو بھی حسرت ہوتی ہوگی کہ یہ مضمون مرزا نوشہ کے (1869) لیے بچ رہا۔''

(شرح دیوان اردوے غالب: سید حیدر علی نظم طباطبائی، مرتب ظفر احمد صدیقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی 2012، ص 472)

مضمون آفرینی، ندرتِ خیال اور جدتِ مضامین کے تجسس اور آرزو نے غالب کو عام اور مبتذل تشبیہوں سے گریز کرنے پر مجبور کر دیا۔ جدت طرازی کے شوق میں نئے الفاظ، نئے استعارے، نئی ترکیبیں اور نئی بندشیں وضع کرنے پر غالب نے عمرِ عزیز کا اکثر حصہ صرف کر دیا۔ اسی بنا پر شیخ محمد اکرام نے انھیں 'تشبیہات کا بادشاہ' قرار دیا ہے۔ مرزا مبتذل خیالات سے بچنے کے لیے معمولی باتوں کو دلکش انداز میں کہتے، جدتِ تخیل کی فکر میں ہمہ تن کوشاں رہتے اور جدتِ محاکات کی تلاش کرتے رہتے تھے۔ آل احمد سرور نے کسی جگہ لکھا ہے کہ ''غالب کے قصرِ شاعری کی بنیاد جدتِ تخیل، جدتِ طرزِ ادا، جدتِ استعارات و تشبیہات، جدتِ محاکات اور جدتِ الفاظ پر قائم ہے''۔ آخر میں مزید چند مثالیں بغیر کسی وضاحت کے درج کی جاتی ہیں تا کہ کلامِ غالب میں مضمون آفرینی، جدتِ خیال اور ندرتِ بیان کی تلاش و جستجو قارئین کے دلوں میں کارفرما ہے۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اِدھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہوتے تک

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

■

Mo Faisal Khan
Research Scholar , Department of Urdu
Delhi University,
Delhi - 110007
Mob:- 9918998144
Email:- fk.nadwa123@gmail.com

شخصیات

علامہ محوی صدیقی لکھنوی کی علمی، ادبی اور تعلیمی خدمات

محمد نعمان خاں

محمد حسین محوی صدیقی نے 15 مئی 1891 کو لکھنؤ کے ایک متوسط علمی خانوادے میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد حافظ حسین فوز عالم اور شاعر تھے لہٰذا شعر و علم و ادب علامہ محوی صدیقی کو ورثے میں ملا جس کے سبب بچپن ہی میں انھیں شعرگوئی، خطاطی، خوش نویسی اور مطالعے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ نواب صدیق حسن خاں نے علامہ محوی صدیقی کے والد فوز لکھنوی کو لکھنؤ سے بھوپال بلا کر ریاست بھوپال کے دفترِ تاریخ میں ملازمت پر فائز کیا جس کی وجہ سے محوی صدیقی کی ابتدائی تعلیم مدرسہ نظامیہ فرنگی محل لکھنؤ کے بعد بھوپال کے مدرسہ حمیدیہ اور سلیمانیہ میں مکمل ہوئی۔

محوی صدیقی نے ماہ نامہ 'الناظر' لکھنؤ میں منیجر اور نائب مدیر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا اور 1916 میں وہ بھوپال کے 'دفتر تاریخ' سے وابستہ ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد مدرسہ الٰہیات کانپور میں مدرس کی حیثیت سے فرائض انجام دے کر اور 1921 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ میں ملازم رہ کر 1922 میں 'عبیدیہ دار الاشاعت' بھوپال کے مہتمم کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ 1924 سے 1929 تک 'انجمن ترقی اردو' اورنگ آباد سے وابستہ ہو کر 'بابائے اردو' مولوی عبدالحق کے ادبی معاون کی حیثیت سے اردو زبان و ادب کے فروغ سے متعلق انھوں نے مختلف النوع علمی، ادبی، تدریسی اور انتظامی کاموں میں حصہ لیا۔ انجمن ترقی اردو کے ادبی رسالے 'اردو' کی ترتیب اور ڈکشنری کی تیاری کے علاوہ انٹر کالج اورنگ آباد میں فارسی استاد کی حیثیت سے درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ 'بزم شعرائے اورنگ آباد' قائم کر کے ماہانہ مشاعروں کا نہ صرف اہتمام کیا بلکہ، مشاعروں میں پڑھے جانے والے منتخب کلام کے لیے گلدستے شائع کیے۔

مہاراجا سرکشن پرشاد شاد کی اورنگ آباد آمد پر مولوی عبدالحق نے ان کے اعزاز میں جس خصوصی طرحی مشاعرے کا اہتمام کیا تھا اس کے انعقاد کی ذمہ داری محوی صدیقی کو سونپی گئی۔ محوی صدیقی کے باغ میں منعقدہ اس شاہی مشاعرہ کی رپورٹ تیار کر کے رسالہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد میں شائع کی۔ 1930 سے 1947 تک وہ مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ اردو، فارسی اور اسلامک اسٹڈیز سے بہ حیثیت استاد وابستہ رہے۔

مولوی عبدالحق، محوی صدیقی کی ہمہ جہت علمی، ادبی، شعری اور انتظامی خدمات کے معترف و مداح تھے۔ ان کے اورنگ آباد سے مدراس چلے جانے کا انھیں جہاں افسوس تھا وہیں وہ اس امکان سے بھی خوش تھے کہ محوی صدیقی کی مساعی سے مدراس میں اردو زبان و ادب کی ترقی کی راہیں ہموار ہوں گی اور سازگار ماحول پیدا ہو سکے گا۔

مدراس جانے کے بعد مولوی عبدالحق اور محوی صدیقی کے مابین خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ بیشتر خطوط اب دستیاب نہیں ہیں البتہ مولوی عبدالحق کا 12 جنوری 1949 کو محوی صدیقی صاحب کے نام بھوپال سے لکھا گیا خط اس لیے نقل کیا جا رہا ہے تاکہ ان دو حضرات کے مابین تعلق خاطر کی نوعیت کا اندازہ لگایا جا سکے:

"حسن منزل، ابراہیم پورہ بھوپال

12 جنوری 1949

مشفقی محوی صاحب، السلام علیکم

کراچی سے دو خط لکھے، ایک کا بھی جواب نہ ملا۔ معلوم نہیں وہ پہنچے بھی یا نہیں۔ آج کل چار روز سے بھوپال میں ہوں۔ تین مہینے سے دلی میں تھا۔ دلی سے یہاں آیا۔ یہاں سے بمبئی اور بمبئی سے پانی کے جہاز سے کراچی چلا جاؤں گا...... بھوپال میں یہ دن بہت بری طرح کٹ رہے ہیں۔ آپ بہت یاد آ رہے ہیں...... محمد امین بھی نہیں ہیں۔ دلی آئے تھے، تین چار روز رہ کر، علی گڑھ چلے گئے اور کہہ گئے تھے کہ جلد واپس آ جاؤں گا۔ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ اس کا مواد جمع کرنے گئے تھے، اس میں دیر لگ گئی۔ رہ گئے ایک گوڑوں گوں ڈاکٹر تیموری، وہ اسٹیشن پر بھی آئے اور مکان پر بھی...... وہ کلکتہ جا رہے ہیں۔ کہتے تھے 14 یا 15 تک واپس آ جاؤں گا۔ اس وقت تک رہا تو ملاقات ہو جائے گی ورنہ خدا کے حوالے۔

صبح، شام سیر کو حسب معمول جاتا ہوں۔ شام کے وقت مسعود صاحب ہو لیتے تھے، کل وہ بھی کانپور چلے گئے۔ اب میرے ساتھ صرف اللہ میاں رہ گئے ہیں۔ دیکھیں یہ کب تک ساتھ دیتے ہیں۔

خیر طلب: عبدالحق

مدراس یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد، علامہ محوی صدیقی نے بھوپال آ کر مستقل سکونت اختیار کر کے تخلیق و ترویج زبان و ادب کے سلسلے کو جاری رکھا۔ 'معیار ادب' کے نام سے انجمن بنائی۔ ان کے شاگرد بڑی تعداد میں ملک کے طول و عرض میں مقیم تھے۔ وہ بذریعہ خطوط ان کے کلام پر اصلاح دیتے رہے۔

انھوں نے معیار ادب بک ڈپو کے نام سے ایک ادارہ قائم کر کے رسالہ اور کتابیں شائع کیں۔ ان کا نجی کتب خانہ بھی تھا جس میں وقیع ادبی رسائل، کتب اور مخطوطات محفوظ تھے۔ وہ اپنے عصر کے ایسے عالم،

ادیب اور استاد شاعر تھے جن سے بھوپال اور بیرون بھوپال کے شعرا و ادبا علمی ادبی امور میں مشاورت کر کے اکتسابِ فیض کرتے تھے۔ محوی صاحب، شوق قدوائی کے شاگرد تھے۔ علامہ محوی صدیقی نے بنیادی طور پر حمد و نعت و منقبت کے علاوہ غزلیات، منظومات، رباعیات بھی تخلیق کیں اور بچوں کے لیے مذہبی، اخلاقی اور تاریخی نوعیت کی کہانیاں اور نظمیں بھی لکھیں۔ عربی، فارسی ادب کے فن پاروں کے تراجم بھی شائع کیے۔

لغت نویسی، ادبی رسائل کی ادارت اور زبان و ادب کی تدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔ تلامذہ کے کلام پر اصلاحیں بھی کیں۔ غرض کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ زبان و ادب کی خدمت میں صرف ہوا۔ ان کی ہمہ جہت علمی، ادبی خدمات کے اعتراف میں مرکزی حکومت ہند نے 1955 میں تاحیات وظیفہ جاری کیا۔ 19 نومبر 1975 کو بھوپال میں ان کا انتقال ہوا اور شاہی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ محوی صدیقی کثیر التعداد ادبی کتب کے مصنف تھے لیکن ان کے کلام کے دیوان سمیت 18 (اٹھارہ) مسودات ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کی مطبوعہ کتب میں 'نغمۂ فردوس'، (نعتیہ کلام 1968)، 'آبشار' (مجموعۂ رباعیات 1971)، 'ہمارے حضرتؐ' (سیرت رسولؐ)، 'بالک باغ' (بچوں کے لیے نظمیں 1976)، 'اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں' (حصہ اول و دوم)، 'پارۂ عمّ' کا سلیس اردو ترجمہ، 'روحی فداک'، 'ازواج الانبیاء'، 'حرز یمانی' (دعائے سیفی کا اردو ترجمہ)، 'واقعات اظفری'، 'دیوانِ اظفری'، 'دیوانِ بیدار'، 'کلیاتِ ابجدی' (حصہ اول، دوم، سوم) 'ہوائی گھوڑا'، 'خوش نصیب کاہل'، 'طلسمی تھیلی'، اور 'شاعر کا دل' (طویل نظم) وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

استاد شاعر محوی صدیقی کو نعت گوئی سے خاص مناسبت تھی۔ ان کے نعتیہ کلام کا پہلا مجموعہ علوی برقی پریس، بھوپال میں طبع ہو کر معیار ادب بک ڈپو، بھوپال سے شائع ہوا تھا جس کا انتساب نہایت ادب و عقیدت کے ساتھ بہ حضور رسالت مآب محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ کے نام نامی کیا گیا تھا۔ اس مجموعے میں حمد کے علاوہ 42 نعتیہ نظمیں، خمسے اور رباعیات شامل ہیں۔

قادرالکلامی، زباں دانی اور فنی پختگی کے ساتھ ساتھ آیات قرآنی اور صحیح روایاتِ حدیث کا ہر ہر مقام پر پورا پورا التزام کیا ہے۔ اندازِ بیان میں جدت اور ندرت پیدا کی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ،

باخدا دیوانہ باش اور بہ محمدؐ ہوشیار

کا حدِ امکان لحاظ رکھا ہے اور یہ کوئی آسان بات نہیں۔''

اردو میں رباعی گو شعرا کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ علامہ محوی صدیقی کا شمار اردو کے اہم رباعی گو شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے مجموعۂ رباعیات، 'آبشار' میں مختلف دینی، اخلاقی، عشقیہ، متصوفانہ اور زندگی اور سماج سے متعلق مختلف موضوعات پر کہی گئیں 280 رباعیات شامل ہیں۔ بیشتر اردو رباعی گو شعرا نے رباعی کے مروجہ ایک دو مخصوص اوزان پر ہی اکتفا کیا ہے جب کہ علامہ محوی صدیقی نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر رباعی کے کئی اوزان و ارکان میں اپنے فنکارانہ کمالات کا اظہار رواں اور پر اثر انداز میں کیا ہے۔ حمد و نعت کے علاوہ دیگر موضوعات سے متعلق ان کی چند رباعیات بطور نمونہ پیش ہیں۔

عظمتِ اسلاف

آگاہ نہیں عظمت، اسلاف سے تم
بے گانہ بزرگوں کے ہو اوصاف سے تم
بربادیٔ دولت کا سبب خود ہو، جبھی
محروم ہو اللہ کے الطاف سے تم!

خودغرضی

انسان بدل گیا ہے کتنا یا رب
چھوٹوں پہ نہ شفقت، نہ بزرگوں کا ادب
ہے پیشِ نگاہ صرف اپنا مطلب
نازل نہ ہوں کیوں پھر یہ بلا اور غضب

علامہ محوی صدیقی سن رسیدہ اشخاص کے ہی شاعر نہیں تھے، بچوں کے بھی باکمال شاعر تھے۔ بچوں کی عمر، مشاغل اور نفسیات پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ نونہالانِ قوم کو وہ ملک کے روشن مستقبل کا معمار متصور کرتے تھے۔ وہ انھیں محب وطن، قوم پرست، بااخلاق، باکردار اور باعمل انسان بنانا چاہتے تھے چنانچہ ان ہی مقاصد کے حصول کی خاطر انھوں نے بچوں کے لیے بے شمار اخلاقی، مذہبی، اصلاحی، معلوماتی اور سبق آموز نظمیں تخلیق کی تھیں جن میں سے 72 نظموں کا انتخاب 'بالک باغ' کے نام سے ان کے فرزند منیر المحوی صدیقی نے 1976 میں مجموعے کے بہ طور شائع کیا جس میں مرتب منیر المحوی کا تحریر کردہ پیش لفظ اور پروفیسر عبدالقوی دسنوی کا مقدمہ بعنوان 'مولانا محوی صدیقی بچوں کے شاعر' شامل ہے۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی، محوی صدیقی کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا محوی صدیقی مرحوم کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے زبان و ادب کی خدمت کو اپنی زندگی کا اہم ترین مقصد بنا لیا تھا۔۔ ان کے خوانِ ادب سے بوڑھوں نے ذہنی غذائیں حاصل کیں۔ نوجوان سرشار ہوئے۔ بچوں کا دل بہلایا...... انھوں نے کہانیوں کے مقابلے میں بچوں کے لیے نظمیں زیادہ چھوڑی ہیں اس لیے کہ ان کے اندر نثر نگار کے مقابلے میں شاعر زیادہ قدآور تھا...... مولانا محوی صدیقی نے بچوں کے لیے جتنی نظمیں کہی ہیں ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بچوں کے مزاج داں تھے...... بچوں کے ساتھ ہنستے ہنساتے، چلتے، پھرتے، کھیلوں میں حصہ لیتے، چمن زاروں کی سیر کرتے، برسات میں بھیگتے...... تتلی کے پیچھے دوڑتے...... چاند کو حیرت سے تکتے، والدین سے بھولے بھالے سوالات کرتے نظر آتے ہیں، کبھی وہ شاعر کا روپ اختیار کرتے ہیں، کبھی ماں باپ بن کر سامنے آتے ہیں اور کبھی خود بچہ بن جاتے ہیں...... اردو میں جب بھی بچوں کے ادب کا جائزہ لیا جائے گا مولانا محوی صدیقی کو نمایاں جگہ دی جائے گی۔''

علامہ محوی صدیقی نے بچوں سے متعلق اپنی شاعری کے آغاز و اسباب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مجھے بھی اس صنفِ خاص کی طرف اپنی شاعری کے دورِ آغاز میں کوئی التفات نہ تھا...... صرف ابتدا میں 1910 میں لاہور سے ہفتہ وار رسالہ 'نونہال' نکلا۔ اس کے مدیر کی فرمائش پر کبھی کبھی اسلامی، تاریخی کہانیاں لکھتا رہا...... بچوں کے لیے نظم کہنے کا خیال بھی مدیر

'نونہال' ہی کی فرمائش واصرار پر ہوا اور پہلی نظم خاص بچوں کے لیے 'لوعید آئی' حوالۂ قلم ہوئی...1928-29 میں مخدومی مولانا عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو نے اردو ریڈروں کا کام شروع فرمایا اور خوش نصیبی سے اس مفید کام میں میری بھی شرکت رہی۔ اس ضرورت سے کئی نظمیں اور مضامین لکھنے کا اتفاق ہوا......

اس اثنا میں جامعہ ملیہ سے 'پیامِ تعلیم' اور دہلی سے 'ہونہار' نام کے بچوں کے رسالے نکلے۔ مدراس میں کہی ہوئی نظمیں زیادہ تر انہی کے لیے کہی ہیں اور بچیوں کی نظمیں زیادہ تر محبی جناب رزاق الخیری صاحب، مدیر 'بنات' دہلی کے ارشادات کا حاصل ہیں۔

یہ ہے داستان ان نظموں کی، جن کا مجموعہ آپ کے سامنے ہے، جنھیں میں نہایت مسرت کے ساتھ اپنی قوم وطن کے نونہالوں کے لیے کتابی صورت میں پیش کررہا ہوں۔'' (ماخوذ: 'مصنف کی گزارش' مشمولہ 'بالک باغ')

لیکن باوجود مذکورہ بالا مجموعہ اس وقت شائع نہ ہوسکا۔ 29 سال بعد اسے محوی صدیقی کے فرزند منیر المحوی نے دسمبر 1976 میں معیار ادب بک ڈپو، بھوپال سے شائع کیا جسے ادبی حلقوں میں نہ صرف پسند کیا گیا بلکہ اس کی کئی نظموں کو درسی کتب میں بھی شامل کیا جاتا رہا ہے۔ 'بالک باغ' کی نظموں میں خدا تعالی کی حمد و ثنا، رسول اللہؐ سے محبت وعقیدت، ملک وطن سے لگاؤ، والدین کا احترام، محنت و خدمت کا جذبہ، تہواروں، موسموں، قدرتی مناظر، پھل پھول، پرندوں، کھیل کود کا ذکر، سچائی، نیکی، خوش اخلاقی کی تلقین، سادہ، رواں زبان اور پراثر انداز میں کی گئی ہے۔

علامہ محوی صدیقی نے بعض نظموں میں مکالمہ طرازی سے کام لے کر بچوں کے تجسس اور استفسارانہ فطرت ونفسیات کو دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ تین حصوں پر مشتمل طویل نظم 'چاند کو دیکھ کر' بچے کے دل میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں تو وہ اپنی ماں سے پوچھتا ہے:

(1) 'بچہ پوچھتا ہے'

یہ جو آسماں پہ آتا — سرِ شام جگمگاتا
چمک اپنی ہے دکھاتا — مرے دل کو ہے لبھاتا
مجھے دور سے بلاتا
یہ ہے کس کا چاند اماں؟
یہ ہے موہنی جو مورت — یہ چمک، دمک، یہ رنگت
یہ ہے کیسا خوب صورت — مجھے اس سے ہے محبت
مجھے اس کی ہے ضرورت
یہ ہے کس کا چاند اماں؟
مجھے تم یہ چاند لادو — مجھے پاس سے دکھادو
مجھے اس سے تم ملادو — مرے پاس اسے بلادو
یہ نہیں تو پھر بتادو
یہ ہے کس کا چاند اماں؟

(2) 'ماں کا جواب'

میں بتاؤں تم کو پیارے — مری جاں، مرے دلارے
یہ ہے چاند آسماں کا — یہ خدا نے ہے بنایا
یہ نہیں زمیں پر آتا — مرا چاند یہ نہیں ہے
یہ وہ کام کررہا ہے — جو اسے دیا گیا ہے
کبھی جی نہیں چراتا — کبھی منہ نہیں چھپاتا
نہ یہ وقت کو گنواتا
مرا چاند یہ نہیں ہے

بچوں کے لیے کہی گئیں محوی صدیقی کی نظموں کی طرح ان کی کہانیاں بھی سلیس ورواں زبان اور دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہیں۔ علامہ محوی صدیقی بنیادی طور پر غزل، رباعی اور نظم کے شاعر تھے۔ ان کا تخلیقی سفر طویل عرصے کو محیط ہے۔ ان کا کلام مؤقر ادبی رسائل وجرائد میں شائع ہوتا رہا لیکن دیوان کی اشاعت نہ ہونے کے سبب ان کا شعری سرمایہ یکجا ہوکر سامنے نہیں آسکا ہے۔ ان کے بیٹے منیر المحوی صدیقی نے راقم الحروف کی زیرنگرانی پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ قلمبند کیا تھا جس پر انھیں برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی تھی لیکن وہ تحقیقی مقالہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

محوی صدیقی مرحوم کے کلام کے جو نمونے مختلف رسائل میں ملتے ہیں ان کے مطالعے سے ان کی قادرالکلامی، زباں دانی، فنِ عروض پر دسترس اور علمی بصیرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ کلاسیکی طرز کے شاعر تھے لیکن جدتِ فکروخیال اور ندرتِ ادا ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

پھر امتحانِ محنتِ مرداں ہے آج کل
بیدار جب سے عظمتِ انساں ہے آج کل
اس انقلابِ وقت کا محوی نہ دے جو ساتھ
ننگ سخن وری، وہ سخن داں ہے آج کل

کچھ اور چارۂ غمِ پنہاں بتائیے
یہ تو محال ہے کہ انھیں بھول جائیے

محوی صدیقی کی غزلوں اور رباعیوں میں جس طرح سچے جذبات واحساسات کی عکاسی ملتی ہے اسی طرح ان کی نظمیں بھی مقصدی اور اصلاحی رنگ کی حامل ہیں۔ اس ضمن میں نظم 'جہانِ نو' کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

آ کہ اے ہم دم کچھ ایسے نوجواں پیدا کریں
جو تنِ مردہ میں روحِ بے کراں پیدا کریں
جو نظر میں ہیچ کردیں، وسعتیں کونین کی
جو پروں میں عزمِ سیرِ لامکاں پیدا کریں
آندھیوں میں بھی نہ بجھنے دیں چراغِ آرزو
بجلیوں سے اپنا اپنا آشیاں پیدا کریں

زبان وادب کے تئیں علامہ محوی صدیقی کی تخلیقات کی ان چند مثالوں اور پیش کردہ صلاحیتوں ہی سے ان کی ہمہ جہت، وقیع علمی، ادبی، تعلیمی، تدریسی، انتظامی صلاحیتوں اور شاعرانہ قادرالکلامی کا نہ صرف اندازہ ہوجاتا ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہوجاتا ہے کہ وہ ایک لائق استاد، باکمال شاعر وادیب، لغت نویس، ادبی صحافی، مترجم، باعمل انسان ہی نہیں سچے عاشقِ زبان اردو بھی تھے کہ انھوں نے ایک مقصد خاص کے تحت اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ زبان وادب کی خدمت اور ترویج و اشاعت میں صرف کردیا تھا۔

■

Prof. Mohammad Noman Khan
204, Gulshan-e-Desnavi
Green Valley, Airport Road
Bhopal- 462030 (MP)
mnkhanncert@gmail.com

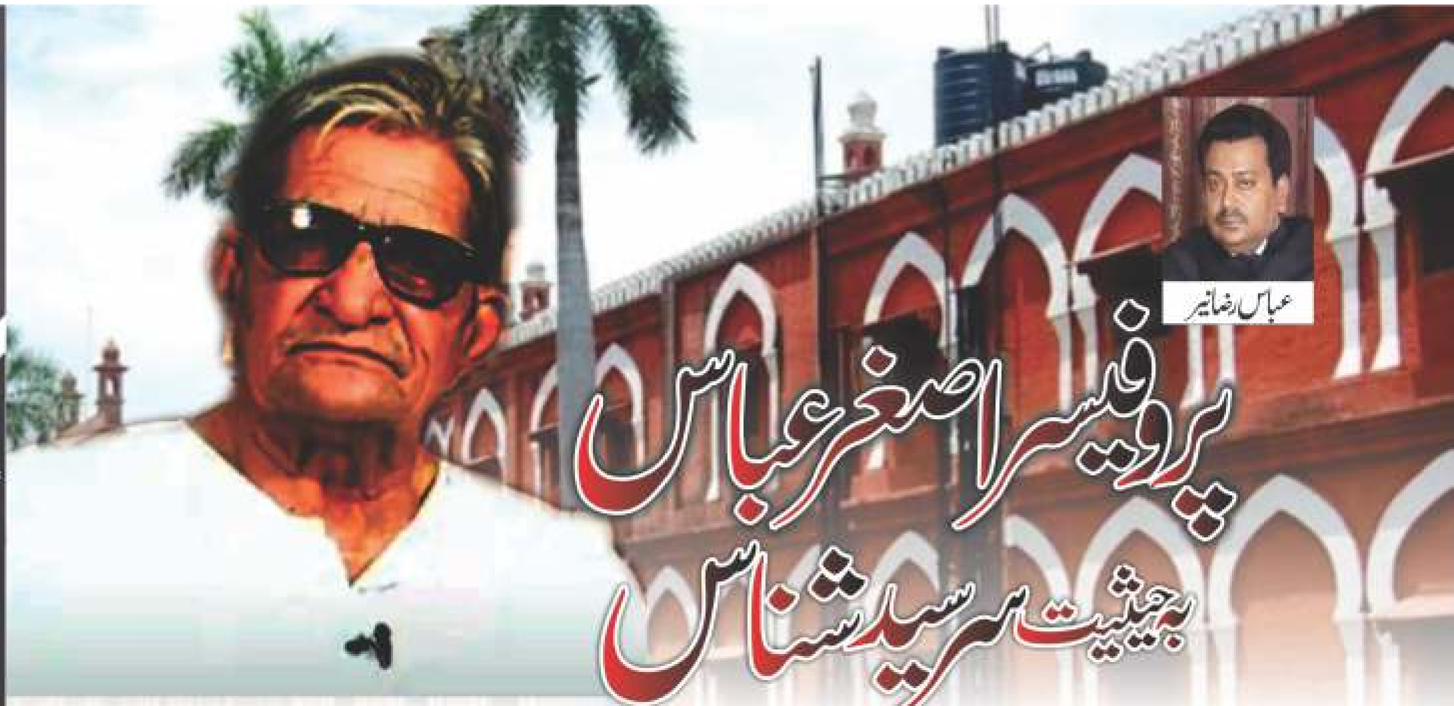

عباس رضا نیر

پروفیسر اصغر عباس
بہ حیثیت سرسید شناس

گلشن اردو ادب کو سرسبز بنانے میں مختلف مزاجوں، رویوں اور فکروں کا تعاون رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے دامن میں منظومات اور ادب لطیف کی ترجمان منثورات کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اردو کی سرزمین کو وسعت دینے والے بزرگوں کا شکریہ جنھوں نے اس کے ادب کو ہمہ گیری کا سبق پڑھادیا اور تحقیق، تنقید، تدوین و ترتیب کے تئیں پختہ شعور بیدار کیا۔ بزرگوں کی اسی روایت کو مزید فروغ دینے والوں میں پروفیسر اصغر عباس کا نام بہت نمایاں ہے۔ جنھوں نے اپنی تحریوں میں متانت، بالیدگی اور خلوص کو مدنظر رکھتے ہوئے کارہائے گراں انجام دیے۔ ان کی شخصیت کے کئی ایسے پہلو ہیں جو سندی تحقیق کا تقاضا کرتے ہیں۔ جن کا یہاں پر صرف سرسری جائزہ ہی لیا جاسکتا ہے البتہ ان کے تعارف میں یہ بات پورے اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ اصغر عباس ایک بہترین استاد، کامیاب محقق، ایمان دار صحافی اور ہر دل عزیز کالم نگار کے علاوہ 'ماہر سرسید' کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔

اصغر عباس کی ولادت 19 اکتوبر 1941 کو اعظم گڑھ (اُتر پردیش) کے قصبہ بی بی پور میں ہوئی۔ ان کا انتقال 7 ستمبر 2022 کو علی گڑھ میں ہوا۔ ان کی علمی، ادبی اور تحقیقی خدمات کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر بہت سراہا گیا ہے۔

پروفیسر اصغر عباس نے سرسید پر کئی تحقیقی کتابیں اور مقالے لکھے جن میں 'سرسید کی صحافت' خاص طور پر معروف ہے، جس کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ یہ کتاب دراصل اصغر عباس کا سندی تحقیقی مقالہ ہے، جو پروفیسر آل احمد سرور کے زیر نگرانی 1971 میں مرتب کیا گیا۔ اس میں سرسید کی صحافتی خدمات اور ان کی صحافت نگاری کے معیار کو جانچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ تحقیقی کام 1866 تا 1897 کے گزٹ کی فائلوں کو محیط ہے۔ کتاب کے معائنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اطمنان بخش مواد کی دستیابی میں محقق نے بڑی جفاکشی سے کام لیا ہوگا کیونکہ ان کو اس کام کی سنجیدگی کا خوب اندازہ تھا جس میں ان کو تین اہم عناصر سرسید کا ذہنی رویہ، صحافت کا مزاج اور معاصر عہد کو خصوصی توجہ دیتے ہوئے کوئی رائے قائم کرنی تھی تاکہ تینوں منتشر کڑیوں میں منطقی ربط پیدا ہوجائے اور سرسید کے انقلاب آفریں اقدامات کی وقعت دلنشیں ہوسکے۔ اس حوالے سے ایک جگہ اصغر عباس رقم طراز ہیں:

''سرسید ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے، ان کے کارناموں کی داستان کا ایک ورق ان کی صحافت بھی ہے۔ اردو صحافت کی تاریخ میں سرسید کی شخصیت کئی اعتبارات سے ممتاز و منفرد ہے اور اس کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ غدر کے بعد اپنے تمام ہمعصر صحافیوں کے مقابلے میں سرسید اور ان کے گزٹ نے سب سے زیادہ زندگی کو نئے طریقہ اور ناقدانہ نظر سے دیکھنا سکھایا اور انگریزی صحافت کے صالح عناصر کا اثر قبول کرکے فکر و شعور کی نئی راہیں متعین کیں اور صحافتی آداب اور اس میں توازن و تناسب کی مثال قائم کی۔ گزٹ نے اس دور کی مشترکہ تہذیب کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور ایک نازک دور میں جب مغرب کا طوفان اس کی کشتی کو زیر وزبر کررہا تھا، اس کو نئی سمتوں اور نئے ساحلوں سے آشنا کیا۔ لیکن ابھی تک گزٹ کی خدمات اور اس کے اثرات کا کوئی خاطر خواہ تجزیہ نہیں ہوا ہے۔ اس سلسلے میں جو مواد ملتا ہے اس میں حالی کے بیانات کے اعادے پر اکتفا کیا گیا ہے''1

اصغر عباس نے اپنے اس تحقیقی کارنامہ کے ذریعہ سرسید، گزٹ اور صحافت کا جائزہ لیتے ہوئے عصری تقاضوں کے پیش نظر جدید صحافت کا بانی سرسید کو تسلیم کیا ہے۔ اصغر عباس کے اس نظریہ کو تقویت دینے والے ان کے وہ دلائل اور بیانات ہیں جن سے ان کی کتاب 'سرسید کی صحافت' تشکیل پاتی ہے۔ اسی کتاب سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جو سرسید کے صحافتی ذہن کی جدت کو اجاگر کرتا ہے:

''گزٹ سے پہلے اردو میں صحافت کا باقاعدہ آغاز ہوچکا تھا اور اس نے ایک روایت کی شکل اختیار کرلی تھی لیکن جو عناصر صحافت کو باوزن اور معنی خیز بناتے ہیں وہ گزٹ سے پہلے کی صحافت میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ گزٹ سے پہلے کی صحافت میں نہ تو کسی منظم زاویۂ نظر کے نشانات ملتے ہیں، نہ واضح طور پر کسی تہذیبی یا فکری یا سماجی نقطۂ نظر کی ترجمانی کا پتہ چلتا ہے اور نہ صحافیوں میں فنِ صحافت سے ذوق و انہماک ملتا ہے''2

اس کتاب میں کل آٹھ ابواب ہیں جن میں باب ہشتم 'اردو صحافت پر گزٹ کے اثرات' کافی اہم ہے، گویا یہ باب اصغر عباس کی پوری تحقیق کا نچوڑ ہے جس میں قاری کو رد و قبول کے پس وپیش سے اطمینان کا احساس ہوتا ہے کہ سرسید ہندوستانی صحافت کے بھی سید و سردار ہیں۔

سرسید کی فکری یا عملی کوششوں کے سبب انھیں سماج میں مؤثر اور انقلاب آوریں سمجھا جاتا ہے، اصغر عباس

نے ان ہی پہلوؤں کو اپنا خاص موضوع بنایا ہے۔ سرسید کی خدمات میں سائنٹفک سوسائٹی کو کبھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا جس نے غلام ملک کی ذہنیت ہی بدل کر رکھ دی۔ لہٰذا اصغرعباس نے 'سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی' مرتب کرکے اس پہلو کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا۔

یہ کتاب سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کی 38 روداووں پر مشتمل سوسائٹی کی تاریخ ہے جس کو اصغر عباس نے ڈیڑھ سو برس بعد پہلی مرتبہ مرتب کرکے شائع کرنے کا اہم کارنامہ انجام دیا جس سے اردو دنیا سرسید اور سائنٹفک سوسائٹی کی اصل روح سے روبرو ہوسکتی ہے۔ کتاب کے آغاز میں مرتب کا تحریر کردہ ایک مضمون 'شروع کی بات' اپنی تحقیقی معلومات کے اعتبار سے کافی اہم ثابت ہوتا ہے۔ اصغرعباس نے یہ تحقیقی کارنامہ انجام دینے میں بڑی جدوجہد کا ثبوت دیا ہے۔ مواد کی فراہمی کے لیے انھوں نے نیشنل اور انٹرنیشنل کتب خانوں کی تلاش کی ہے۔ تاکہ ملک سرسید کے نقطۂ نظر اور سوسائٹی کے حقیقی مقصد کو سمجھ سکے۔ جیسا کہ اصغرعباس خود ایک غلط فہمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کا ازالہ کرتے ہیں:

''سائنٹفک سوسائٹی کے کوائف سے عدم واقفیت کے سبب فاضلوں نے 1842 کی دہلی ورنا کیولر ٹرانس لیشن سوسائٹی کی طرح اسے بھی ایک ترجمہ کا بیورو سمجھ لیا ہے۔ دراصل یہ سوسائٹی ہندوستان کی فلاح و بہبود، معاشی خوش حالی، عام روشن ضمیری پھیلانے، سائنسی سوچ اور سائنسی تجسس کی ایک نئی لہر پیدا کرنے کے لیے افراد کے ایک منظم اور مسلسل باہمی تعاون پر مشتمل ایک تنظیم تھی۔''3

پروفیسر اصغرعباس کی یہ مذکورہ کتاب محض ایک روایتی کام نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ مرتب نے سوسائٹی کے محدود تصور پر ضرب لگاتے ہوئے اس کے وسیع تناظر کو پیش کیا ہے۔ اس میں جمع کی گئی روداویں دراصل حقائق کو بیان کرتی ایسی تحریریں ہیں جن کے توسط سے صرف سرسید یا سوسائٹی کو ہی نہیں بلکہ انیسویں صدی کے نصف آخر کے ہندوستان کو بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ اسی کتاب کے مقدمہ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جو ہمارے اندر ان روداووں کا مطالعہ کرنے کا جذبہ ابھارتا ہے:

''بجنور سے 1859 میں جب ان کا تبادلہ مراد آباد ہوا تو یہ شہر انھیں جراحتوں سے چور ملا اور قیاس ہے کہ یہیں انھوں نے نشاۃ ثانیہ کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا۔ 12 مئی 1862 کو ان کا تبادلہ غازی پور ہوگیا۔ یہ گنگا کے دامن میں بسا ہوا ایک آہستہ خرام طرز زندگی کا عادی اور سہما ہوا شہر تھا، یہاں افیون کی کشید اور گلاب کی کاشت ہوتی تھی۔ یہاں کی اس مایوس کن صورت حال کو بدلنے کے لیے ان کی تشویشات کا مرکزی عنصر یہیں عصری تعلیم ہوگئی۔ غازی پور میں انھوں نے ایک رسالہ 'التماس بخدمت ساکنان ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند' لکھا۔ یہیں سے جدید تعلیم کی

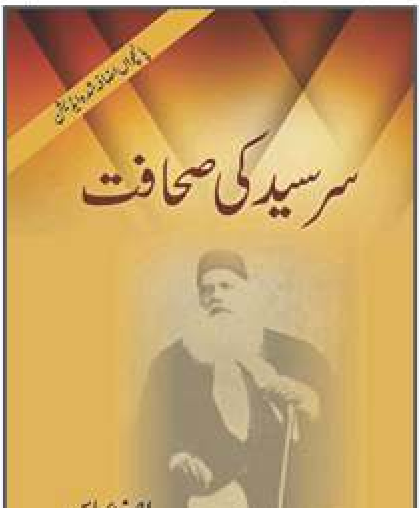

ترتیب کاری کے لیے انھوں نے ہندوستان کی راجدھانی کلکتہ کا پہلا سفر کیا۔ وہاں مولوی عبداللطیف کی سربراہی میں چلنے والی انجمن مذاکرہ علمیہ کلکتہ میں 16 اکتوبر 1863 کو عصری تعلیم کی ضرورت پر تقریر کی جس سے ان کے دلی کرب و ہیجان کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے مذکورہ بالا رسالہ وہاں تقسیم کیا، اس کے علاوہ اپنے دوستوں اور صاحب الرائے افراد کو بھیجا۔ اس کا تو پتہ نہیں چلا کہ ان سب کے کیا جوابات آئے لیکن چند جوابات سوسائٹی کی روئداد میں موجود ہیں۔ یہی رسالہ سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کی تمہید بن گیا۔''4

مذکورہ اقتباس میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان کی روشنی میں اس کتاب کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ روداویں محض تفریح طبع کا سامان نہیں بلکہ اپنے عہد میں رونما فکری و عملی رویوں کی ایسی تاریخ یا بنیادی ماخذ ہیں جن کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ خود اصغرعباس کو بھی اس بات کا اعتراف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ دلچسپ بات ہے کہ سوائے سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے انیسویں صدی کے ہندوستان کی کوئی سوسائٹی ایسی نہیں جس کی مکمل تاریخ دستیاب ہو۔ یہ روئدادوں کا مجموعہ نہیں گلدستۂ دانش ہے''5

اصغرعباس نے اپنے تحقیقی عمل کا جو لائحہ عمل مرتب کیا تھا اس میں سرسید سے وابستہ ہر گوشے کا جائزہ لینا بنیادی مقصد تھا۔ سائنٹفک سوسائٹی تو ایک پلیٹ فارم تھا جس کے تحت سرسید نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا کام کیا اور ان کے رفقا نے پوری سنجیدگی سے اقدامات کیے۔ اس سوسائٹی اور سرسید کے نظریات کی تشہیر کے لیے اس پلیٹ فارم سے ایک اخبار 'انسٹی ٹیوٹ گزٹ' بھی جاری کیا گیا تھا جس نے ملک کے اذہان بدل کر رکھ دیے اور منفی سوچ کو مثبت رنگ عطا کیا۔ اس اخبار میں سرسید نے جو آرٹیکل لکھے ان کو جمع کرنے کی متعدد بار کوششیں کی گئیں لیکن کوئی امید افزا نتیجہ برآمد نہ ہوا، لہٰذا پروفیسر اصغرعباس نے پہلی بار پورے اہتمام کے ساتھ گزٹ میں شائع ہونے والے سرسید کے مضامین کو 'انتخاب مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کے نام سے شائع کیا۔ ان مضامین کی اہمیت اس لیے اور بڑھ جاتی ہے کہ ان میں علی گڑھ تحریک کے ابتدائی نقوش نمایاں ہیں۔ اصغرعباس ان مضامین کی افادیت کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''سرسید کے جرائد کا ذکر آتا ہے تو عام طور سے تہذیب الاخلاق کا ذکر ہوتا ہے گزٹ کو نظرانداز کردیا جاتا ہے، حالانکہ اسے تہذیب الاخلاق کا تاریخی تقدم بھی حاصل ہے اس کے علاوہ یہ سرسید کے فکر و عمل کا بڑا حسین نگارخانہ ہے جس میں بیس برس کے ہندوستانی سماج کی لحظہ لحظہ تاریخ سموئی ہوئی ہے۔ یہ وہ پہلا اخبار ہے جس نے ہندوستانیوں کے اجتماعی طرز کو اپنی صحافت کا حوالہ بنایا ہے۔ اسی اخبار کے ذریعہ سرسید کبھی ہندوستانیوں کو سیاسی آداب سے آگاہ کرتے ہیں کبھی مل جل کر رہنے کے فوائد ذہن نشین کراتے ہیں، کبھی مفید صحافت کے اصول بتاتے ہیں کبھی ابدی اور ہنگامی قدروں کے آداب و رنگ کو ظاہر کرتے ہیں اور گزٹ میں کبھی ان کا پیغمبرانہ اضطراب ہماری توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔''6

اصغرعباس کے اس انتخاب کردہ مجموعہ سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ اس عہد کو سرسید یا گزٹ کے مضامین

سے کس طرح سے سیاسی، سماجی اور تعلیمی مسائل میں رہنمائی حاصل ہوئی اور ذہنی وفکری آزادی کا رویہ پیدا ہوا۔اس اعتبار سے مضامین کا یہ مجموعہ براہ راست متنوع معلومات کا صحافتی سرچشمہ ہے۔

اردو ادب میں جب سرسید کا ذکر آتا ہے تو ان کے دوررس اثرات میں افادیت، مقصدیت اور سادگی کی طرف ذہن جاتا ہے۔ یہ اجزا ادب لطیف یا رومانیت کا ردعمل ہیں۔ حالانکہ سرسید کی ابتدائی تحریریں ادب لطیف کا عمدہ نمونہ ہیں۔ جن میں ان کی کتاب 'آثار الصنادید' اور مضمون 'امید کی خوشی' قابل ذکر ہیں۔ سرسید کے شروعاتی دنوں کا یہ طرز تحریر اور علی گڑھ تحریک کا ردعمل ہی ہے جس نے اصغرعباس کو اردو ادب کا جمالیاتی ادب اور علی گڑھ جیسی کتاب لکھنے پر متوجہ کیا۔ پروفیسر اصغرعباس خود اس بات کے معترف نظر آتے ہیں:

''ویسے تو سرسید کا نام ادب لطیف یا جمالیاتی طرز کے قلمکاروں کے زمرہ میں شامل نہیں ہے لیکن ادب لطیف کی تحریک کے پس منظر میں ان کا تذکرہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا اس قبیل کے دوسرے ادیبوں کا''7

اصغرعباس کی اس تصنیف کے ذریعہ دو فکری زاویوں میں تناؤ کم ہوجاتا ہے۔ اگرچہ اصغرعباس نے سرسید کو جمالیاتی ادیب کہنے سے صاف انکار کیا ہے لیکن انھوں نے سرسید میں بھی جمالیاتی حس کے عناصر کی طرف اشارہ کیا۔ جس کا مقصد سرسید کی ہمہ گیری دکھانا ہے۔ چونکہ ان کے بہت سے رفقا نے ادب لطیف کو فروغ دیا اس لیے وہ سرسید اور ان کے جمالیاتی رفقا کے مابین فکری ربط پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس اعتبار سے یہ ایک قابل ستائش تصنیف ہے۔

دو مکتب فکر سے وابستہ افراد کے مابین ربط پیدا کرنے کا جذبہ ہی تھا کہ اصغرعباس نے ایک دوسری کتاب 'سرسید، اقبال اور علی گڑھ' لکھی۔ جو سرسید اور اقبال کو باہم جوڑنے کا کام ہی نہیں کرتی بلکہ یہ کتاب اقبالیات کے مطالعہ میں گراں قدر خزانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں اقبال اور علی گڑھ کے تعلق کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس میں اقبال کے استاد کے کردار کو بھی نمایاں کیا گیا۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''سرسید اور علی گڑھ سے اقبال کی ابتدائی شناسائی اقبال کے استاد میر حسن کی وساطت سے ہوئی''8

اصغرعباس ایک دوسری جگہ سرسید کی شخصی جاذبیت اور میر حسن کی عقیدت کا خلاصہ کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''افکار نو کے فروغ کے لیے سرسید نے چار مرتبہ پنجاب کا سفر کیا.. اسی زمانے میں سارا پنجاب سرسید کی آواز پر اس طرح دوڑا جیسے پیاسا پانی کے لیے دوڑتا ہے ان میں اقبال کے اُستاد سید میر حسن بھی تھے''9

اس کتاب میں اصغرعباس نے سرسید سے میر حسن اور ان کے صاحب زادے ہی نہیں بلکہ پورے پنجاب کی عقیدت کو دکھاتے ہوئے اس بات کا اشارہ دیا ہے کہ اقبال کی نشونما میں سرسید تحریک کا کسی نہ کسی نوع سے اثر رہا ہے کیونکہ یہ ایک نفسیاتی عمل ہے کہ جس فکر یا رویے سے استاد متاثر ہوتا ہے عموماً شاگرد بھی اس کی قدر کرتا ہے۔ اس حوالے سے اصغرعباس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں ہمارے اس خیال کی تائید کی گئی ہے:

''27مارچ 1897 کو جب سرسید نے رحلت فرمائی تو سید میر حسن کی ایما سے اقبال نے تاریخ وفات نکالی اور سورۂ آل عمران کے اس جز سے مادۂ تاریخ نکالا جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے رب العالمین کی خوشنودی کا اظہار فرمایا گیا ہے۔''10

اسی طرح اصغرعباس نے اپنی تحقیق سے اس بات کا بھی انکشاف کیا ہے کہ اقبال کا علی گڑھ سے ربط کا پہلا نقش 1907 میں ملتا ہے۔ جب علی گڑھ کے انگریز اساتذہ کے خلاف طلبائے کالج نے شورش کردی تو اقبال اس زمانے میں کیمبرج میں زیر تعلیم تھے اور انھوں نے جرمنی سے ایک پیام بھیجا جس میں پہلی مرتبہ انھوں نے اس نظم 'طلباء علی گڑھ کالج کے نام' میں علی گڑھ طلبا کے توسط سے نوجوانوں کو مخاطب کیا کہ انگریزوں کے خلاف شورش کا ابھی مناسب وقت نہیں ہے۔ یہ بارہ اشعار کی نظم پہلے جون 1907 کے رسالہ مخزن میں شائع ہوئی، پھر جزوی ترمیم کے ساتھ بانگ درا میں صرف سات اشعار شامل کردئے گئے۔ اسی طرح کی متعدد قیمتی تحقیقی معلومات کو پیش کیا گیا ہے جن سے اقبال اور علی گڑھ کے مابین گہرے ربط کا انکشاف ہوتا ہے اور اس کے پیش نظر فکر وفن کی باقاعدہ بازیافت کی جاسکتی ہے۔

اصغرعباس نے علی گڑھ تحریک سے متعلق اپنا جو لائحہ عمل متعین کیا تھا اس میں انھوں نے پوری تنظیم کا خیال رکھا ہے۔ ایک طرف وہ اقبال کو علی گڑھ تحریک کے زیر سایہ لاتے ہیں تو دوسری طرف انھوں نے نواب عبداللطیف کی شخصیت کو 'سرسید اور نواب عبداللطیف' کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب دونوں کی مشترکہ خدمات وتحریکات کا جائزہ لیتی ہے۔ کیونکہ علی گڑھ تحریک کے باب میں نواب عبداللطیف کے کردار کو فراموش نہیں کیا جاسکتا تھا جو سرسید کے قریبی رفقا میں شامل تھے اور سائنٹفک سوسائٹی کی تنظیم میں نہایت ہی فعال رکن تھے۔

اصغرعباس کی ادبی خدمات میں سرسید کے علاوہ دیگر موضوعات سے متعلق بھی متعدد مرتبات شامل ہیں جن میں 'رشید احمد صدیقی آثار واقدار'، 'سردار جعفری شخصیت اور فن'، 'ارمغان سرور'، 'عرفان سید حامد' اہم ہیں۔ان کی مرتبہ کتابوں میں 'سرسید کی تعزیتی تحریریں' کو اس اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں موجود معلومات سرسید کے ان خیالات کا احاطہ کرتی ہیں جن کا تعلق سرسید کے احباب اور معاصر علمی شخصیات سے ہے۔ وفیات کے اس مجموعہ میں شامل بیشتر مرحومین کسی نہ کسی اعتبار سے علی گڑھ تحریک کا حصہ رہے ہیں۔ جس سے سرسید تحریک کی جڑوں کا اندازہ ہوتا ہے اور اس تحریک کی ہمہ گیری کا بھی انکشاف ہوتا ہے۔ خود مرتب کی زبان میں کہ ''اس مجموعہ کے مطالعہ سے ہندوستان کے ایک خاص دور اور ایک تحریک کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تحریک کتنی ہمہ گیر تھی''11۔اس میں مرحومین کی کل تعداد 58 ہے جن کو چھ عنوانات ''علماء اور مبلغین، اہل علم وفن، طلبائے کالج، اہل صحافت، ملازمین مدرسۃ العلوم، رؤسا و اہلکاران حکومت'' کے تحت منطقی ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور آخر میں سرسید کا 'مرثیہ مصائب اندلس' شامل ہے جو سید یحیٰ قرطبی کے عربی مرثیہ کا اردو ترجمہ ہے۔

مشرقی ادب میں وفیات پر مبنی تحریروں کی بڑی اہمیت رہی ہے کیونکہ اس میں سوانحی عناصر کے علاوہ ادبی قدریں بھی نمایاں ہوتی ہیں جن سے شخصیات کا سنہ وفات متعین ہوتا ہے اس کی زندگی کے مختلف مخفی پہلوؤں کی دریافت ہوتی ہے جو محققین کے لیے تحقیقی دلچسپی کا مواد فراہم کرتے ہیں۔اس اعتبار سے اصغر عباس کا یہ علمی کارنامہ اور بھی اہم ثابت ہوتا ہے۔ اگر صنف وفیات کی روایت سے متعلق اصغرعباس کے اس خیال سے اتفاق کرلیا جائے کہ ''اردو میں اس کی روایت صحافت کی ترقی کے ساتھ پروان چڑھی اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے اجرا کے بعد اخبارات کے

کالم میں سرسید نے اسے ایک صنف کی حیثیت عطا کی اور ایک موقر مقام بخشا‘‘12 تو اس سے اردو ادب میں تحقیق کے مزید دروازے وا ہوتے ہیں اور اصغر عباس پہلے ایسے محقق قرار پاتے ہیں جنھوں نے سرسید کو صنف وفیات کا باقاعدہ بانی قرار دیا ہے۔

چونکہ اصغر عباس کی شخصیت کا یہ نمایاں پہلو ہے کہ انھوں نے سرسید، علی گڑھ تحریک اور وابستگان سرسید میں گہری دلچسپی دکھائی ہے ان کی مرتبہ کتاب ’شذرات سرسید‘ اسی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ یہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپنے والے سرسید کے 168 شذرات کا انتخاب ہے۔ جو تحقیق و تدوین کے اعتبار سے گراں مایہ فکری سرمایے کی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان شذرات کا مطالعہ فکرِ سرسید اور ان کی جہات کی تفہیم میں مشعل راہ ثابت ہوتا ہے۔ ان شذرات کا موضوعاتی دائرہ تہذیب، ادب، تاریخ، اخلاق، مذہب، سیاست، لسانیات، اقتصادیات، زراعت وغیرہ کو محیط ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اصغر عباس کا یہ کارنامہ براہِ راست سرسید کے متنوع افکار سے مستفید ہونے کی سہولت فراہم کرتا ہے تو یہ کہنا مبالغہ پر مبنی نہ ہوگا۔ کیونکہ اس مجموعے کی تمام تحریریں سرسید کی فکری و عملی نگارخانہ ثابت ہوتی ہیں جن میں ترقی یافتہ ہندوستان کی خواب بندی کی گئی ہے۔ جیسا کہ وہ رقمطراز ہیں:

’’ان شذرات اور مضامین میں جو چیز بہت نمایاں ہے وہ دانشورانہ دنیا میں اپنے ملک کے وقار کو اعلیٰ پیمانے تک پہنچانے کے لیے سرسید کی بے قراری ہے‘‘13

اصغر عباس نے دو سفرنامے ’مسافران لندن‘ اور ’سید محمد سبحان اللہ عظیم گورکھپوری کا سفر نامہ حج‘ بھی مرتب کیے ہیں جو اپنے علمی و ثقافتی اظہار کے نقطۂ نظر سے کافی اہم ہیں۔ سفرنامہ مسافران لندن کے توضیحی اشارے پروفیسر اصغر عباس کا اہم ترین تحقیقی کارنامہ ہیں۔ اسی طرح ان کے ادبی ذوق کے حامل سرمایے میں کچھ ایسے انتخابات ’انتخاب ذکا اللہ‘، ’منتخبات جامعہ اردو‘، ’شاہکار فطرت‘ بھی شامل ہیں جو اردو ادب میں اضافہ قرار پاتے ہیں۔ بالخصوص ’ضیا بار افراد کے خطوط بنام اصغر عباس‘ قابل ذکر ہے جو پروفیسر اصغر عباس کے نام لکھے گئے مختلف ادبی و علمی شخصیات کے خطوط کا مجموعہ ہے، جن کا مطالعہ فکری تبادلوں کا دائرہ وسیع کرتا ہے اور ادبی انداز گفتگو کا نمونہ فراہم کرتا ہے۔ مذکورہ کتابوں کے علاوہ انھوں نے متعدد کتابوں کے مقدمات،

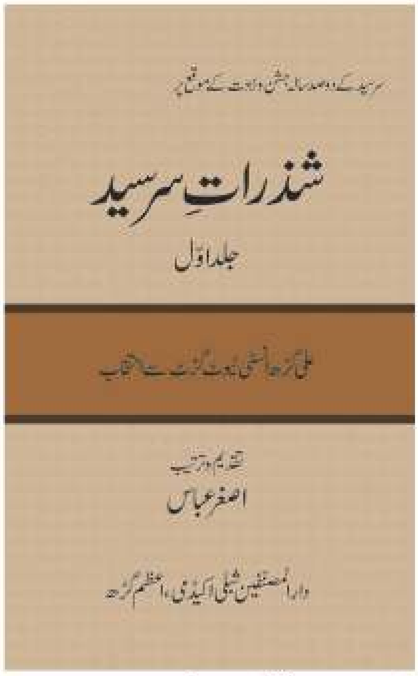

تعلیقات اور حواشی بھی مرتب کیے ہیں جو اردو زبان اور ادب کے سرمایہ میں قیمتی اضافے سے کم نہیں ہیں۔

المختصر یہ کہ اصغر عباس بہترین استاد، سنجیدہ محقق اور سرسید شناس تھے۔ پروفیسر اصغر عباس کی پوری زندگی سرسید اور ان کی شخصیت کے مطالعہ و تحقیق کے لیے وقف رہی۔ انھوں نے جس قدر سنجیدگی نگارشات سرسید کو مرتب کرنے میں دکھائی ہے وہ ان کا ہی امتیاز ہے۔ سرسید کی شخصیت اصغر عباس کے نقطۂ نظر میں زیادہ جاذب، زیادہ انقلابی اور سب سے زیادہ مؤثر تھی۔ واضح رہے کہ جدید تعلیم کا بانی کہہ دینے سے بھی سرسید کی سماجی خدمات کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ بلکہ وہ غیر منقسم ہندوستان کو جس طرح روشن خیال بنانا چاہتے تھے عصری تعلیم کو اس کا ایک اہم ترین ذریعہ مانتے تھے۔ مذہب اور مسلک سے بلند ہوکر ان کی نگاہ ہندوستان کی مجموعی زندگی پر تھی۔ سرسید 1857 میں پہلی بار ہندوستان میں قائم ہونے والے پبلک سروس کمیشن کے ممبر منتخب کیے گئے۔ انھوں نے آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں شریک ہونے کے لیے مقررہ عمر 21 سال سے بڑھوا کر 23 سال کی۔ اس وقت آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان لندن میں ہی ہوتا تھا۔ ہندوستانیوں کی سہولت کے لیے سرسید نے وہ امتحان ہندوستان میں منعقد کروایا۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اردو کے ساتھ عربی اور فارسی زبانوں میں بھی اداریے لکھ کر ہندوستان میں ذولسانی صحافت کی بنیاد رکھی۔ اسباب بغاوت ہند میں بے باکی کے ساتھ انگریزوں کی غلطیوں کی نشاندہی کی۔ البرٹ بل میں انگریزوں کے خلاف فوجداری کے مقدمے سننے کے لیے ہندوستانی ججوں کو اختیارات دلوائے۔ سرسید کی ایسی تمام خدمات کا احاطہ کرنے کے لیے آج بھی نئے سرے سے نئے علوم کی روشنی میں مطالعہ و محاکمہ ضروری ہے۔ واضح رہے کہ ہندوستان صرف سنگ وخشت کے مجموعے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے اپنے بنیادی اقدار و افکار بھی ہیں۔ انھیں زندہ رکھنے کے لیے آج بھی ہندوستان کی دانش گاہوں کو سرسید احمد خان کی تعلیمی اصلاحات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، ورنہ صرف پروفیشنل اور سیلف فائنس کورسز سے ہم صرف پیسہ تو کما سکیں گے لیکن سورداس، کبیر، تلسی، میر، غالب اور انیس و دبیر نہیں پیدا کر پائیں گے۔ اس بنیادی نکتے کا احساس پروفیسر اصغر عباس کو نہایت شدت کے ساتھ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تحقیقی و تدوینی سرمایہ میں سب سے زیادہ کتابیں سرسید سے متعلق ہیں جو مستند حوالے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ محمود الٰہی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ڈاکٹر اصغر عباس صاحب کا شمار علی گڑھ کے اداشناسوں میں ہوتا ہے۔

حواشی

1 سرسید کی صحافت، ناشر: کوہ نور پرنٹنگ پریس، دہلی، 1975، ص 17
2 ایضاً، ص 227
3 سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی، ناشر: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ص 7
4 ایضاً، ص 9
5 ایضاً، ص 7
6 انتخاب مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ص 11
7 اردو کا جمالیاتی ادب اور علی گڑھ، لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ، 1989، ص 40
8 سرسید، اقبال اور علی گڑھ، ص 6
9 ایضاً، ص 7
10 ایضاً، ص 6
11 سرسید کی تعزیتی تحریریں، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 1989، ص 11
12 ایضاً، ص 7
13 شذرات سرسید، جلد اوّل، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ص 4

Prof. Abbas Raza Nayyar
Head, Dept of Urdu
Lucknow University
Lucknow (UP)
abbasrazanayyar@gmail.com

محمد شہنواز عالم

زاہدہ زیدی کی نظمیہ شاعری

زاہدہ زیدی کو نظم اور غزل دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ ان کے یہاں حقیقت کا رنگ بھی ہے، مجاز کی کیفیت بھی ہے۔ ان کی زبان صاف ستھری اور سلیس تھی۔ انھیں جذبات کے اظہار کا فن آتا تھا۔ زاہدہ بچپن سے ہی شاعری کی طرف مائل تھیں۔ ان کے گھرانے کے لوگ علم دوست اور ادبا و شعرا کے قدر داں تھے۔ زاہدہ کے خاندان میں کئی اچھے شاعر گزرے ہیں۔ ان نمایاں ناموں میں سے ایک نام الطاف حسین حالی کا بھی ہے۔ ان کے دادا و نانا کے علاوہ ان کے والدین کو بھی شاعری سے گہرا شغف تھا۔ ان کی والدہ شاعرہ تھیں۔ زاہدہ زیدی کے کل پانچ شعری مجموعے ہیں جو داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان مجموعوں کے نام ہیں: 'زہر حیات'، 'دھرتی کا لمس'، 'سنگ جاں'، 'شعلۂ جاں' اور 'شامِ تنہائی'۔ زاہدہ کے ان مجموعوں میں نظم، غزل، حمد اور مرثیہ وغیرہ شامل ہیں۔

زاہدہ غزل کی بہ نسبت نظم نگاری کی طرف زیادہ مائل رہی ہیں۔ انھوں نے نظمیں زیادہ اور غزلیں کم کہیں۔ زاہدہ نے جب اپنے شعور کی آنکھیں کھولیں تو ان کے سامنے پوری دنیا خصوصاً ہندوستان میں افراتفری مچی تھی۔ ہندوستان میں آزادی کی تحریک پورے شباب پر تھی۔ ملک کی آزادی کے بعد ہندوستانیوں کے سامنے جو سب سے بڑا مسئلہ تھا، وہ ملک کی تقسیم کا تھا۔ شاعر حساس ذہن اور نرم و نازک دل کا وارث ہوتا ہے۔ اس کا دل صرف زمانے کی آہٹ پر ہی نہیں دھڑکتا ہے بلکہ خارجی و داخلی حالات و کوائف سے بھی دوچار ہوتا ہے۔ وہ کسی واقعے یا حادثے کو اپنی نظروں سے یونہی نہیں گزرنے دیتا ہے بلکہ اس واقعے یا سانحہ کو اپنی سوچ و فکر میں جذب کر کے اشعار کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔

زاہدہ زیدی نے ڈرامے کی طرح شاعری میں بھی علامت و استعارہ سے کام لیا ہے۔ انسانی فطرت کو ان کی شاعری میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے لفظ آزادی کو الگ الگ ڈھنگ سے باندھا ہے۔ ان کی شاعری میں ذہنی، نفسیاتی اور روحانی آزادی کو انفرادیت حاصل ہے۔ زاہدہ زیدی کا شعری کلام اندوہ و غم سے بھرا پڑا ہے مگر یہ غم ان کی شاعری کے وفا شعار دوست معلوم ہوتے ہیں، جو پڑھنے والوں کو غمگین نہیں ہونے دیتے ہیں بلکہ وہ زندگی جینے اور زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کا درس دیتے ہیں۔ وقت اور فطرت کو ان کی شاعری میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ زاہدہ نے بھی معنی کے مقابلے میں لفظ کو زیادہ ترجیح دی ہیں جس کا اندازہ ہمیں زاہدہ کی تخلیق کردہ نظم بعنوان 'ایک نظم' سے ہوتا ہے۔ مذکورہ نظم ان کے پہلے شعری مجموعہ 'زہر حیات' کی زینت ہے۔

''جادۂ زندگی کے سفر میں / اگر کوئی دولت تھی اپنی، تو بس چند الفاظ تھے
ہم نے لفظوں کے شیشے میں آہنگ کی جل پری کو اُتارا
ہم نے لفظوں کی چھینی سے حسن و معانی کے کتنے تراشے صنم
ہم نے لفظوں کے ناخن سے ہر عقدۂ فکر و حیرت کو کھولا
ہم نے الفاظ کی انگلیوں سے نگار معانی کے ہر خال و خد کو سنوارا
ہم نے لفظوں کی مشعل سے تاریکی بزم دل کو سجایا
ہم نے لفظوں کے ساغر سے چھلکائی سوز دروں کی شراب کہن

مذکورہ بند اس بات کا انکشاف ہے کہ زاہدہ لفظوں سے کھیلنا بخوبی جانتی ہیں۔ وہ تخیل کی بلند پروازی اور نغمہ آہنگ سے جس شئے کو جب اور جیسا چاہتیں، پیش کر دیتیں۔ یہ بات واضح ہے کہ الطاف حسین حالی نے شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لیے جو شرطیں رکھی تھیں، ان میں سے ان کی ایک شرط ''تفحص الفاظ'' بھی ہے۔ تفحص الفاظ کے معنی مناسب الفاظ کی جستجو کے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی بھی الفاظ کے قائل ہیں کیونکہ تشبیہ اور استعارہ سے شعر میں وسعت اور جوش پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ زاہدہ زیدی نے بھی اپنے کلام میں تشبیہ اور استعارہ سے کام لیا ہے تاکہ ان کے اشعار میں بھی وسعت اور تہ داری پیدا ہو جائے۔ رمزیت، ایمائیت اور علامت

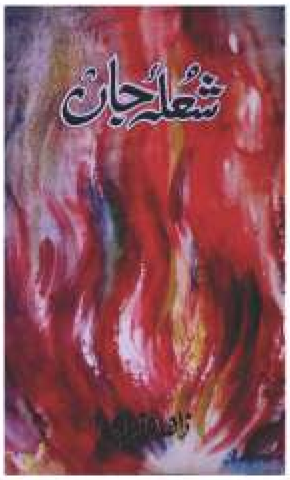

سازی زاہدہ زیدی کی نظموں وغزلوں کا خاصہ ہیں۔

زاہدہ زیدی کی شاعری کا دامن بہت وسیع ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں کا لب ولہجہ اور ان کی زبان و بیان کلاسیکی شعرا کے قریب تر معلوم ہوتے ہیں مگر انھیں لفظیات اور تراکیب کے معاملے میں انفرادیت حاصل رہی ہے۔ زاہدہ کا نظریہ اشتراکی اور مطالعہ مغربی ہونے کے باوجود ان کے کلام میں مشرقی روایات، اقدار اور تہذیب وتمدن کی پیشکش خوب ملتی ہے۔ ان کی شاعری تانیثیت تک محدود نہیں ہے بلکہ تانیثیت سے بہت آگے کی چیز ہے۔ زاہدہ زیدی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہوئی یوں رقم طراز ہیں:

''براہ کرم نقاد حضرات یا دوسرے ادیب وشاعر میری شاعری کو تانیثی چوکھٹے میں فٹ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اول تو تانیثیت پر جس قسم کی گفتگو ہو رہی ہے، اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اسے نہایت محدود اور کسی قدر گمراہ کن معنوں میں سمجھا گیا ہے اور اس تھیوری کے پردے میں ایک بالکل ناقص تصور عورتوں پر لادا جا رہا ہے، جسے بعض خواتین مردوں کی خوشنودی اور سستی شہرت حاصل کرنے کی غرض سے قبول بھی کر رہی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک عام عورت کو تانیثی رویے اختیار کرکے اپنی انفرادیت منوا سکتی ہیں لیکن شاعری جینوئن تانیثیت سے بھی بہت آگے کی چیز ہے۔ یہ ایک بلند تر سروکار ہے جو اپنی افتاد میں ماورائیت سے ہمکنار ہے۔ یہ ذات کی گہرائیوں تک پہنچنے، ذات اور کائنات کے رشتوں کو سمجھنے، فنا وبقا، وقت اور موت، زندگی اور زماں، عشق اور غم، انسانی ذہن کے لامحدود کائنات اور فطرت کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی تگ وتاز ہے۔''

(کچھ اپنے قاری سے، شام تنہائی، از: زاہدہ زیدی، علی گڑھ، 2008، ص 1011)

زاہدہ زیدی وقت کی پابند اور قدر داں تھیں۔ وہ وقت کی بادشاہی کو تسلیم کرتی ہیں کیونکہ انھوں نے اپنی ذاتی زندگی میں وقت کے جبر کو دیکھا بھی اور اس کا ظلم بھی سہا ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام 'شعلۂ جاں' کی ایک اہم نظم 'وقت کی سرحدوں سے پرے' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے زاہدہ نے وقت کے تصور کو کس انداز سے پیش کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

''سچ تو یہ ہے کہ ہر رنگ میں/ اور ہر موڑ پر
وقت سائے کی مانند ہر دم مرے ساتھ تھا
میری سانسوں میں لرزاں تھا
میرے رگ و پے میں پیوست تھا
میری ہر نقل وحرکت پہ سایہ فگن تھا
اس کی طائر تند خو کی طرح
اس کی پرواز لیکن میری دسترس میں نہ تھی!''

زاہدہ نے اپنی نظموں کے ذریعہ وقت کی اہمیت کو سمجھنے اور سمجھانے کی پوری کوشش کی ہے۔ 'یہ وقت بیکراں سمندر' ان کی ایک ممتاز نظم ہے۔ اس نظم میں بھی وقت کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اس نظم کے ایک بند پر نظر ڈالتے چلیں۔

''یہ وقت کا بیکراں سمندر/ جو میرے اطراف موجزن ہے
یہ تند و فا کی محشر بدوش دھارا/ کہ جس کی زد میں ہیں
عہد ماضی کی وارداتیں
ہزاروں جلوہ طراز دن، سوگوار راتیں
گذشتہ ادوار کے سلگتے ہوئے سفینے
حیاتِ نو کے کئی قرینے!''

اس نوع کی ان کی ایک دوسری نظم جس کا عنوان ہے 'یہ لمحہ' اس نظم میں بھی وقت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

''یہ لمحہ نہیں/ وقت کا منجمد ایک نقطہ
یہ لمحہ تو ہے ایک گہرا سمندر/ کہ جس میں
کئی سمت سے آکے ملتے ہیں/ پرشور دھارے
یہ لمحہ/ کہ جس کی رگوں میں رواں ہیں
کئی بیتی صدیوں کے زیریں تلاطم
یہ لمحہ/ جس کے لہو میں
کئی آنے والے زمانوں کے راز دروں
مرتعش ہیں!''

زاہدہ زیدی کی شاعری کا دامن بہت وسیع ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں کا لب ولہجہ اور ان کی زبان و بیان کلاسیکی شعرا کے قریب تر معلوم ہوتے ہیں مگر انھیں لفظیات اور تراکیب کے معاملے میں انفرادیت حاصل رہی ہے۔ زاہدہ کا نظریہ اشتراکی اور مطالعہ مغربی ہونے کے باوجود ان کے کلام میں مشرقی روایات، اقدار اور تہذیب وتمدن کی پیشکش خوب ملتی ہے۔ ان کی شاعری تانیثیت تک محدود نہیں ہے بلکہ تانیثیت سے بہت آگے کی چیز ہے۔

زاہدہ زیدی کی شاعری میں موضوعات کی تکرار کے ساتھ ساتھ ذات و کائنات کا شعور اور تخیل کا اظہار بہت نمایاں ہے۔ زاہدہ لفظ و معنی کے رشتے سے بخوبی واقف تھیں جس کا اندازہ ہمیں ان کے شعری کلام کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں وجدان، داخلیت، شعور اور آمد کی جلوہ گری ہے۔ انھوں نے سائنسی نظریات و خیالات کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی شاعری میں انسانیت کی فلاح و بہبود اور بقا کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں ظلم وجبر کی مذمت ومظلوم کی حمایت کا رجحان صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ان کے نزدیک امیر و غریب سب برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔

زاہدہ زیدی نے اپنی نظموں و غزلوں میں لفظ 'کربلا' کا استعمال بکثرت کیا ہے اور اس لفظ کو انھوں نے علامت و تلمیح کی بجائے سیدھے سادے انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے شعری مجموعہ 'شعلۂ جاں' میں ایک نظم 'کربلا' اور 'شامِ تنہائی' میں بھی ایک نظم بعنوان 'کربلا پھر کربلا ہے' ان نظموں کے علاوہ ان کی غزلوں میں بھی لفظ 'کربلا' اور حسینؑ کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ نظم 'کربلا پھر کربلا ہے' کا آخری حصہ ملاحظہ ہو۔

"کربلا ہر شہر و قریہ / کربلا ہر سانحہ ہے
کربلا بغداد بھی ہے / کربلا کوفہ نجف ہے
کربلا اب ہر طرف ہے / ہر طرف اب حشر ساماں
ظلم کا یہ سلسلہ ہے / کربلا پھر کربلا ہے / کربلا پھر کربلا ہے

زاہدہ زیدی کی شاعری میں وجدان، داخلیت، شعور اور آمد کی جلوہ گری ہے۔ انھوں نے سائنسی نظریات وخیالات کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی شاعری میں انسانیت کی فلاح و بہبود اور بقا کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں ظلم وجبر کی مذمت ومظلوم کی حمایت کا رجحان صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ان کے نزدیک امیر وغریب سب برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔

زاہدہ زیدی کی نظموں میں ڈرامائی کیفیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس کیفیت میں ایک طرح کی معنویت اور تہ داری ہے۔ ایسی نظموں میں 'بند کمرہ'، 'لاشوں کا سوداگر'، 'زلزلہ'، 'ایٹم سنسکار' اور 'دھرتی کا لمس' کے نام گنائے جاسکتے ہیں۔ نظم 'بند کمرہ' کا ایک بند قابلِ توجہ ہے۔

"دیکھو اس بند کمرے سے باہر نہ نکلو / کبھی بھول کر بھی
برابر کے کمرے میں ہرگز نہ جاؤ / کیونکہ وہ سالہا سال سے بند ہے
یہ بھی ممکن ہے / زہریلے کیڑے مکوڑے وہاں پل رہے ہوں
یہ بھی ممکن ہے / اب تک وہ بھوتوں کا گھر بن چکا ہو!"

زاہدہ زیدی اپنی نظموں میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کے لیے علامتوں کا سہارا لیتی ہیں۔ زاہدہ کی نظم 'دھرتی کا لمس' کے مطالعے سے ایسا لگتا ہے کہ اس نظم میں وہ بذاتِ خود ڈرامائی کردار کی حیثیت سے موجود ہیں۔ ایسی نظموں سے ان کے مجموعے بھرے پڑے ہیں۔ اس قسم کی نظموں میں 'ویرانہ'، 'سمندر کا ایٹم بلاوا'، 'سنگِ جاں'، 'بلور کا جام'، 'شعلۂ جاں' وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ 'دھرتی کا لمس' کے اشعار دیکھیں۔

"شکستہ راہی
جو ہو سکے تو پاگل ہوا سے پوچھو
سیاہ جھاڑیوں میں کتنے فگار جسم
وہ سب جو نکلے تھے دھرتی کے لمس کی آرزو میں
چنچل خدا کی آغوش میں زندگی اساس پانے
جو ہو سکے تو زخمی ہوا کے سینے پہ
اپنے لہو سے تم اپنا نام لکھ دو
سیاہ جھاڑیاں اب بھی منتظر ہیں!"

زاہدہ زیدی اپنی نظموں کے ذریعہ عاشق و معشوق کے والہانہ جذبات و احساسات کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کرتی ہیں۔ ان کی عشقیہ نظموں میں 'وصل' اور 'تم' کو اولیت حاصل ہے۔ 'وصل' ان کے مجموعہ 'دھرتی کا لمس' کی پہلی نظم ہے جو نہایت ہی مختصر ہے۔ اس میں تہ داری اور موزونیت ہے۔ نظم 'تم' شروع سے توجہ کی حامل رہی ہے۔ اس نظم میں شاعرہ نے ایک طویل خط کو ایک گھیرے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ نظم ہیئت کے اعتبار سے بالکل منفرد ہے کیونکہ اس نظم میں ہیئت کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم کے دائرے سے محبوب کی شخصیت اور وصل کی کیفیت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ دونوں نظم کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں۔

"تلاطم کا مجلس / سمندر کی جانب بڑھا
(وصل ہر جسم سیال کا منتہا)
سمندر نے آغوش وا کی
تلاطم کا مرکز — سمندر / بھی قطرہ تھا / تھی جس کو
اک بیکراں بحر کی آرزو!" (وصل)

"لہو کی گردش / بہتے لمحات کا ترنم
مگر وہ لمحے / کہ جن میں تم، تم تھے!" (تم)

مختصر یہ کہ زاہدہ کے اظہار و ابلاغ میں ایسی رنگینی و رعنائی اور زبان و بیان میں ایسی شگفتگی و تازگی ہے کہ وہ پامال و فرسودہ مضامین کو بھی پُرکشش و جاذبِ نظر بنا دیتی ہیں۔ کیونکہ شاعری کا اصلی دار و مدار زبان و بیان پر ہوتا ہے چنانچہ زاہدہ زیدی کے طرزِ ادا میں بلند خیالی، جدت و ندرت، تازگی و شگفتگی اور دلکشی و دلآویزی ہے۔

■

Dr. Md. Shahnawaz Alam
Head Department of Urdu,
Islampur College,
Islampur-733202 (West Bengal)
Mob.: 9874430252
Email: shahnawaz@islampurcollege.ac.in

اقبال کرشن کی غزلیہ شاعری کا تنقیدی جائزہ

معراج احمد معراج

اقبال کرشن مغربی بنگال کے شعری وادبی افق پر ایک ایسے چاند بن کر نمودار ہوئے کہ اس کی روشنی نے اہلِ فکر ونظر کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ ان کا ادبی سفر زیادہ طویل نہیں تھا تاہم جو کچھ بھی سرمایۂ شعروادب انھوں نے اپنے پیچھے چھوڑا، اس سے ان کے ادبی قد کا اندازہ کچھ نہ کچھ تو لگایا جا سکتا ہے۔

اقبال کرشن کی پیدائش مغربی بنگال کے شہر کلکتہ کے ایک قصبے تانتی باغ میں 1942 میں ہوئی۔ ان کے والدین کے اسمائے گرامی سید محمد عبد الرشید و میمونہ خاتون ہیں۔ ان کے والد بھی شعروسخن کا شغف رکھتے تھے، اور ارشد لکھنوی کے نام سے مشہور تھے۔ اقبال کرشن کا اصل نام سید محمد اقبال تھا، اور گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار ہونے کے سبب اپنے نام کے ساتھ کرشن بھی جوڑ لیا۔ ان کا انتقال 28 اگست 2007 کو کلکتے میں ہوا۔ انھوں نے تقریباً 65 برسوں کی مختصری زندگی پائی۔ اگر انھوں نے جوانی کے ایام سے ادب کا کام شروع کیا ہوگا تو ان کی ادبی زندگی صرف تیس برسوں پر محیط ہے۔ اتنے مختصر عرصے میں انھوں نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ان کا سب سے نمایاں کام یہ ہے کہ انھوں نے بِبھوتی بھوشن پانڈے کے بنگلہ ناول 'پاتھر پنچالی' کا ترجمہ اردو میں کیا، جس سے ان کی شہرت ایک ترجمہ نگار کی حیثیت سے مغربی بنگال ہی میں نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں ہوئی۔ بعد ازاں جادو ناتھ سرکار کی سوانحِ حیات کا ترجمہ بنگلہ سے اردو میں کیا، اس کے علاوہ جتندر ناتھ سین گپتا کی نظموں کا ترجمہ بھی بخوبی بنگلہ سے اردو میں کیا۔ ایک اور تاریخ کی کتاب 'ہسٹری آف میتھلی لٹریچر' کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا۔ ان ترجموں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ بیک وقت بنگلہ، انگریزی اور اردو، تینوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ حالانکہ انھوں نے اعلیٰ تعلیم اردو، فارسی اور عربی میں حاصل کی تھی۔ ان سب باتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اقبال کرشن ایک دانشور، نکتہ بیں، تعلیم یافتہ اور کثیر اللسان شاعر و ادیب تھے۔

اقبال کرشن نے ادبی زندگی کا آغاز گرچہ شاعری سے کیا، لیکن انھوں نے افسانے بھی لکھے، تنقیدی مضامین بھی لکھے، اور صحافت بھی کی۔ ان کے مضامین کے مطالعے سے یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ وہ مختلف شعری و نثری اصناف کے افہام وتفہیم سے آشنا تھے، اور انھیں برتنے کا ہنر بھی جانتے تھے۔

معروف شاعر و نقاد نصر اللہ نصر نے اپنی کتاب 'بنگال میں اردو نظم نگاری' میں اقبال کرشن کو نظم کا ایک اچھا شاعر اور عروض داں تسلیم کیا ہے، اور اس سلسلے میں وہ فرماتے ہیں:

''جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے تو خصوصی طور پر نظم نگاری میں وہ بہت مشاق تھے کہ انھوں نے زیادہ تر آزاد نظمیں کہی ہیں جن میں بحر اور وزن کی پابندی کا خاص اہتمام ہوا کرتا تھا، وہ ایک اچھے اور مستند عروض داں بھی تھے۔'' (بنگال میں اردو نظم نگاری، ص118)

اقبال کرشن شاعری کے رموز ونکات سے کما حقہ آگاہ تھے، اسی لیے انھوں نے شاعری بہت سلیقے سے کی ہے۔ وہ شعر اور غیر شعر کے فرق کو اچھی طرح سمجھتے تھے جس کا اظہار انھوں نے اپنے ایک مضمون 'شعر اور تحت الشعر' میں کیا ہے۔ ان کی نظر میں موزونیت شعر کے لیے ضروری نہیں اور موزونیت دراصل نثری زبان کی فطری ساخت میں بگاڑ پیدا کرنے کا نام ہے۔ انھوں نے مزید یہ بھی کہا کہ ایک قادر الکلام شاعر کا ہر موزوں جملہ شعر بھی نہیں ہو سکتا۔ دیکھیے وہ اس تعلق سے کیا فرماتے ہیں:

''میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ قادر الکلامی ایک تمام تر غیر شاعرانہ صفت ہے۔ ایک قادر الکلام شخص ہر نثری جملے کو موزوں کر لے گا، لیکن اس کا ہر موزوں جملہ شعر نہیں کہلا سکتا۔ میں نے شروع ہی میں کہہ دیا ہے کہ شعر دراصل لسانی سطح پر حسن و جمال کو جنم دینے کا دوسرا نام ہے۔'' (شعر اور تحت الشعر: اقبال کرشن)

اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال کرشن مزید یہ فرماتے ہیں:

''صنفِ غزل پر سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ ہیئت کے معنوی پہلو کے بجائے اس کے صوری پہلو پر زور دیا گیا اور نتیجے میں شاعری کے نام پر قافیہ بازی ہونے لگی۔ یقینی بات ہے قافیہ بازی کو ہم شعر نہیں کہہ سکتے، اسے تحت الشعر ہی کہیے۔'' (شعر اور تحت الشعر: اقبال کرشن)

انھوں نے غزل پر نثری نظم اور آزاد نظم کو فوقیت دی ہے اور غزل کی تنگ دامانی کا شکوہ بھی کیا ہے۔ وہ اپنے مضمون میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

''اس سیاق و سباق میں آزاد اور نثری نظم ابنِ مریم کی پھونک سے کم نہیں۔ مبارک ہے وہ ہستی جس نے اردو زبان میں آزاد نظم کی داغ بیل ڈالی۔ آخر میں میں یہ بتا دوں کہ میں کوئی غزل کا دشمن نہیں، لیکن پوری اردو شاعری کو غزل میں مرکوز کر دینے کا بھی میں حامی نہیں۔ شعر کے نام پر شعر ہی پیش کرنا چاہیے، تحت الشعر یا موزوں نثر نہیں۔'' (شعر اور تحت الشعر: اقبال کرشن)

چونکہ وہ ایک عروض داں تھے، اسی لیے اپنی عروض دانی ثابت کرنے کے لیے مشکل بحور و اوزان میں اشعار کہے، اور بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا کہ وہ ان بحروں کو برتنے میں تو کامیاب ہو گئے ہیں لیکن ان بحور پر کہے گئے اشعار میں معانی و مفاہیم پیدا کرنے میں بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ اس حقیقت کو بھی واضح کرتا چلوں کہ اردو شاعری میں عموماً تین متوالی حرکات والے الفاظ ہی برتنے کا چلن ہے، لیکن انھوں نے کچھ ایسے اوزان پر اشعار کہے ہیں جن میں متواتر چار حرکات ہیں۔ چار متوالی حرکات والے الفاظ زیادہ تر عربی زبان میں موجود ہوتے ہیں، اور عربی شعرا ان الفاظ کو اپنی شاعری میں بخوبی برتتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنی چند غزلوں میں ایسے الفاظ باندھنے کی کوشش کی ہے جن میں چار متوالی حرکات ہیں، اس کے لیے انھوں نے ترکیب و اضافت کا سہارا بھی لیا ہے، اور اس کوشش میں کہیں کہیں ان الفاظ کے حروفِ علت

بھی ساقط الوزن ہو گئے ہیں، جن کا سقوط کلاسیکی شعرا کے ہاں روا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر، بحرِ جدید مشکول مطوی (فعلات فعلات مفتعلن) میں چار متواتر حرکات ایک ساتھ جمع ہو گئی ہیں۔ اس وزن کے درمیان (حشوین) میں ت، ف، ع، ل، یہ چار حروف متحرک ہیں۔ اس طرح کے اوزان میں شعر کہنا خصوصاً اردو میں بہت دشوار ہوتا ہے۔ اردو میں چار متوالی حرکات والے الفاظ کی قلت ہے۔ اقبال کرشن نے بڑی دماغی ورزش سے اس وزن میں بھی اشعار کہہ ڈالے ہیں۔ یہ اشعار دیکھیں۔

ترا بادیہ چشم غرق سحاب مرا زاویہ دید مشق عتاب
تری دید کار ہا نظر میں سراب ترا شوق مجھے ریگ زار عذاب

بہت کم شعرا ہیں جنھوں نے بحرِ وافر میں غزلیں کہی ہوں۔ میں نے پوری زندگی میں صرف ایک غزل اس وزن (مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن) میں کہی ہے۔ اقبال کرشن نے اس بحر میں دو غزلیں کہی ہیں۔ حالانکہ اس بحر میں جو اشعار انھوں نے کہے ہیں، ان میں بہت سے الفاظ بری طرح سے مجروح ہو گئے ہیں۔ انھوں نے خود اپنے ایک مضمون میں یہ اعتراف کیا ہے کہ ''نثری زبان کی فطری ساخت کے بگاڑ سے اگر حسن پیدا ہوتا ہے تو یہ شعر کے لیے ضروری ہے''۔ لہٰذا اگر انھوں نے کسی لفظ کو اس کے اصل وزن پر نہیں باندھا ہے تو یہ دراصل حسن پیدا کرنے کے لیے کیا گیا ہو۔ مثال کے طور پر، بحرِ وافر میں کہے گئے یہ اشعار دیکھیں۔

مریضِ وفا کا روگ جدا مزاج جدا جدا بے سبب
طبیبِ وفا کا جوگ خدا علاج جدا، جدا ہے مطب
ہو بارشِ سنگ لعنت و تف پہ کیوں نہ مری، نجات و برات
بھٹکنے لگا ہے حینِ حیات مرے گناہوں کا بولہب
صحرا میں حسرتوں کے بھی زنجیر پائی ہے
بے چارگی کی انتہا کس بام پر گئی

ان اشعار میں 'بے سبب'، 'بولہب' اور 'انتہا'، جیسے فارسی و عربی کے الفاظ ساقط الوزن ہو گئے ہیں، اور اس طرح کے سقوط کلاسیکی شعرا کے نزدیک روا نہیں ہیں۔ ایک اور غزل جو بحرِ رجز مثمن مطوی (مفتعلن مفتعلن مفتعلن مفتعلن) میں ہے، اس میں قافیے بھی اپنے اصل تلفظ پر نہیں باندھے گئے ہیں۔ جیسے یہ مطلع دیکھیے۔

مردہ تھا میں زندہ ہوا، روتا تھا میں خندہ ہوا
دولتِ عشق آنے سے میں دولتِ پایندہ ہوا

اس مطلع میں قافیے درست ہیں کیونکہ 'ن' سے پہلے زبر دونوں الفاظ میں ہیں، لیکن اسی غزل کے بعض اشعار کے قافیوں میں 'ن' سے پہلے زیر ہے، جس سے قافیے مطلع کے حساب سے نہیں بن پا رہے ہیں۔ یہ قافیے ہیں کارندہ، تابندہ، شرمندہ۔ ایک شعر بھی پیش ہے۔

بخیہ گری کی مجھے تشنیع نہ دو چارہ گرو
میں تو ہوں وہ چاک رفو کا جو نہ شرمندہ ہوا

ایک اور غزل دیکھیے جس کے مطلع میں قافیے اور ردیف کا التزام ہے لیکن اس کے بعد جو اشعار کہے گئے ہیں، ان میں ردیف کو ہی قافیے کے طور پر برتا گیا ہے۔ اس غزل کے چند اشعار دیکھیے۔

حجابِ زنگ نہ آئینۂ وفا سے اٹھا
سحابِ سنگ ہی ویرانۂ جفا سے اٹھا
ہزار جسم لیے سہہ رہا تھا ضرب تمام
حسابِ سنگ نہ پیمانۂ رفو سے لگا
اٹھا برنگِ تماشا اٹھا کمانِ ستم
چلا خدنگِ نفس اور بجھا چراغ مرا

اس غزل کے مطلعے میں 'وفا' اور 'جفا' قافیے ہیں اور 'سے اٹھا' ردیف ہے، لیکن اس کے بعد جو اشعار آئے ہیں ان میں یہ قافیے اور ردیف کے نظام کو برتا نہیں گیا ہے، بلکہ ردیف کے آخری لفظ کو قافیہ بنالیا گیا اور یہاں سے پوری غزل غیر مردف ہو گئی ہے۔ دوسرے، تیسرے، چوتھے، اور پانچویں شعر میں بالترتیب قافیے؛ لگا، مرا، اگا، اپنا اور تھا، استعمال ہوئے ہیں۔ اس اندازِ شعرگوئی کو ان کا تجربہ ہی کہیں گے، کیونکہ قافیائی اور ردیفی نظام سے اس طرح کا انحراف کوئی ایسا شاعر تو کر ہی نہیں سکتا جو شعر اور تحت الشعر کے معانی و مفاہیم دوسروں کو سمجھا رہا ہو۔ لیکن اس طرح کا تجربہ کسی دوسرے شاعر نے شاید ہی کیا ہو، اور اگر کیا بھی ہو تو وہ میری نظر سے نہیں گزرا۔

اقبال کرشن کی وہ غزلیں بہت معنی آفریں ہیں جو مروج اور مستعمل بحروں میں ہیں، ان کے اشعار میں خیالات کی بلند پروازی با آسانی محسوس کی جا سکتی ہے، وہ بہت رواں دواں، اور ترنم خیز ہیں۔ بحرِ مضارع (مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن) میں کہے گئے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

سمجھا تھا اس کے دل میں مری بات اتر گئی
دیکھا بڑھا کے ہاتھ صدا بے اثر گئی
قرطاسِ انتظار پہ نقشِ دوام ہوں
اک عمر اسی سراب کے پیچھے گزر گئی
رسوائیوں کی بھیڑ نے شہرت کی بھیک دی
قسمت ہمارے ساتھ بھی کیا کھیل کر گئی

یہ اشعار بھی دیکھیں جو بحرِ مضارع مثمن اخرب (مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن) میں کہے گئے ہیں۔

لگتا ہے عشق کا یوں آزار روتے روتے
کرتا ہوں اس سخن کا اظہار روتے روتے
آئے ہیں ایک سے اک سردار روتے روتے
تیرے حضور آئے سردار روتے روتے
تیری گلی اتر کر تیری گلی نکل کر
تکتے ہیں سائلانِ دیدار روتے روتے

بحرِ متقارب مثمن سالم (فعولن فعولن فعولن فعولن) ایک کثیر الاستعمال بحر ہے، اس میں روانی اور نغمگی دونوں ہے، اس بحر میں کہے گئے یہ اشعار پیش ہیں۔

گیا تھا پھسل پانو راہِ عمل میں
گرا تو لگی چوٹ کس کر بغل میں
مری روسیاہی تو پھیلی ہے ہر سو
سمٹ آئی مسکان اس کی کنول میں
مرے حوصلوں کا جواں اسپ تازی
بندھا ہے ترے ظلم کے اصطبل میں

مذکورہ بالا اشعار ان بحور اوزان میں ہیں جن کا استعمال زیادہ تر شعرا نے کیا ہے، اور یہ اوزان بہت رواں اور ترنم خیز ہیں، ان اوزان میں کہے گئے اشعار فنی اور معنوی اعتبار سے بھی بہت پُر اثر ہیں، ان میں ترسیل کا کوئی مسئلہ بھی نہیں ہے، یہ اشعار ان شعروں کے مقابلے سریع الفہم اور معانی و مفاہیم سے ہم رکاب بھی ہیں، جو مشکل اوزان اور ثقیل الفاظ میں کہے گئے ہیں۔ میرا یہ ماننا ہے کہ غزلیہ شاعری میں ثقیل الفاظ کے استعمال سے اس کا معیار بہت بلند نہیں ہو جاتا، بلکہ الفاظ کی ثقالت شعر کی تفہیم میں کچھ حد تک مانع ہوتی ہے۔ شعر اگر عام فہم ہو، تو وہ قاری کے دل پر فوراً اثر کرتا ہے، ایسی ہی خوبی مذکورہ بالا شعروں سے جھلکتی ہے۔ بہر طور اقبال کرشن کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اقبال کرشن نے اشعار صرف خواص کے لیے ہی نہیں بلکہ عوام کے لیے بھی کہے ہیں۔ اور چونکہ وہ عروض داں بھی تھے اس لیے اس کے اظہار کے لیے انھوں نے مستعمل بحور و اوزان کے علاوہ مشکل بحور و اوزان میں بھی غزلیں خلق کی ہیں۔

■

Meraj Ahmad Meraj
Kulti
Pachim Bardhman (West Bengal)
Mob.:8918960724
merajahmad333@yahoo.in

رضیہ پروین

فضا ابن فیضی

مجھ کو میرے سخن سے پہچانو!

ٹونس ندی کے لب ساحل پر آباد شہر مئوناتھ بھنجن کو شہر سخن کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ علمی اور صنعتی اعتبار سے یہ شہر یوپی کے ایک خاص ضلع کی حیثیت سے ایک انفرادی شان رکھتا ہے۔ پارچہ بافی کی صنعت کی وجہ سے ملک و بیرون ملک میں کافی مشہور و مقبول ہے۔ اسی شہر سخن کی پیداوار فضا ابن فیضی نے اپنی شاعرانہ بصیرت سے شاعری کی وہ شمع روشن کی جس کے جلوؤں کی تابانی سے شاعری کا مزاج نہ صرف تبدیل ہوا بلکہ غور وفکر کے انداز میں بھی مختلف رنگ ورو دکھائی دینے لگے۔ فضا ابن فیضی کی شاعری ان کی شخصیت کی سچی آئینہ دار ہے وہ ایک حساس دل اور خوددار طبیعت کے مالک تھے، قدرت نے ان کی فطرت میں شعری و ادبی صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی جس سے انھوں نے بھرپور استفادہ کیا۔ کم عمری سے ہی انھوں نے شاعری کرنا شروع کر دیا تھا، زندگی کی تلخ حقیقتوں اور حالات کی گردشوں نے ان کے قلم کو، ان کے فن کو، ان کی فکر کو، انتہا تک پہنچا دیا تھا جس کا درد مندرجہ ذیل شعر میں پوری شدت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

ہم اس کرشمۂ آفریں کے پیکر ہیں
کہ جس کی دین ہے، افلاس بھوک بے کاری

فضا ابن فیضی جولائی 1923 کو ایک علمی و مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ گھر کا ماحول ادبی ہونے کی وجہ سے اس کا اثر فضا پر بھی پڑا، والدین نے نام تو فیض الحسن رکھا مگر ان کے دادا ابو المعالی محمد علی فیضی اپنے عہد کے مشہور و معروف عالم دین تھے خطاطی اور طغرہ نویسی میں کافی مہارت رکھتے تھے ساتھ ہی شعر و ادب کے بھی شیدائی تھے لہٰذا یہ شعری وراثت ان کو انھی سے حاصل ہوئی، جس کی بنسبت انھوں نے اپنا نام فضا ابن فیضی رکھ لیا اور اسی نام سے وہ شاعری کرنے لگے، اور اسی نام سے وہ اس قدر مقبول ہوئے کہ لوگ ان کا اصلی نام ہی بھول گئے۔

فضا ابن فیضی اپنی خودنوشت میں خود لکھتے ہیں:

''شاعری میرے لیے عبادت کا درجہ رکھتی ہے اور میں اسے اپنے عقیدہ حیات کا ایک مقدس اور لازمی جز سمجھتا ہوں۔ ادب کو جمالیاتی ذوق و احساس کی تسکین کا ذریعہ کہا گیا ہے، اس حقیقت کا عرفان انھی مرحلوں میں ہوا۔ میں نے 1934 میں شعر کہنا شروع کیا جب میں مدرسہ عالیہ کی ابتدائی جماعتوں میں زیر تعلیم تھا، پہلی کوشش جو غزل کے فارم میں تھی میری شاعری کا سنگ بنیاد کہی جا سکتی ہے۔''

(کلیات فضا ابن فیضی: محمد جابر زماں، ص 50-49)

فضا ابن فیضی اردو شاعری کا ایک ایسا نام ہے جس کے یہاں کلاسکی غزل کے ساتھ ساتھ جدید لہجے کا چراغ روشن ہے۔ روایت کی پاسداری کے ساتھ نئے رجحانات اور تحریکات سے ہم آہنگ ہونے کا ہنر فضا ابن فیضی کو بخوبی معلوم ہے کیونکہ سچا فنکار اور قلم کار سماج کا آئینہ ہوتا ہے، لہٰذا اس کی ذمہ داری ہے کہ زندگی کو سچائی، ایمانداری اور دردمندی کے ساتھ رقم کرے۔ خوشی ہو یا غم زندگی کے ہر زاویے سے دیکھنا اس کا گہرائی اور گیرائی سے مشاہدہ کرنا اور پھر ان مشاہدات اور تجربات کو اشعار کے پیکر میں ڈھال کر پیش کرنا ہی شاعر کا کمال ہے۔ فضا ابن فیضی کی غزلیں اپنے اندر انسانی جذبے اور احساس فکر کا حسین امتزاج رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنی ذاتی زندگی کو محور بنا کر انسانی مسائل کو نہایت سچائی اور سوز و گداز کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ہوگی نہ اپنی ذات پہ جب تک فضا گرفت
لفظوں میں کوئی جذبہ سمٹ کر نہ آئے گا

فضا ابن فیضی کو غزل سے گہرا تعلق تھا۔ بنیادی طور پر ان کی توجہ غزلیہ شاعری پر رہی جن میں عشق کے اشعار نہایت سادگی کے ساتھ کہے گئے۔ انسانی احساس، جسمانی اور نفسیاتی رشتوں کا احترام ان کی غزلوں کو وقار

> فضا ابن فیضی کی شاعری ان کی شخصیت کی سچی آئینہ دار ہے وہ ایک حساس دل اور خوددار طبیعت کے مالک تھے، قدرت نے ان کی فطرت میں شعری و ادبی صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی جس سے انھوں نے بھرپور استفادہ کیا۔ کم عمری سے ہی انھوں نے شاعری کرنا شروع کر دیا تھا، زندگی کی تلخ حقیقتوں اور حالات کی گردشوں نے ان کے قلم کو، ان کے فن کو، ان کی فکر کو، انتہا تک پہنچا دیا تھا۔

بخشتا ہے، اپنے کلام کو لفظی بازی گری سے پاک رکھا ہے، جہاں کہیں بھی عشق ومحبت کے جذبات برتے گئے وہاں روشنی کی ایک کرن پھوٹتی نظر آئی۔

ملے جو ہم کو تو شمع نوا بنا ڈالیں
وہ چہرہ چہرہ بکھرتا نکھار ایسا تھا
کبھی سلیقے سے لکھی نہ مدح عارض ولب
میں سادہ لوح بھی رنگین نگار ایسا تھا
چاندنی بن کے وہ راتوں کو ملا ہے مجھ سے
رچی ہوئی ہے ابھی تک ہواؤں میں خوشبو
اسی دیار میں کچھ خوشبوؤں کے شہر بھی ہیں
ہمیں یہ علم تیری زلف مشک بو سے ہوا

ان اشعار سے ان کے جمالیاتی ذوق کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ خوشبو سے رچی بسی چاندنی رات اور محبوب کی زلفوں کی مشک و بو سے معطر شہر، شاعر کے قلبی واردات اور عشقیہ جذبات کا انکشاف کرتا ہے۔ جس خوبصورتی کے ساتھ وہ الفاظ کو ترتیب دیتے ہیں اس سے ایک عجیب قسم کا لطف اور نیا آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ فضا ابن فیضی نے بڑی خوبی کے ساتھ رعنائی خیال کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے جس کی وجہ سے سادگی میں بھی شوخی نہاں ہے، کلاسکی رنگ میں پوری طرح غالب کا عکس نظر آتا ہے۔

کیا شخص تھا جب بولتا تو پھوٹنے لگتی
آواز چھکتے ہوئے شیشے کی طرح تھی

فضا کی شاعری کا عشقی رنگ حسن کی دل آویزیوں سے عبارت ہے، ایک جذبۂ لطیف مدھم مدھم سرگوشی کرتا رگ وپے میں اترتا محسوس ہوتا ہے اور کہیں کہیں غنچۂ قبا کو اکساتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں کہ۔

ہمارا ہاتھ صبا کی طرح نہیں گستاخ
کچھ اپنا بھید تیرا غنچۂ صبا بھی کہے

حسن و جمال کا خیال نہایت خوبصورت، لطافت اور رشک کے ساتھ وہ اپنی غزلوں کی نوک پلک درست کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شفیع احمد لکھتے ہیں:

''انھوں نے غزلوں میں حسن کا جو تصور پیش کیا ہے وہ بڑا رنگین، دلآویز اور لطیف معلوم ہوتا ہے۔ ان کے یہاں حسن محض ایک فرد اور ایک ذات میں محدود ہے۔ وہ صرف اسی کے حسن کو حسن سمجھتے ہیں، اور اسی کا بیان ان کے پیش نظر رہتا ہے۔ وہ ماورائی باتوں سے احتراز کرتے ہیں.... انھوں نے حسن کے رنگ روپ، عشوؤں، اداؤں، چال ڈھال اور جسم ولباس ہر ایک کے اثرات کو پرکشش اور واضح طور پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔''

(فضا ابن فیضی، فن اور شخصیت۔ ڈاکٹر شفیع احمد، 2001، سرفراز آفسیٹ پریس، سعید روڈ مئوناتھ بھنجن)

فضا ابن فیضی کو اردو فارسی اور عربی زبان پر عبور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں فارسی ترکیب کے ساتھ عربی الفاظ کی کثرت بھی موجود ہے لیکن جب یہ تراکیب اور الفاظ شعری اسلوب میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں تو ایک نئے معنی کی تشکیل کرتے ہیں۔ کلام میں ردا، قبا، حرم، طیور خوش نوا، بشارت نسیم جاں، سرود لوح وقلم، روح عصائے دشت کلیم، شعور نقرۂ و نیلم جیسے بے شمار الفاظ وہ تراکیب فضا کی شعری مہارت کو واضح کرتی ہیں۔ ان کی شاعری کا دائرہ وسیع ہے جس میں مختلف قسم کے مضامین شعری پیکر میں ڈھل کر نئے نئے موضوعات کو وسعت دیتے ہیں۔ فضا کی شاعری اپنے معاصرین سے بہت منفرد اور مختلف ہے وہ بہت جلد کسی تحریک یا نظریے سے متاثر ہوتے نظر نہیں آتے۔ وہ ایک آزاد تخلیقی ذہن کے مالک ہیں، ان کی شاعری ایک پختہ کلاسکی شعور کے ساتھ زمانے کے سرد وگرم احساس کی بھٹی میں تپ کر کندن کی طرح نکھرتی ہے جو قدیم وجدید شاعری کا خوشنما سنگم ہے۔ نئے اسالیب اور نئے طرز احساس سے ہم آہنگ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

تمہارے شہر میں ہم سے ادا شناس کہاں
خریدیں زخم رسیلے پھلوں کی بستی میں
شب حیات کو آئینہ کر گیا کوئی
کچھ ایسے خواب بھی آنکھوں میں بھر گیا کوئی

فضا ابن فیضی کی شاعری کی زبان سادہ ہے مگر گہری معنویت کی حامل ہے۔ وہ ایک زندہ دل انسان کی طرح غموں میں بھی مسکرانے کا جواز ڈھونڈ لیتے ہیں۔ غموں سے راہ فرار اختیار نہیں کرتے، اس سے گریزاں نہیں ہوتے، بلکہ ایک حساس دل اور دردمند انسان کی طرح بے چین ہو کر عظمت رفتہ کی یاد دلاتے ہیں اور کہتے ہیں۔

ایک ذرا حسن سلیقہ کی کمی تھی ورنہ یوں
زندگی کا حوصلہ بے حوصلوں میں تھا بہت
ٹوٹتے خوابو! کبھی تم نے پکارا ہی نہیں
آنسوؤں کے ساز بے مضراب غم بھی بولتے

اور یہ شعر کس قدر خوبصورت ہے جو طبیعت میں انبساطی کیفیت پیدا کر دیتا ہے، لفظ لفظ رجائیت سے بھرپور خوش آگہی سے معمور علم کی روشنی سے پرنور دعوت فکر دیتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

خواب خواب لمحوں کی بے قرار راہوں میں پل رہا ہوں صدیوں سے
میں بہ صورت قطرۂ وقت کا سمندر ہوں مجھ کو بے کراں رکھو

تیرے خلوص نے پہنچا دیا کہاں مجھ کو
کسی زمین پہ رہوں آسماں نظر آؤں

فضا ابن فیضی اپنی شاعری میں نئی نئی تشبیہات و استعارات کے استعمال سے تازگی پیدا کرنے کا ہنر خوب جانتے ہیں، نت نئی تراکیب اور کیفیات سے پیکر تراشی کرتے ہیں، معاشرتی مسائل جیسے خشک مضامین کو بھی نہایت دلچسپ بنا کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس کا تغزل کہیں بھی متاثر نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر محمد حسن نے 'سفینۂ زرگل' میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''عصر حاضر میں جن لوگوں نے غزل کی آبرو رکھی ہے ان میں فضا کا نام شامل ہے انھوں نے جدید غزل کو اپنے منفرد رنگ سخن کی مدد سے نئی جہت عطا کی ہے۔'' (سفینۂ زرگل، ص 12)

فضا ایک خوش فکر اور زودرس شاعر ہیں وہ خارجی زندگی کے ساتھ ساتھ حقیقی زندگی کے تمام پہلوؤں کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ فضا کا فکری وفنی سانچہ ان کے اسلوب کے پیکر میں ڈھل کرنئی کروٹوں اور جہتوں کو پوری توانائی کے ساتھ ایک نیا شعور غزلوں کو عطا کرتا ہے۔ تصویر کشی اور پیکر تراشی جب شعری اسلوب میں ڈھل کر سامنے آتی ہیں تو ایک نئی دنیا کے در کھلتے ہیں، وہ ہر مقام پر اپنی راہ الگ نکال لیتے ہیں۔

قدم قدم کے حوادث سے اب یہ کیا پوچھیں
ہمیشہ کیوں سفر روزگار ایسا تھا
خود اپنا سرخ لہو چاٹتی پھریں صدیاں
بکھرتے ٹوٹتے لمحوں کا وار ایسا تھا

'شعلۂ نیم سوز' میں محمود الٰہی ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''میں فضا ابن فیضی کو عصر حاضر کے ان فنکاروں میں شمار کرتا ہوں جن کے دم سے اردو شاعری میں چمک دمک باقی ہے جن لوگوں کو اردو شاعری میں جمود نظر آتا ہے انھیں چاہیے کہ فضا ابن فیضی کی شاعری کا مطالعہ کریں جو بہ یک وقت ماضی کا سفینۂ ادراک بھی ہے حال کی خود نوشت بھی اور مستقبل کا صحیفۂ بشارت بھی... اور سچ بات تو یہ ہے کہ وہی زبان زندہ رہتی ہے جو زمانے کے مزاج کی تبدیلی کے ساتھ اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لیتی ہے... فضا نے 'اردو زبان کی غریب الوطنی' ایک ایسی نظم تخلیق کی ہے، ہندوستان میں لسانی مسئلہ جس شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا ہے اس کا علم سب کو ہے... جس کو فضا ابن فیضی نے بے نقاب کیا ہے۔'' (ایضاً، ص 18-15)

فضا ابن فیضی نے زیادہ تر غزلیں کہیں لیکن ساتھ ہی نظمیں اور رباعیاں بھی ان کی شاعری کا خاص حصہ ہیں ایک پر فکر شعری بیانیہ ان کی غزلوں اور نظموں میں پھیلا ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے خون جگر سے اردو شاعری کی آبیاری کی، اور اس کے دامن کو وسیع تر کیا۔ نظم 'متاع رسوائی' بے حد خوبصورت نظم ہے جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ اہل علم کس طرح اہل ہوس کی صورت میں قلم کا سودا کر لیتے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہوں۔

ذہن میں جال تو بنتا رہے گیتوں کا طلسم
فن تو زندہ رہے، شاعر کا قلم نہ بکے

آہنگ، میرا قلم بنام ہم سخنان، اجنبی، نیا سال، یہ شب گزیدہ سحر، قلم کار، شعلۂ آواز، میرا شہر میرے شہر کے لوگ اور روشن اندھیرے ان کی شاہکار نظمیں ہیں جہاں جہاں انھوں نے آئینۂ درد دکھلایا ہے وہاں وہاں ان کا فن عروج تک پہنچا ہے نظم 'بنام ہم سخنان' میں نسل جدید کو پکارتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو آنے والے وقت کی آبرو ہے، تو فنکار کا اعتبار ہے، خزاں کے ذہن سے ابھری ہوئی بہار ہے، ساتھ ہی یہ بھی کہتے نظر آتے ہیں کہ۔

فضا ابن فیضی کا جوش بڑا نرالا ہے وہ ذات و کائنات کا تصور بڑے ہی انوکھے اور دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔ جب وہ غزل کے اشعار کہتے ہیں تو پوری کائنات رنگ برنگے انداز میں ان کے حواس پر طاری ہو جاتی ہے اور جب نظم کے اشعار نظم کرتے ہیں تو آگہی اور بانکپن سے پر درد اور پر اثر بنا دیتے ہیں۔

میں تیرے عہد کی مجبوریوں سے واقف ہوں
تیری حیات کی الجھن سے بے خبر تو نہیں
میں تیرا درد تیرا کرب فن سمجھتا ہوں
تیرے شعور کی نازک کرن سمجھتا ہوں
تجھے خبر نہیں، لیکن یہ حزن و مایوسی
حیات نوع کے مسائل کا حل نہیں پیارے

ایسی بے شمار شاندار نظمیں ہیں جو نوجوانوں کو بیدار اور ان کے فکری وفنی احساسات کو نیا رخ دیتی ہیں۔

فضا ابن فیضی بظاہر جو نظر آتے تھے ان کی شاعری اتنی ہی مختلف اور منفرد ہے، وہ ایک الگ مزاج اور وقار کے مالک تھے۔ ان کا کلام، ان کا لہجہ، ان کا اسلوب نگارش، سب ہی کچھ منفرد اور خاص ہے۔ 'شعلہ نیم سوز' میں بڑی شان کے ساتھ کہتے ہیں۔

جب یہ نادیدہ ہاتھ میں اپنے
ساز حسن خیال لیتا ہے
فکر واحساس کی خاموشی کو
عرض نغمہ میں ڈھال لیتا ہے

نظم 'آہنگ' میں فضا کا نیا ہی آہنگ نظر آتا ہے جو پڑھنے والے کو نہ صرف متاثر کرتا ہے بلکہ خصوصاً نوجوان نسلوں کے ذہنوں میں ترنگ پیدا کر دیتا ہے۔

نظام شوق کو محکم بنا دیا میں نے
قدم قدم پہ ہیں روشن جوانیوں کیکنول
نسیم ونکہت ونشہ کے صاف رنگ محل
صراحی و مے میں و معشوق ومہتاب وغزل
جہاں کو جنت آدم بنا دیا میں نے

فضا ابن فیضی کا جوش بڑا نرالا ہے وہ ذات و کائنات کا تصور بڑے ہی انوکھے اور دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔ جب وہ غزل کے اشعار کہتے ہیں تو پوری کائنات رنگ برنگے انداز میں ان کے حواس پر طاری ہو جاتی ہے اور جب نظم کے اشعار نظم کرتے ہیں تو آگہی اور بانکپن سے پر درد اور پر اثر بنا دیتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''فضا ابن فیضی غزل بہتر کہتے ہیں کہ نظم یہ فیصلہ بہت مشکل ہے، میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ان کی غزل کا سلسلہ اردو شاعری کے اس بنیادی اسلوب سے جڑا ہوا ہے جسے غالب نے اعتبار بخشا تھا۔''

(سفینۂ زرگل ص 13)

یہی وجہ ہے کہ نظم 'میرا قلم' میں بڑی سچائی، خلوص اور اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں۔

اس کی رعنائی نگارش میں
جذب ہے انفرادیت میری
مجھ کو میرے سخن سے پہچانو!
شعر میرے ہیں ماہیت میری

فضا کی شاعری دلوں کو روشن اور دماغ کو معطر کر دینے والی ہے۔ جو ہر دور میں تازہ شگفتہ اور علم ودانش کی روشنی سے ظلمت جہل کو مٹانے اور عہد نو کی تاریخ رقم کرنے کے ساتھ ساتھ اسلوب کی بلاغت، رعنائی نگارش، حسن کاری، فکر واحساس کا شعور اور گفتار کی شوخی سے اردو شاعری کی فضا ہمیشہ مہکتی رہے گی۔ ان کا یہ شعر ان کی زندگی، ان کی شخصیت اور ان کی شاعری کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔

وقت نے کس آگ میں اتنا جلایا ہے مجھے
جس قدر روشن تھا میں اس سے سوا روشن ہوا

■

Razia Parween
Head, Dept of Urdu,
Govt Girls Post Grajuate College
Rampur- 244901 (UP)
Mob.: 6395632129
razia.parveen78600@gmail.com

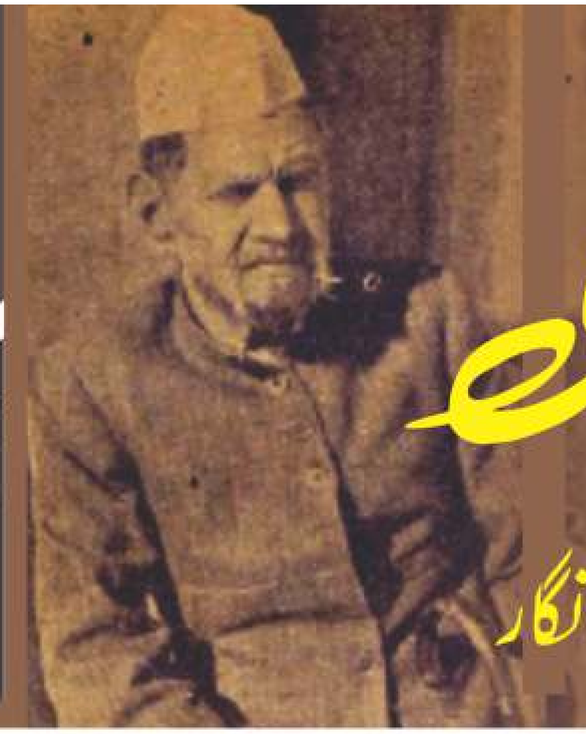

انجم مانپوری

صحافی، شاعر اور طنز و مزاح نگار

محمد جمیل اختر جلیلی

انجم مانپوری کا اصل نام 'نور محمد' ہے، جب کہ قلمی نام 'انجم مانپوری' ہے۔ معروف اپنے قلمی نام سے ہی ہوئے، ان کی پیدائش 1300ھ مطابق 1881 میں ضلع گیا کے موضع 'مانپور' میں ہوئی، ان کے والد کا نام 'شیخ باقر علی' تھا، جو پیشے سے تاجر تھے، ان کی پانچ نرینہ اولادیں ہوئیں، ایک کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا، باقی چار لڑکے: حاجی دلاور حسین، وزیر محمد، عبدالکریم اور نور محمد (انجم مانپوری) نے اپنے حصے کی زندگی پوری کی، انجم مانپوری بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔

ان کی تعلیم کا آغاز حسبِ رواج ناظرہ قرآن شریف سے ہوا، پھر ابتدائی عربی و فارسی کی تعلیم کے لیے وقت کے ممتاز اور جید علما: مولانا خیرالدین مرحوم اور مولانا عبدالغفار مرحوم کے مکتب میں شریک کیے گئے، جہاں عربی، فارسی اور دینیات کی تعلیم مذکورہ دونوں علما کی خصوصی نگرانی میں حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے 'دارالعلوم ندوۃ العلما' لکھنؤ گئے، جہاں علامہ شبلی نعمانی جیسی نابغۂ روزگار شخصیت کی شاگردی کی سعادت اور سید سلیمان ندوی جیسے طالب علم کی رفاقت نصیب ہوئی، ظاہر ہے کہ تعلیم و تربیت میں جس طرح نصاب، نظام اور ماحول کا اثر ہوتا ہے، اسی طرح استاذ اور ہم درس رفقا کا بھی خاصا اثر پڑتا ہے؛ چنانچہ ان پر بھی پڑا، اسی اثر کا نتیجہ تھا کہ ندوہ سے فراغت کے بعد بھی ان کی علمی تشنگی 'صدائے ھل من مزید' لگاتی رہی اور یہ اس کی سیرابی کے لیے 'شاہی مسجد' مرادآباد چلے گئے اور وہاں وقت کے اساطین علم: مولانا احمد حسن امروہوی اور مولانا محمود حسن سہسوانی سے اکتساب فیض کیا، پھر واپس اپنے وطن گیا آ گئے۔ (کلام انجم مانپوری، مضمون بہ عنوان: شخص و عکس، از: معین شاہد، ص23-22، مانپوری: احوال و آثار، از: اظہار خضر، ص:2-1)۔

انجم مانپوری قلم و قرطاس کے لیے پیدا ہوئے تھے؛ چنانچہ انھوں نے اسی راستے کو اختیار کیا اور نمود و شہرت کے اس مقام پر پہنچے، جہاں آج بھی ان کا نام علمی حلقوں میں نہ صرف جگمگا رہا ہے؛ بلکہ اہل تحقیق و تنقید کا موضوع بنا ہوا ہے۔

تعلیمی لحاظ سے ایک مرحلے کی تکمیل کے بعد اب اوروں کی طرح انجم کو بھی فکر معاش نے ستانا شروع کیا؛ چوں کہ ان کا پورا گھرانہ تجارت سے منسلک تھا، والد صاحب اپنے شہر کے اچھے تاجروں میں شمار ہوتے تھے، تمام بھائی بھی تجارت سے جڑے ہوئے تھے؛ چنانچہ انھوں نے بھی اسی راستے کو اختیار کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے 1907 میں اپنے ایک دوست حافظ رفیق کے ساتھ مل کر 'رفیق انجم کمپنی' کے نام سے ایک ٹیلرنگ شاپ کھولی، ایک اور دکان انھوں نے 'انجم ہارڈ ویئر شاپ لوہا دکان' کے نام سے قلب شہر میں کچہری روڈ پر کھولی، انجم ہی کی طرح اس دوکان کی شہرت پورے صوبۂ بہار میں تھی (مانپوری: احوال و آثار، ص4، انجم مانپوری، از: ڈاکٹر سید احمد قادری، ص14)؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں اس کے لیے پیدا ہی نہیں کیا تھا۔

چنانچہ ان تجارتی اور معاشی تگ و دو کو چھوڑ کر اس کام کی طرف قدم بڑھایا، جس کے لیے انھیں پیدا کیا گیا تھا۔ وہ اس وقت کے مشہور زمانہ اخبار 'زمیندار' کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خان کے پاس لاہور چلے گئے، جہاں انھیں 'زمیندار' کا سب ایڈیٹر بنایا گیا۔

مجموعی طور پر اگر ان کی علمی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں تین پہلو نمایاں طور پر ملتے ہیں (1) صحافت (2) طنز و مزاح نگاری اور (3) شاعری۔

پہلے صحافت پر گفتگو کرتے ہیں:

انجم مانپوری قلم و قرطاس کے لیے پیدا ہوئے تھے؛ چنانچہ انھوں نے اسی راستے کو اختیار کیا اور نمود و شہرت کے اس مقام پر پہنچے، جہاں آج بھی ان کا نام علمی حلقوں میں نہ صرف جگمگا رہا ہے؛ بلکہ اہل تحقیق و تنقید کا موضوع بنا ہوا ہے۔ انھوں نے کب سے لکھنا شروع کیا؟ اس کا تذکرہ تو نہیں ملتا؛ لیکن اتنی بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ طالب علمی کے زمانے سے ہی شغل خامہ فرسائی رہی ہوگی، اسی کے نتیجے میں ان کے قلم میں روانی آتی گئی اور جب علمی افق پر وہ نمودار ہوئے تو چھاتے

چلے گئے۔

انجم مانپوری کی صحافتی زندگی کا آغاز 1914 سے ہوتا ہے، جب انھوں نے ایک نیم مذہبی رسالہ 'رہنما' نکالا؛ لیکن اس میدان کی ناتجربہ کاری اور مالی دشواریوں کے سبب وہ زیادہ دن نہیں چل سکا، تاہم صحافت کی اس ناتجربہ کاری نے انھیں تجربہ کاری کا درس دیا اور ذہن ودماغ میں صحافتی دلچسپی کا ایسا نقش بٹھایا، جس نے بعد میں 'ندیم' جیسا شہرہ آفاق ماہنامہ کے نکالنے میں خوب مدد کی۔

'رہنما' نے صحافت کی طرف ان کی رہنمائی کی؛ لیکن یہ سبق بھی دیتا گیا کہ ابھی بہت کچھ سیکھنا باقی ہے، اسی خلش کو لے کر اور کچھ کچھ معاشی پریشانیوں کی وجہ سے 1918 میں وہ لاہور جا پہنچے، جہاں ان کی ملاقات مولانا ظفر علی خان سے ہوئی، وہ اس وقت 'زمیندار' نکالتے تھے اور اس کی وجہ سے ظرافت کے دریا بہاتے اور طنز کے تیر برساتے تھے۔ ظفر علی خان نے انجم مانپوری کی بڑی قدر کی، انھیں 'زمیندار' کی سب ایڈیٹری سونپ دی، سب ایڈیٹری اور مولانا ظفر علی خان کی ہم نشینی سے انجم مانپوری کو نہ صرف صحافتی تجربات حاصل ہوئے؛ بلکہ طنز ومزاح کے فنی نکات کو سمجھنے میں بھی کافی مدد ملی، اور ان کے عزم وحوصلہ کو پر لگ گئے لیکن وہ چند مہینوں کے بعد لاہور سے واپس گیا آ گئے۔

گیا آنے کے بعد سب سے پہلا کام انھوں نے اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کا کیا، اس میں کئی سال لگ گئے اور جب وہ اپنے معاشی استحکام پر مطمئن ہوگئے تو انھوں نے جون 1931 میں گیا ہی سے ایک معیاری ماہنامہ 'ندیم' کا اجرا کیا اور اس شان سے کیا کہ لوگ آج بھی اسے یاد کرتے ہیں، یہ ماہنامہ 1931 سے لے کر 1938 تک انھی کی ادارت میں نکلتا رہا، پھر انھوں نے حالات کے تحت اس ذمے داری سے سبکدوشی اختیار کر لی، جس کے بعد یہ ماہنامہ کبھی مولانا ریاست علی ندوی، کبھی حسن امام وارثی گیاوی اور کبھی مولانا محی الدین ندوی کی ادارت میں 1950 تک نکلتا رہا، اس تعلق سے قیوم خضر لکھتے ہیں: ''ندیم نے انجم مانپوری کے ادارتی عہد میں جو کارنامے انجام دیے، وہ ناقابل فراموش ہیں، اس ماہنامہ نے اپنا ایک الگ ادبی میدان بنایا، اپنی ایک الگ علمی فضا پیدا کی اور اردو دانوں کے درمیان علمی وادبی زندگی کی ایسی لہر دوڑا دی، جس کے نتیجے میں ایک اچھا خاصا ادبا وشعرا کا جرگہ (پنچایت) تیار ہوگیا...... 1933 اور 1936 میں ندیم کا بہار نمبر نکال کر ایک نئی روایت قائم کی، ان دو نمبروں نے بہار کی گزشتہ علمی وادبی عظمتوں کی بازیافت کی اور نئے ادبا وشعرا کی تخلیقات پیش کر کے ان کو ادبی دنیا میں روشناس کرایا (ارتعاش قلم، ص 137)، ندیم کے اس بہار نمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا:

> انجم مانپوری کی تحریروں میں صرف تفریحی پہلو نہیں ہوتا؛ بلکہ معاشرتی برائیوں، انسانی کمزوریوں اور روزمرہ زندگی کے تضادات کو بڑی شگفتگی سے آشکار کرتی ہیں، ان کے یہاں مزاح کی شوخی اور طنز کی کاٹ ایک ساتھ مل کر ایسا رنگ پیدا کرتی ہے، جس کی وجہ سے قاری کے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے اور دل ودماغ پر فکری لکیریں بھی کھنچ جاتی ہیں۔

''دارالمصنفین سے ندیم کا بہار نمبر مل گیا، ماشاء اللہ خوب ہی نہیں، بہت خوب ہے، خصوصاً ادبی حیثیت سے، آپ یقین فرمایئے کہ مجھے بہار والوں کے ساتھ دلی محبت ہے، یہ بات پنجاب دکن ہی کے ساتھ نہیں، یہاں (تک) کہ اودھ کے باہر صوبہ آگرہ کے لیے بھی نہیں پایا، ندوہ والوں نے مجھے اعزازی ندوی بنا لیا، جی چاہتا ہے یوں ہی اعزازی بہاری بن جاؤں۔''

(انجم مانپوری، از: سید احمد قادری، ص 19)۔

1950 میں گیا سے ایک رسالہ 'کرن' جاری ہوا، انجم مانپوری اس کے نگراں تھے، اس رسالے میں اکثر ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے، اس رسالے کا وفد اس کی نشرواشاعت کی غرض سے دوسرے شہروں کا دورہ کیا کرتا تھا، انجم بھی اس وفد میں شریک ہوتے تھے، یہ بھی ان کی صحافتی زندگی کا ایک دلچسپ پہلو ہے۔

انجم مانپوری کی طنز ومزاح نگاری میں ایک ایسی دلکش جہت ملتی ہے، جو قاری کو ہنسنے کے ساتھ ساتھ سوچنے پر بھی آمادہ کرتی ہے، ان کی تحریروں میں صرف تفریحی پہلو نہیں ہوتا؛ بلکہ معاشرتی برائیوں، انسانی کمزوریوں اور روزمرہ زندگی کے تضادات کو بڑی شگفتگی سے آشکار کرتی ہیں، ان کے یہاں مزاح کی شوخی اور طنز کی کاٹ ایک ساتھ مل کر ایسا رنگ پیدا کرتی ہے، جس کی وجہ سے قاری کے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے اور دل ودماغ پر فکری لکیریں بھی کھنچ جاتی ہیں، یہی انجم مانپوری کی فنکارانہ عظمت ہے کہ وہ ہنسی کے دامن میں اصلاح کی دولت چھپائے رکھتے ہیں اور معمولی باتوں کو ادبی وقار عطا کرتے ہیں۔

ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں جابجا علاقائی زبان کا استعمال اس خوبی سے کرتے ہیں کہ تحریر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے؛ لیکن اُس کے لیے، جو اس علاقے کی زبان سے واقفیت رکھتا ہو، ناواقفوں کے لیے تو 'تعقیدِ لفظی' سے معنون ہے، قیوم خضر ان کی اس خوبی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مانپوری نے اپنے انشائیوں میں خاص طور پر مقامی مگہی الفاظ کا استعمال جس دھڑلے اور حسن وخوبی کے ساتھ کیا ہے، اس سے ان کی ذہانت وفطانت کے ساتھ ساتھ مقامی بولی سے دلی لگاؤ کا پتہ چلتا ہے اور اس سے بھی واقفیت ہوتی ہے کہ ان کی نظر جزئیات وتفصیلات پر کافی گہری ہے، نیز چھوٹی چھوٹی بات بھی ان کی ذہنی گرفت سے باہر نہیں۔'' (ارتعاش قلم، ص: 138)

انجم مانپوری بلاشبہ ایک بڑے طنز ومزاح نگار تھے مگر مزاح نگاری کے افق پر چمکنے کے باوجود انھیں وہ حیثیت نہیں مل پائی، جو ملنی تھی، اس سلسلے میں پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''اس میں شبہ نہیں کہ نثر کے مزاحیہ ادب میں مانپوری کا اثاثہ شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی اور کنہیا لال کپور وغیرہ سے کم نہیں ہے؛ مگر مانپوری کے کارناموں کی مجموعی طور پر وہ شہرت نہیں ہوئی، جو ان کے ہم صف دوسرے ادیبوں کو حاصل ہوئی۔''

(کلام انجم مانپوری، ص 7)

سید شہاب الدین دسنوی کے مطابق:

''...... یہ سب ہوتے ہوئے بھی انجم مان پور کے تھے اور مان پور بہار میں تھا، رسالہ 'ندیم' گیا سے شائع ہوتا تھا اور گیا صوبہ بہار کا شہر تھا؛ اس لیے اردو دنیا نے، جو اس وقت غیر منقسم ہندوستان پر مشتمل تھی، اس بہاری طنز نگار کا کچھ زیادہ نوٹس نہیں لیا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح شوکت تھانوی اگر کچھ اور نہ بھی لکھتے تو ان کا مضمون 'سودیشی ریل' ہی انھیں اردو کے طنزیہ ادب میں جگہ دلانے کے لیے کافی تھا، ٹھیک اسی طرح انجم مانپوری کا مضمون 'میر کلو کی گواہی' ہی انھیں اردو کے طنز نگاروں کی صف میں لا کھڑا کر دینے کے لیے کافی ہے۔'' (کلام انجم مانپوری،ص 4-5)

افصح ظفر کا خیال ہے:

''ہوسکتا ہے کہ مانپوری خط مشرق میں رہنے کی وجہ سے ایسے وقت میں (جہاں مرزا فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری وغیرہ نے ظرافت نگاری میں شہرت حاصل کر لی تھی) نظر انداز کر دیے گئے، پھر بھی مانپوری کے اتنے بھرے پُرے کارنامے کو نظر سے اوجھل کر دینا ایک ستم ظریفی سے کم نہیں، نظر انداز کر دینے کی ایک شکل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ صنفی لحاظ سے مانپوری کی نثری تحریروں میں کوئی واضح نقش نہیں ابھرتا۔''

(نقد جستجو،ص 153)

ان سب کے باوجود بقول سید محمد حسنین:

''مانپوری کے انشائیے اردو کے چند معیاری انشائیوں پر پورے اترتے ہیں، ان میں نفیس مزاح اور ہلکے طنز کا امتزاج ہوتا ہے۔'' (بہار کے نو چراغ،ص:42)

صرف یہی نہیں کہ انجم کے انشائیے معیاری تھے؛ بل کہ چشم حقیقت سے اگر نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات بھی مل جائے گی کہ ان کی تحریروں میں جو کچھ بھی ہے، وہ سب ان کا اپنا ہے، اپنے سماج سے جڑا ہوا ہے، اپنی زمین سے تعلق رکھنے والا ہے، کسی کا چربہ نہیں، افصح ظفر رقم طراز ہیں:

''اردو میں یوں تو طنزیہ اور مزاحیہ کردار کئی ایسے ہیں، جنھوں نے خوب نام کمایا ہے؛ مگر ہم سب جانتے ہیں کہ یہ کردار اکثر و بیشتر مانگے کا اجالا ہیں، جیسے: سرشار کا خوجی اور آزاد، منشی سجاد حسین کا حاجی بغلول، ایم اسلم کا مرزا جی، امتیاز علی تاج کا چچا چھکن، شوکت تھانوی کا قاضی جی اور عظیم بیگ چغتائی کا مرزا جنگی، یہ

سارے کردار ناپ تول کر تراشے گئے ہیں، ان کرداروں کی نشو و نما میں ان کے خالقوں نے گرچہ پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے؛ لیکن ان کرداروں کو دیکھ کر اور سمجھ کر یہ کھٹک ضرور ہوتی ہے کہ یہ کردار کسی نہ کسی طرح ماضی کے یوروپی ادب کے مختلف کرداروں سے متاثر ہو کر تخلیق کیے گئے ہیں، اردو کے مزاحیہ ادب میں صرف انجم مانپوری کو ہی یہ فخر حاصل ہے کہ ان کے پاس ''میر کلو'' کی شکل میں ایک ایسا کردار ہے، جس کی تخلیق سرتاسر ہندوستان کی آب و ہوا میں ہوئی ہے...... مانپوری کا یہ کردار اپنے مخصوص سانچے میں ڈھل کر اس طرح ہمارے سامنے آتا ہے اور تمام صورت حال میں ایک ایسی علامت کے طور پر ابھرتا ہے کہ ہم اس پر فدا ہو جاتے ہیں، مانپوری کو زندہ رکھنے کے لیے میر کلو کا کردار کافی ہے۔'' (نقد جستجو،ص 161-64)

انجم مانپوری ایک بہترین شاعر بھی تھے؛ لیکن بنیادی طور پر وہ ایک مزاحیہ شاعر تھے اور جس طرح وہ نثری تخلیق میں طنز و تعریض کے تیر برساتے اور مزاح کی قوس قزح بکھیرتے تھے، شاعری میں بھی وہ اس رنگ ڈھنگ اور روش و اطوار کو اپناتے تھے، پروفیسر عبدالمغنی ان کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''سب سے پہلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہجویات انجم میں طنز، مزاح اور ظرافت سبھی عناصر موجود ہیں؛ لیکن ان میں غالب عنصر مزاح کا ہے اور گاہے گاہے ظرافت کے آثار بھی پائے جاتے ہیں اور طنز خال خال ہے، مزاح کے عنصر (Humour) کی ترکیب انجم کے کلام میں کیفیات اور الفاظ دونوں سے ہوتی ہے، وہ چن چن کر ایسے واقعات کو لیتے ہیں، جن میں بھونڈا پن پایا جاتا ہے، پھر موزوں الفاظ و تراکیب سے وہ اس بھونڈے پن کو بہت تیکھا بنا کر پیش کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں پڑھنے والے کے منھ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹنے لگتا ہے، اس مزاح میں کبھی کبھی طنز (Irony) اور ظرافت (Wit) کی چاشنی بھی ہوتی ہے، جس سے مزاح کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے اور معانی کی نئی تہیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔'' (کلام انجم مانپوری،ص 8)

علامہ جمیل مظہری ان کی شاعری کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''بہرحال! اپٹوڈیٹ شاعری میں انھوں نے خاص اپنی شاعری کے جو نمونے پیش کیے ہیں، وہ ڈنکے کی چوٹ پر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مانپوری نے اگر نثر کے ساتھ نظم کو بھی اپنی شاعری کا آلہ بنایا ہوتا تو اکبرالہ آبادی کی خلافت کا مسئلہ بغیر کسی نزاع کے ان کے ہاتھ پر طے ہو جاتا۔''

(انجم مانپوری، از: سید احمد قادری،ص 76)

یہ گویا ایک بڑے شاعر کی طرف سے ایک سند ہے کہ وہ ایک مزاحیہ اور ظریفانہ شاعری کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے؛ ساتھ ہی انھوں نے سنجیدہ شاعری بھی کی ہے؛ لیکن بقول قیوم خضر: ''مانپوری کی سنجیدہ شاعری کے مقابلہ میں ان کی مزاحیہ شاعری کا رنگ زیادہ چوکھا ہے۔''

'نمونہ از مشتے خروارے' کے طور پر یہ کافی ہے، ورنہ اس طرح کے مزاح، طنز، تعریض؛ بلکہ شگوفے اور پھلجھڑیاں چنتے چنتے پوری ایک کتاب ہو جائے گی۔

بہرحال! صحافت کی دنیا کا چمکتا یہ ستارہ، طنز و مزاح نگار کے روپ میں قارئین کو ہنسانے اور غور و فکر کے پہلو دینے اور اپنے شاعرانہ کمال اور الفاظ و معانی سے ہم آہنگ پر لطف مفہوم پیدا کرنے والا یہ فنکار 27 اگست 1958 بوقت پانچ بجے شام اس دار فانی سے رخصت ہو گیا اور ایسے نقوش ثبت کر گیا جو تا دیر ادبی افق پر جگمگاتے رہیں گے۔

■

Md. Jamil Akhtar Jaleeli
Jamia Umme Salama, Firdous Nagar,
P.O: Madaidih, P.S: Topchanchi,
Dist: Dhanbad-828402 (Jharkhand)
Mob:8292017888
jamiljh04@gmail.com

شاہ فیصل

ڈاکٹر راہی معصوم رضا

گنگا جمنی تہذیب کے امین

ادب کی دنیا میں بعض نام ایسے ہوتے ہیں جو عہد کی روح بن کر باقی رہتے ہیں۔ ڈاکٹر راہی معصوم رضا بھی انھی میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں میں انسان دوستی کی حرارت، مساوات، انصاف کا وقار اور ہندوستانی تہذیب کی گنگا جمنی خوشبو کو ایک ایسی زبان دی جس میں ایک پوری تہذیب سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ وہ صرف ایک ادیب نہیں بلکہ ایک فکری معمار تھے۔ انھوں نے کہانی، نظم اور مکالمے تینوں کو ایک ایسا نیا فکری اور اخلاقی رخ دیا جس میں انسان کو ہر بحث وعقیدے کا مرکز قرار دیا۔ ان کے نزدیک ادب کا مقصد محض تفریح نہیں بلکہ انسانی شعور کی بیداری ہے۔

یکم ستمبر 1927 کو اتر پردیش کے ضلع غازی پور کے علمی اور تہذیبی مزاج رکھنے والے گاؤں گنگولی میں آنکھ کھولنے والے اس لڑکے کے گھر کی فضا میں علم کی خوشبو گھلی ہوئی تھی۔ زندگی کے ابتدائی ایام ان کے لیے آسان نہ تھے۔ گیارہ برس کی عمر میں پولیو نے جسم کو ناتواں کر دیا اور بعد ازاں تپ دق (ٹی۔ بی) نے انھیں طویل عرصے کے لیے بستر سے باندھ دیا۔ اس علالت کی طوالت میں کتابیں ان کی دنیا بن گئیں— چند ہی ماہ میں انھوں نے گھر کی تمام کتابیں پڑھ ڈالیں۔ بیماری کے دنوں میں جب وہ چلنے پھرنے سے قاصر تھے تو ان کے والد نے ان کی دلجوئی کے لیے گھر کے ایک بزرگ ملازم کلو کاکا کو ان کے پاس مقرر کر دیا۔ کلو کاکا دن بھر راہی کو قصے کہانیاں سنایا کرتے، کبھی راجہ رانی کے، کبھی جن بھوت کے اور کبھی عشق و ایثار کے قصے۔ رفتہ رفتہ وہ کہانیاں ان کے اندر تخیل کی ایک روشن دنیا آباد کرنے لگیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کلو کاکا کے لبوں سے نکلنے والے ہر قصے نے راہی کے اندر کے کہانی کار کو جنم دیا۔ راہی خود کہا کرتے تھے:

''اگر کلو کاکا نہ ہوتا تو میں کبھی کہانی نہ لکھ پاتا۔''

گویا کلو کاکا کی کہانی سنانے کی عادت نے راہی کے ذہن میں تخلیقی شعور کی وہ پہلی کرن روشن کی جو آگے چل کر ناول، شاعری اور فلمی مکالموں میں ایک درخشاں سورج بن گئی۔

صحت یاب ہونے کے بعد انھوں نے دوبارہ تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ ابتدائی تعلیم غازی پور میں حاصل کرنے کے بعد وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہنچے جہاں سے انھوں نے 'ہندوستانی ادب' میں پی ایچ ڈی کی۔ ان کا تحقیقی مقالہ 'طلسم ہوش ربا: ایک تنقیدی مطالعہ' اردو داستانی روایت کے لسانی و فکری پہلوؤں کا گہرا تجزیہ تھا۔

راہی کی شخصیت میں علمی رُعب اور تہذیبی نرمی یکجا تھی۔ کہا جاتا ہے کہ علی گڑھ میں اگر مجاز کے بعد کوئی شخصیت سب سے زیادہ مقبول تھی تو وہ راہی معصوم رضا کی تھی۔ خاص طور پر طالبات میں ان کی شخصیت اور گفتگو کا بڑا سحر تھا۔ ان کی گفتگو، اندازِ بیان اور شخصیت سبھی میں ایک خاص کشش تھی۔ وہ معمولی سی لنگڑاہٹ کے ساتھ چلتے تھے مگر یہی ان کی شخصیت کا حصہ بن گیا تھا۔ اکثر سفید شیروانی، علیگڑھی پاجامہ، واسکٹ، لبوں پر پان، کالی عینک لگاتے۔

کہا جاتا ہے کہ جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے تو اکثر سنیما جایا کرتے اور ایک ہی فلم کو کئی کئی بار دیکھتے۔ ان کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک قلم اور ایک نوٹ بک رہتی جس میں وہ فلم کے مکالمے، مناظر اور اظہار کے انداز نوٹ کرتے رہتے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ محض فلم دیکھنے نہیں بلکہ فلم کو پڑھنے اور سمجھنے گئے ہوں۔ یہی وہ دَور تھا جب ان کے اندر کہانی لکھنے اور مکالمہ تراشنے کا رجحان خاموشی سے پروان چڑھ رہا تھا۔

ابتدائی طور پر راہی علی گڑھ یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے مگر ادارہ جاتی سیاست اور ذاتی اختلافات کے باعث وہ علی گڑھ چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ بظاہر یہ ایک صدمہ تھا مگر حقیقت میں یہ تخلیقی تقدیر کا وہ موڑ ثابت ہوا جس نے انھیں ممبئی کے راستے پر ڈال دیا۔ گرچہ اس وقت وہ لمحہ ان کے لیے نہایت سخت اور کٹھن تھا مگر وقت نے یہ ثابت کیا کہ علی گڑھ کی محرومی نے ممبئی کی کامیابی کا دروازہ کھولا۔ یوں وہ درس و تدریس کے دائرے سے نکل کر اُس وسیع دنیا میں داخل ہوئے جہاں لفظ صرف پڑھے نہیں جاتے بلکہ بولتے، چلتے اور دلوں پر اثر ڈالتے ہیں۔ نتیجتاً وہ سنیما کی دنیا کے استاد بن کر اُبھرے— وہ استاد جو کرداروں کو لفظوں سے جلا دیتا ہے اور مکالموں میں زندگی کی حرارت بھر دیتا ہے۔

راہی معصوم رضا کے ادبی سفر کا آغاز الہ آباد کے جریدے 'رومانی دنیا' سے ہوا جہاں وہ 'شاہد اختر' کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ ابتدا میں شاعری ان کے اظہار کا وسیلہ تھی۔ ان کے شعری مجموعے 'موجِ گل: موجِ صبا'،

’اجنبی شہر: اجنبی راستے‘ اور ہندی میں ’میں ایک فیری والا‘ ان کے داخلی کرب، فلسفیانہ گہرائی اور سماجی شعور کے مظہر ہیں۔

ان کی شاعری میں روایت اور جدیدیت کا حسین امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف اردو غزل کی لطافت اور دوسری جانب جدید نظم کی بے باکی۔ وہ اپنے عہد کے تضادات کو اس طرح لفظوں میں ڈھالتے کہ شعر سماج کا آئینہ بن جاتا۔ ان کی نظم ’دیش میں نکلا ہوگا چاند‘ جب جگجیت اور چترا سنگھ کی آواز میں سنائی دیتی ہے تو محسوس ہوتا ہے جیسے ہندوستانی تہذیب کی کوئی دھیمی دھڑکن بول اٹھی ہو۔

راہی معصوم رضا نے اگرچہ اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا، مگر نثر میں بھی ان کی تخلیقی پہچان اُسی وقار اور معنوی گہرائی کے ساتھ اُبھری جس نے انھیں اردو ادب میں ایک مستقل مقام عطا کیا۔ ان کے فکشن میں دیہی ہندوستان کی خوشبو ہے، جاگیرداری کے زوال کا کرب، تقسیمِ ہند کے زخموں کی چبھن اور سب سے بڑھ کر عام انسان کے خواب وخوف کی دھڑکن ہے۔

ان کا ناول ’آدھا گاؤں‘ ان کے فکشن کا تابندہ مینار ہے۔ یہ ناول محض ایک قصے کی روداد نہیں، بلکہ اس سرزمین کی اجتماعی یاد ہے جسے تقسیم نے دو حصوں میں بانٹ دیا۔ یہ ناول بتاتا ہے کہ کیسے تقسیمِ ہند نے ایک ایسی تہذیب کو دو حصوں میں بانٹ دیا جو صدیوں سے ایک ہی دھرتی پر سانس لے رہی تھی۔ گاؤں گنگولی کی زندگی میں ہندو۔ مسلم یکجہتی، میل جول، اور باہمی انحصار کی تصویریں ابھرتی ہیں۔ راہی نے دکھایا کہ ہندو۔ مسلمان کا رشتہ صدیوں کی مٹی، پانی، کھیت، اور رشتوں میں گھلا ہوا تھا۔ اور بتایا کہ سیاسی فیصلے جسم بانٹ سکتے ہیں مگر دل نہیں۔ لکھتے ہیں کہ:

’’یہ زمین ہماری ہے، یہ گاؤں ہمارا ہے، اور ہم سب ایک ہی دھوپ، ایک ہی چھاؤں کے مکین ہیں۔‘‘

یہ مکالمہ نہیں، ہندوستانی ضمیر کی دھڑکن ہے۔ یہی گنگا جمنی پیغام اس ناول کا بنیادی نکتہ ہے۔

ناول ’ٹوپی شکلا‘ میں مذہب اور انسان کے تضاد کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ اس ناول میں راہی نے مذہب سے زیادہ انسان کے ضمیر کو موضوع بنایا۔ بالبھدر نارائن شکلا اور مرزا جرگم علی آبادی کی دوستی اس بات کی علامت ہے کہ مذہب انسان کو جدا نہیں کرتا۔ یہ کہانی ہندوستانی سماج کی اُس سادہ سچائی کو بیان کرتی ہے کہ ’’ہم سب کی خوشی ایک دوسرے کے وجود سے وابستہ ہے۔‘‘

ناول ’کٹرہ بی آرزو‘ 1970 کی دہائی کی ہندوستانی سیاست اور ایمرجنسی کے پس منظر میں لکھا گیا۔ یہاں بھی راہی نے ہندو۔ مسلم نہیں، بلکہ انسان۔ اور۔ اقتدار کی کشمکش دکھائی۔ یہاں راہی مذہب کے پس منظر میں چلا جاتا ہے اور انسان سامنے آ کھڑا ہوتا ہے — ایک ایسا انسان جو ظلم، خوف، اور بے بسی کے درمیان بھی اپنی انسانیت بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

’نیم کا پیڑ‘ یہ کہانی غلامی سے آزادی تک ہندوستانی سماج کی تبدیلی کی کہانی ہے۔ یہ کہانی اس کسان کی ہے جو اپنے بیٹے کے لیے تعلیم اور عزت کا خواب دیکھتا ہے، مگر جب وہی بیٹا اقتدار میں پہنچ کر بدعنوانی میں ڈوب جاتا ہے، تو راہی ہمیں یہ دکھاتے ہیں کہ آزادی صرف نظام کی تبدیلی نہیں، سوچ کی تطہیر بھی ہے۔ یہ ناول دراصل جمہوریت کے باطن میں چھپی جاگیرداری کا آئینہ ہے۔ راہی کا قلم یوں کہتا ہے:

’’آزادی اگر انصاف نہ دے سکے تو وہ غلامی سے بدتر ہے۔‘‘

یہ جملہ گنگا جمنی تہذیب کے اخلاقی جوہر کو ظاہر کرتا ہے — کہ انسان کا اصل درجہ اس کے کرم سے طے ہوتا ہے، مذہب سے نہیں۔

ان کے دیگر ناولوں میں ’دل ایک سادہ کاغذ‘ اور ’اوس کی بوند‘ (انسانی رشتوں کی نزاکت اور روزمرہ کی اخلاقیات)، ’سین نمبر 75‘ (شہری زندگی کی داخلی حرکیات) اور ’چھوٹے آدمی کی بڑی کہانی‘ (1965 کی جنگ کے ہیرو عبدالحمید کی عظمت پر مبنی) شامل ہیں۔ اسی طرح ’کرانتی کتھا‘ 1857 سے آزادی تک کے انقلابی واقعات کو زبان دیتی ہے اور یہ باور کراتی ہے کہ قومی شعور کس طرح قربانیوں کی مٹی سے نمو پاتا ہے۔ ان سب ناولوں میں ایک بات مشترک ہے: راہی نے ہندوستان کو مذہب کے خانے میں نہیں، بلکہ تہذیب کے تسلسل میں دیکھا۔ ان کے کردار گنگا کے پانی کی طرح رواں، اور جمنا کی طرح ملائم ہیں۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ 1968 میں راہی معصوم رضا علی گڑھ کی تلخ یادوں کو پس پشت چھوڑ کر ممبئی کی چمکتی دنیا میں نئے اظہار کی تلاش میں پہنچے۔ یوں وہ علی گڑھ کی درسگاہوں سے نکل کر فلمی دنیا کے اس دروازے پر آ کھڑے ہوئے جہاں لفظ صرف پڑھے نہیں جاتے بلکہ بولتے اور زندہ رہتے ہیں۔ ممبئی میں آغاز آسان نہ تھا۔ روزگار کے وسائل محدود تھے مگر حوصلہ بلند۔ ان کے پاس بس ایک طاقت تھی اور وہ تھی قلم کی طاقت۔ اسی قلم نے ان کے لیے وہ راستے کھولے جن پر چلنا ابتدا میں ناممکن دکھائی دیتا تھا۔ اس دوران دو اہلِ قلم شخصیات نے انھیں سہارا دیا: دھرم ویر بھارتی اور کملیشور۔ یہ دونوں اس وقت ادبی دنیا کے بڑے ستون تھے۔ انھوں نے راہی کو کہانی لکھنے کے لیے ایڈوانس معاوضہ دیا تاکہ وہ مالی دباؤ سے آزاد ہوکر اپنی تخلیق پر توجہ دے سکیں۔ مگر راہی کے قلم میں روشنی اتنی تیز تھی کہ جلد ہی فلم سازوں کی نظر اُن پر جا ٹھہری۔ کملیشور، دھرم ویر بھارتی اور بی۔ آر۔ چوپڑا جیسے فلم سازوں نے ان کی صلاحیت کو پہچانا اور یوں ان کے فلمی سفر کا آغاز ہوا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب ایک استادِ ادب سینما کے قلمکار اور شاعر میں ڈھل گیا۔ جیسا کہ راہی خود لکھتے ہیں:

’’علی گڑھ نے مجھے سوچنا سکھایا اور ممبئی نے اسے بولنا۔‘‘

اور پھر وہ بولے بھی ایسے لہجے میں کہ پورا ہندوستان سننے لگا۔

راہی معصوم رضا تقریباً پچیس برس تک فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔ اس دوران انھوں نے تین سو سے زائد فلموں کے مکالمے اور اسکرین پلے تحریر کیے۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو انھیں ہندوستانی سینما کے سب سے مؤثر قلم کاروں میں شامل کرتا ہے۔ ان کی چند

مشہور اور یادگار فلمیں درج ذیل ہیں:

ان کی ابتدائی فلموں میں 'مہمان' (1971)، 'راستے کا پتھر' (1972)، 'پرچھائیاں' (1972)، 'پتھر اور پائل' (1974)، 'پریم کہانی' (1974)، 'جولی' (1975)، 'میلی' (1975)، 'علاپ' (1977) اور 'میں تلسی تیرے آنگن کی' (1978)، 'گول مال' (1979)، 'سرگم' (1979)، 'اندھا قانون' (1983)، 'طوائف' (1985) شامل ہیں۔ فلم 'میں تلسی تیرے آنگن کی' پر انھیں فلم فیئر ایوارڈ ملا۔

بعد کے برسوں میں انھوں نے 'کرز'، 'جاگ اُٹھا انسان'، 'بے مثال'، 'گونج'، 'لمحے'، 'آئینہ' اور دیگر فلموں کے مکالمے لکھے۔ ان فلموں میں راہی نے محبت، اخلاق، طبقاتی تصادم، عورت کی حیثیت اور ہندوستانی معاشرت کی روح کو الفاظ دیے۔ ان کے مکالموں میں زبان کی شائستگی اور عوامی مزاج دونوں کا امتزاج ملتا ہے۔ جس سے فلم محض تفریح نہیں بلکہ احساس کی صورت بن گئی۔ مثلاً فلم 'میں تلسی تیرے آنگن کی' میں نرمی سے کہا گیا جملہ:

''محبت اگر قربانی نہیں مانگتی' تو وہ سوداگری ہے۔''

یا فلم ''گول مال'' کا مکالمہ:

''سچ بولنے والا ہمیشہ بیوقوف لگتا ہے، کیونکہ جھوٹ سب کی عادت بن چکی ہے۔''

یہ سادہ مگر عمیق جملے راہی کے اندر کے اخلاقی اور فکری انسان کی گواہی دیتے ہیں۔

بطور نغمہ نگار بھی انھوں نے 'علاپ'، 'گونج'، 'دو شکاری' اور 'اے میرے دل' جیسے گیتوں میں نرمی اور لَے کا توازن پیدا کیا۔ جگجیت سنگھ کے البم 'دیش میں نکلا ہوگا چاند' نے ان کے لفظوں کو صوتی جاودانی عطا کی۔

راہی معصوم رضا کی شہرت کا سب سے درخشاں باب دوردرشن کا تاریخی سیریل 'مہابھارت' (90-1988) ہے۔ جب بی آر چوپڑا نے اس رزمیہ کو ٹیلی ویژن کے پردے پر پیش کرنے کا ارادہ کیا تو مکالمہ نگاری کے لیے راہی معصوم رضا سے رجوع کیا۔ اُس وقت تک راہی فلمی دنیا میں ایک مستند نام بن چکے تھے؛ ان کے پاس کئی فلموں کے اسکرپٹس زیرِ تکمیل تھے اور وہ بیک وقت مختلف منصوبوں پر مصروفِ عمل تھے۔ انھوں نے ابتدا میں وقت کی کمی کا حوالہ دیتے ہوئے مہابھارت لکھنے سے معذرت کر لی۔

تاہم جب ان کے انکار کی خبر اخبارات میں شائع

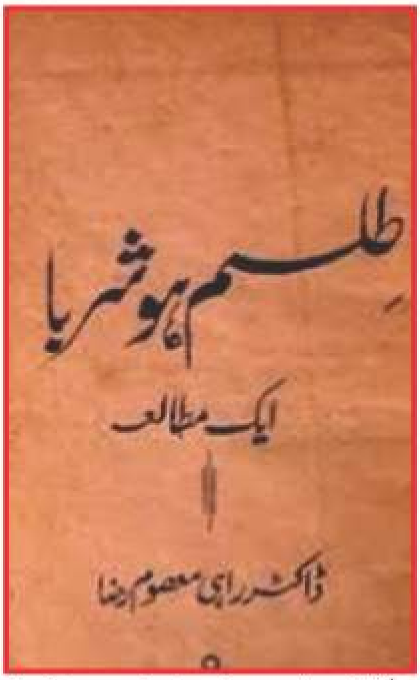

ہوئی تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بی۔ آر۔ چوپڑا کے دفتر میں خطوط کا انبار لگ گیا۔ اکثر چٹھیوں میں یہ اعتراض درج تھا:

''کیا سارے ہندو مر گئے ہیں جو آپ ایک مسلمان سے مہابھارت لکھوا رہے ہیں؟ ایک مسلمان ہندو مہاکاوی کیسے لکھ سکتا ہے؟''

یہ بات جب راہی کے کانوں تک پہنچی تو وہ خاموش نہ رہ سکے۔ جو شخص وقت کی کمی کے باعث پیچھے ہٹ گیا تھا، وہ اس جملے سے لرز اٹھا۔ انھوں نے کہا: ''کیا مہابھارت لکھنے کے لیے ہندو ہونا ضروری ہے؟''

یہ سوال ان کے اندر کے ہندوستانی ضمیر کو جھنجھوڑ گیا۔ انھوں نے فوراً بی۔ آر۔ چوپڑا سے رابطہ کیا اور ان کے لبوں سے نکلے یہ الفاظ تاریخ میں ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے:

''میں ہی مہابھارت لکھوں گا۔ میں گنگا کا بیٹا ہوں۔ مجھ سے زیادہ ہندوستان کی تہذیب اور ثقافت کو کون جانتا ہے؟''

یہ جملہ محض ردِعمل نہیں بلکہ ایک فکری اعلان تھا کہ ہندوستانیت کسی مذہب کی جاگیر نہیں' ایک مشترکہ روح کا نام ہے۔ یہ جواب دراصل ایک ادبی اعلانِ وفاداری تھا' مذہب سے نہیں! اس سرزمین کی مشترکہ روح سے۔ یہی جملہ گنگا جمنی تہذیب کی روح ہے۔

جاوید صدیقی کے مطابق مہابھارت کے مکالموں کے خالق کا فیصلہ ہو گیا۔ اب سوال یہ اٹھا کہ رزمیہ کی تمہید کیسے ہو — چونکہ مہابھارت کی روایت کے مطابق، شری گنیش دیو روایت نگار کی dictation لکھتے ہیں، تو پردۂ اسکرین پر یہ کیسے دکھایا جائے؟ کسی رشی منی کو بٹھایا جائے؟ یا کسی پیپل کے پیڑ کے نیچے ایک درویش کو دکھایا جائے؟ جب بات راہی تک پہنچی' تو انھوں نے وہ جملہ کہا جو اس رزمیہ کی بنیاد بن گیا: انھوں نے کہا کہ:

''دنیا کا سب سے بڑا مؤرخ وقت ہے — کہانی وہی سنائے گا۔'' یوں سیریل کا آغاز ان کے لکھے ہوئے لازوال مکالمے سے ہوا: ''میں سمے ہوں''

ڈاکٹر جاوید صدیقی نے بتایا کہ اُس زمانے میں جب مہابھارت نشر ہوتی تھی، پورے ملک میں گویا کرفیو سا لگ جاتا تھا۔ سڑکیں سنسان، دکانیں بند، اور گھروں میں لوگ ٹی وی کے سامنے جیسے عبادت میں بیٹھے ہوں۔ میں خود وہ وقت جانتا ہوں، ہوٹلوں میں صرف ایک پروگرام چلتا تھا — مہابھارت!

2 اکتوبر 1988 کو جب 'مہابھارت' نشریات کا آغاز ہوا اور سنسکرت شلوک کے بعد تو راہی کے لکھے یہ الفاظ گونجے:

'میں سمے ہوں' میں نے انسان کو جنم لیتے، مٹتے اور بھٹکتے دیکھا ہے۔ میں نے دھرم کو ادھرم بنتے اور ادھرم کو دھرم کے لبادے میں چھپتے دیکھا ہے۔''

یہ مکالمہ فلسفۂ حیات کا عکاس ہے — جہاں 'وقت' خود انصاف کا پیمانہ ہے۔ یہ مذہب سے نہیں، ضمیر سے فیصلہ کرتا ہے۔

کچھ دیر بعد ہم سننے والے ہیں:

''جب جب دھرم کی ہانی ہوتی ہے، تب تب میں آتا ہوں۔''

یہ راہی کا پیغام ہے کہ دھرم کسی ایک قوم کی جاگیر نہیں بلکہ ہر اس دل کا ہے جو سچائی اور انصاف پر قائم ہو۔ اسی رزمیہ میں وہ مکالمہ بھی آتا ہے جس نے تہذیبی اخلاق کو نئی بلندی دی:

''پاپ اور پن میں اتنا ہی فرق ہے جتنا پانی اور آنسو میں۔ پانی جسم کو دھو دیتا ہے، اور آنسو روح کو۔ جو اپنے گناہ پر رویا، وہ پاپی نہیں — انسان ہے۔''

یہ جملہ انسانی اخلاقیات کی معراج ہے۔ یہاں راہی مذہب کو انسانیت کے پیمانے پر پرکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ مکالمے مہابھارت کو مذہبی رزمیہ سے نکال کر انسانی رزمیہ بنا دیتے ہیں۔ یہ آواز مہابھارت سے

نکل کر ہر عہد کے لیے پیغام بن جاتا ہے۔

ان کا ہر جملہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہندوستان کی اصل شناخت گنگا کے پانی کی طرح سب کے لیے ایک ہے— چاہے وہ کسی بھی دھرم، کسی بھی زبان یا کسی بھی علاقے سے ہو۔

مہابھارت کے اختتام پر 'وقت' کی صدا آتی ہے:

''وقت سب کا امتحان لیتا ہے— بادشاہوں کا بھی، بھکشوؤں کا بھی۔ وقت کسی کا مرید نہیں۔ وقت صرف ایک ہی چیز مانتا ہے— کرم۔''

یہ مکالمہ گویا خود راہی کا عقیدہ ہے۔ ان کے نزدیک انسان کو اس کے کرم سے پہچانو، مذہب سے نہیں۔ یہی وہ پیغام ہے جو گنگا جمنی تہذیب کا نچوڑ ہے۔

راہی معصوم رضا نے اپنے قلم سے ہندو اور مسلمان کے بیچ لکیر نہیں کھینچی بلکہ ایک پُل بنایا۔ ان کی اردو میں ہندی کی خوشبو ہے، اور ہندی میں اردو کا ذائقہ۔ یہی زبان، یہی لہجہ، یہی نرمی 'گنگا جمنی تہذیب' کی روح ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی اور تحریروں سے یہ پیغام دیا کہ ہندوستان مذہب سے نہیں، محبت سے زندہ ہے۔ ان کے ہر مکالمے میں گنگا کی روانی ہے، اور ہر جملے میں جمنہ کی نرمی۔ وہ اس تہذیب کے نقیب ہیں جہاں انسان سب سے بڑا عقیدہ ہے اور جہاں دل ہی سب سے بڑا مندر۔ ''سچائی تلوار سے نہیں، دل سے جیتی جاتی ہے۔ تلوار خون بہاتی ہے، دل محبت۔ اور محبت کا بہایا ہوا خون دھرتی کو مہکا دیتا ہے۔'' یہی ہے راہی کا فلسفہ، یہی ہے گنگا جمنی تہذیب کا ماحصل اور یہی ہے ہندوستان کی اصل شناخت۔ ڈاکٹر نمیتا سنگھ راہی معصوم رضا پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''وہ کہا کرتے تھے کہ اس ملک میں پنجابی، مراٹھی، گجراتی، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی تو دکھائی دیتے ہیں، مگر اگر کوئی سب سے چھوٹی اقلیت ہے تو وہ 'ہندوستانی' کی شناخت ہے۔ اسی لیے وہ ہمیشہ اس بات پر مصر رہے کہ ہمیں اپنی مشترکہ گنگا۔ جمنی تہذیب کی حفاظت کرنی ہے۔ وہ اپنے آپ کو فخر سے 'گنگا کا بیٹا' کہتے تھے، اور یہی احساس اُن کی شناخت کا محور تھا۔''

راہی معصوم رضا صرف ایک ادیب نہیں بلکہ ایک تہذیبی ضمیر ہیں— جنھوں نے اردو اور ہندی کے بیچ، مذہب اور انسان کے بیچ، لفظ اور عمل کے بیچ ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو صدیوں باقی رہے گا۔ اگر کبھی یہ دھرتی بولے گی تو اس کی زبان میں راہی کے لفظ ہوں گے اور اگر کبھی گنگا گائے گی تو اس کے نغمے میں راہی کی روح کی صدا شامل ہوگی۔

راہی معصوم رضا اپنے ہی دھن میں مست رہنے والے انسان تھے— خاموش، مگر تخلیقی طور پر بیحد متحرک۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتے، دنیا کی شوریدہ سیاست سے زیادہ اپنے قلم کے جہاں میں زندہ رہتے تھے۔ ایک ہی وقت میں کئی تخلیقات پر کام کرتے— کہیں مکالمہ لکھ رہے ہیں، کہیں ناول کا باب مکمل کر رہے ہیں، تو کہیں کسی فلم یا سیریل کی تشکیل میں محو ہیں۔ ان کے نزدیک تخلیق ایک عبادت تھی اور قلم ان کا معبود۔ ایک نشست

ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے لفظوں سے ایک عہد لکھا. ایسا عہد جس میں قلم مذہب نہیں. انسانیت کا پرچم اٹھاتا ہے. زبانیں ایک دوسرے کے لیے پُل بنتی ہیں. دیوار نہیں اور کہانی محض سنائی نہیں جاتی. ضمیر تک پہنچائی جاتی ہے. جب تک اس دھرتی پر لفظ کی حرمت باقی ہے' راہی معصوم رضا کا نام ہندوستانی ادب و ثقافت میں روشنی کی ایک دائمی قندیل بنا رہے گا.

میں راہی معصوم رضا کی شخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے معروف فلمی رائٹر جاوید صدیقی لکھتے ہیں:

''راہی صاحب عجیب ہی وضع کے آدمی تھے— آدھے لیٹے، آدھے بیٹھے، فائلوں کے ڈھیر کے درمیان لکھتے رہتے۔ کسی فائل پر فلم کا مکالمہ لکھا جا رہا ہوتا، کسی پر ناول کا باب اور کسی پر ٹیلی ویژن سیریل۔ ایک فائل بند ہوتی تو دوسری کھل جاتی' گویا ان کا قلم مسلسل سانس لیتا رہتا تھا۔

گھر میں شور کا ایک الگ سمفنی بسا ہوا تھا— بیوی گانا سن رہی ہوتیں، بچے کھیل رہے ہوتے، نوکر آپس میں الجھ رہے ہوتے، کہیں ہنسی کے قہقہے، کہیں باتوں کی گونج، کہیں برتنوں کی چھنک— اور انہی شوروں میں راہی صاحب کے جملے جنم لیتے تھے۔

ایک بار ایک فلم کے پروڈیوسر نے ان سے کہا کہ وہ کشمیر کے پرسکون ماحول میں جا کر لکھیں— وہاں کی فضا، وادیوں کی خاموشی، سب انھیں بہتر یکسوئی دے گی۔ راہی صاحب گئے، پندرہ میں دنوں کے بعد واپس آئے، تو خالی کاغذوں کے ساتھ۔ پروڈیوسر نے حیرت سے پوچھا: ''کچھ لکھا کیوں نہیں؟''

راہی صاحب مسکرا کر بولے:

''وہ شور کہاں تھا؟ وہ آوازیں کہاں تھیں؟ جن کے بیچ لفظ پلتے ہیں، جن کے بیچ کہانی سانس لیتی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں لکھ سکتا۔ وہ آوازیں میرے لیے پس منظر نہیں، موسیقی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو میرا قلم خاموش ہو جاتا ہے۔''

اتنا سب ہونے کے باوجود راہی کی راہ ہمیشہ ہموار نہ رہی۔ اردو کے بعض حلقوں نے ان کی ناول نگاری کی کاٹ سے گریز کیا، بعض جامعات نے 'آدھا گاؤں' کو نصاب سے خارج کیا اور بعض نے ان پر فحاشی یا انحراف کے الزامات عائد کیے۔ مگر انھوں نے کبھی اپنی سچائی پر سمجھوتہ نہ کیا۔ ان کے نزدیک ادیب کا کام یہ نہیں کہ سماج جو سننا چاہے وہ لکھے، بلکہ وہ لکھے جو سماج کو سننے کی ضرورت ہو۔

15 مارچ 1992 کو بمبئی میں ان کا انتقال ہوا۔ عمر کے حساب سے وہ 65 برس کے تھے مگر ادب کے پیمانے پر آج بھی زندہ ہیں' اپنی نظموں، ناولوں اور مکالموں میں۔ ان کی وراثت اس سرزمین کے لیے پیغام ہے کہ ادب کا مقصد انسان کو جوڑنا ہے، توڑنا نہیں۔ ان کا جملہ 'میں گنگا کا بیٹا ہوں' دراصل ہندوستانی روح کا منشور ہے۔ 'مہابھارت' کے آغاز پر جب راوی کہتا ہے 'میں سمے ہوں' تو وہ دراصل ایک ادیب کی زبان بول رہا ہوتا ہے— وہ زبان جو تاریخ، تہذیب اور انسانیت کے بیچ پُل باندھ دیتی ہے۔

ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے لفظوں سے ایک عہد لکھا، ایسا عہد جس میں قلم مذہب نہیں، انسانیت کا پرچم اٹھاتا ہے، زبانیں ایک دوسرے کے لیے پُل بنتی ہیں، دیوار نہیں اور کہانی محض سنائی نہیں جاتی، ضمیر تک پہنچائی جاتی ہے۔ جب تک اس دھرتی پر لفظ کی حرمت باقی ہے' راہی معصوم رضا کا نام ہندوستانی ادب و ثقافت میں روشنی کی ایک دائمی قندیل بنا رہے گا۔

■

Dr. Shah Faisal
Assistant Professor, Higher Education
Jammu & Kashmi
Mob.:9906652946
sfaisaljan12@gmail.com

سعدیہ پروین

حمید تمنائی

حیات اور ادبی شناخت

سر زمین بہار کے شعرا میں جس کو سب سے زیادہ نظر انداز کیا گیا وہ پروفیسر حمید تمنائی کی ذات گرامی ہے۔ وہ خالص مشرقی روایات، علامات واقدار کے پروردہ تھے اور اس کے امین بھی تھے۔ ان کا مزاج قلندرانہ تھا اور طبیعت نمائش و رعونت سے پاک تھی۔ پاجامہ کرتا میں ملبوس اور منہ میں پان کی گلوریاں دبائے پروفیسر حمید تمنائی سے عام لوگوں کا ملنا بہت آسان تھا۔ اردو، فارسی اور عربی پر کامل عبور رکھنے والے اور ان زبانوں سے والہانہ محبت کرنے والے پروفیسر صاحب نے کالج کے طلبہ کے علاوہ سیوان کی متعدد مقتدر و معروف ہستیوں کو اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم سے آراستہ کیا اور بطور معاوضہ ایک دھیلا تک نہیں لیا۔ بدلے میں ان کے شاگردوں نے ان کے دو شعری مجموعوں 'لمعات' اور 'متاعِ شاگاں' کی اشاعت کرائی۔ لیکن آج بھی ان کی تخلیقات کا 80 فیصد حصہ منتظرِ اشاعت ہے۔ تفصیل آگے آئے گی۔

حمید تمنائی کا اصل نام محمد عبدالحمید ابن منشی عبدالعزیز ہے۔ وہ 12/ اکتوبر 1904 کو بمقام حسن پورہ ضلع سیوان میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد بزرگوار غازی پور (یوپی) کے کلکٹریٹ میں سررشتہ دار کے عہدے پر فائز تھے۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے پورے خاندان کو غازی پور منتقل کر دیا۔ حمید تمنائی کا تعلیمی سفر غازی پور میں شروع ہو کر الہ آباد، پٹنہ اور مظفر پور میں پورا ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے لیے انھیں غازی پور کا مشہور زمانہ مدرسہ چشمۂ رحمت میں داخل کرایا گیا۔ وہ ایک عام مدرسہ نہیں تھا بلکہ مشرقی علوم کا سرچشمہ تھا جہاں تشنگانِ علم و ادب سیراب ہو کر نکلتے تھے۔ مولانا شمشاد لکھنوی (فارسی)، مولانا عزت اللہ فرنگی محلی اور مفتی عبدالقادر (عربی) مولانا عبدالباقی (حدیث اور تفسیر) جیسے نابغہ اساتذہ وہاں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔ انہی باکمال اور باصلاحیت اساتذہ کے زیرِ سایہ حمید تمنائی نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم پائی۔ انھوں نے 1917 میں الہ آباد اردو اور پرسین بورڈ سے عربی میں ملا کا امتحان پاس کیا اور 1919 میں فاضل سے سند یافتہ ہوئے۔ 1927 میں انھیں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری ملی۔ اسی درمیان انھوں نے الہ آباد اردو اور پرسین بورڈ سے منشی (فارسی) اور کامل (فارسی) کے امتحانات پاس کیے۔ اس کے بعد حمید تمنائی کی تقرری گھنانند ہائی اسکول، مسوری میں بہ حیثیت معاون معلم (اردو و فارسی) کے ہو گئی۔ ملازمت ملنے کے بعد بھی انھوں نے اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا۔ 1934 میں وہ ایم اے (اردو) میں پٹنہ یونیورسٹی سے کامیاب ہوئے۔ 1954 میں انھوں نے بہار یونیورسٹی سے ایم اے (فارسی) کا امتحان دیا اور فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن سے کامیاب ہو کر طلائی تمغہ حاصل کیا۔ 1938 میں ان کی تقرری سیوان کے وی ایم ایچ ای اسکول میں بطور استاذ اردو و فارسی کے ہو گئی۔ 1949 میں سیوان کے مالویہ کہے جانے والے بیجناتھ پرساد عرف داڑھی بابا کی اپیل پر انھوں نے ڈی۔ اے۔ وی پی جی کالج جوائن کر لیا اور وہیں سے 31/ اکتوبر 1968 کو سبکدوش ہوئے۔

پروفیسر حمید تمنائی کی شخصیت بڑی پرکشش تھی۔ گفتگو میں علم کا دریا ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ قرآن، حدیث اور فقہ پر ان کی معلومات اچھی اور گہری تھی۔ شاعری میں ان کی حیثیت استاد الشعرا کی تھی۔ سیوان کی ادبی محفلوں کی رونق ان کے دم سے تھی۔ وہ عرصہ دراز تک دربار کیمپس میں ماہانہ ادبی نشستیں منعقد کرتے تھے۔ انھوں نے 'بزم ادب ڈی۔ اے۔ وی کالج' کی بنیاد ڈالی اور اسی بینر تلے سیوان میں یومِ آزادی کے موقع سے آل انڈیا مشاعرے کے انعقاد کا آغاز کیا۔ وہ ذرے کو آفتاب بنانے کے ہنر سے واقف تھے۔ 1967 میں ایک مشاعرے کا ذکر ملتا ہے کہ حمید صاحب نے اس کی نظامت کے لیے ڈاکٹر ملک زادہ منظور کا انتخاب کیا۔ منظور صاحب کی زندگی میں یہ پہلی نظامت تھی۔ حمید صاحب کی پینی نظر اور دور اندیشی نے انھیں ملک کا سب بڑا ناظم مشاعرہ بنا دیا۔ اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہے۔ پروفیسر احمد جمال پاشا کی دوسری شادی سیوان کے رئیس اور ہر دل عزیز شخص حاجی محمد داؤد کی دوسری بیٹی سرور داؤد سے 11/ فروری 1966 کو ہوئی۔ اس کے بعد بقول عابد سہیل ''احمد جمال پاشا کی بیوی نے انھیں رخصت کرا کے اپنے مائکے سیوان (بہار) لے گئیں تو شہر کے ادیبوں نے چار باغ اسٹیشن پر انھیں پرنم اور چھلکتی ہوئی آنکھوں سے رخصت کیا''[1] سیوان میں حاجی داؤد کا اچھا اثر و رسوخ تھا۔ وہ علم و ادب کے شیدائی تھے۔ احمد جمال پاشا ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بات 1966 کی ہے۔ جب میں حاجی محمد داؤد صاحب مرحوم سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ سیوان میں شاعروں اور ادیبوں میں جو سب سے محترم اور پڑھا لکھا ہو، اس سے ملوا دیجیے۔ وہ مجھے لے کر کاغذی محلّہ میں ایک بزرگ کے یہاں پہنچے۔ باوقار چہرہ، لب ولہجہ شریں وشستہ، بات چیت میں عجب کی علمی تمکنت اور کشش۔ مجھے بس ایسا احساس ہوا کہ میں اساتذۂ لکھنؤ میں سے کسی کی محفل میں ہوں۔ یہ بزرگ پروفیسر حمید صاحب تھے جو ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج، میں صدر شعبۂ اردو وفارسی تھے۔"[2]

پروفیسر حمید تمنائی کی شخصیت بڑی نستعلیق تھی۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا اور شعر و شاعری علی الخصوص مبادیاتِ نعت گوئی پر گہری نظر تھی۔ ان کا کالج میں لکچر دینے کا انداز بھی جداگانہ تھا۔ جب طلبہ کو پڑھاتے تو ایک غزل یا نظم پر کئی دنوں تک لکچر دیتے اور جب تک طلبہ مطمئن نہیں ہو جاتے تب تک اگلا باب شروع نہیں کرتے۔ احباب کی محفلوں میں ان کا رنگ منفرد ہوتا۔ وہ حسب مراتب گفتگو کرتے۔ اپنے سے چھوٹوں پر ہمیشہ مہربان ومشفق رہتے، برابر والوں سے بڑے رکھ رکھاؤ سے ملتے اور بزرگوں کا احترام کرتے۔ ان کے اخلاق عالیہ کی وجہ سے ہی ان کے حلقۂ تلمذ میں پچاس سے زائد شعرا و ادبا شامل تھے۔ جن میں سے ڈاکٹر عبدالعلیم، علی حیدر نیر، کوثر سیوانی، سرور جمال (احمد جمال پاشا کی منکوحہ) ریاض محی الدین پوری، جذب گوپال پوری، چونچ سیوانی، جوہر سیوانی، بیکس سیوانی، علامہ شبیہ القادری، پربھو نرائن ودیارتھی اور شہاب الدین ثاقب نے شعر و ادب کی دنیا میں اچھا خاصا نام کیا۔ پروفیسر احمد جمال پاشا لکھتے ہیں:

"حمید تمنائی کے نامور شاگردوں میں ڈاکٹر عبدالعلیم کا اسم گرامی بھی شامل ہے، ترقی پسند تحریک کے بانی علی گڈھ شعبۂ علوم اسلامیہ اور شعبۂ عربی کے صدر، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ترقی اردو بورڈ کے چیئرمین تھے۔ اس سلسلے کی اہم کڑیاں ڈاکٹر سید علی حیدر نیر، مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ، شری پربھو نرائن ودیارتھی، شبیہ القادری، کوثر سیوانی جیسا البیلا شاعر، سرور داؤد جیسی ممتاز ادیبہ و ماہر تعلیم، ڈاکٹر مظفر حسین قاسمی جیسا ممتاز صحافی کیوں نہ ہو؟"[3]

حمید تمنائی جب غازی پور میں زیر تعلیم تھے تو 1924 میں پہلی نعت وہاں کے ایک نعتیہ مشاعرے کے لیے لکھی تھی۔ اس کے بعد تعلیم اور روزگار کو مقدم سمجھ کر شعر گوئی کو ملتوی کر دیا۔ لیکن جب سیوان کے وی۔ ایم۔ ایچ۔ ای۔ اسکول میں معلم بنے تو باضابطہ شاعری کا آغاز کیا۔ ابتدائی دور کی شاعری پر نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی سے اصلاح لی۔ یہ سلسلہ 1956 تک چلا۔ 1957 میں وہ پٹنہ کے حضرت تمنا عمادی پھلواروی کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ تمنا عمادی جب پاکستان چلے گئے تو بذریعہ خط وکتابت یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ان کے نام کی مناسبت سے ہی پروفیسر عبدالحمید صاحب تمنائی کا لاحقہ جوڑ لیا۔ متاع شائگاں میں لکھتے ہیں:

> **پروفیسر حمید تمنائی کی شخصیت بڑی پرکشش تھی۔ گفتگو میں علم کا دریا ٹھاٹیں مارتا تھا۔ قرآن، حدیث اور فقہ پر ان کی معلومات اچھی اور گہری تھی۔ شاعری میں ان کی حیثیت استاد الشعرا کی تھی۔ سیوان کی ادبی محفلوں کی رونق ان کے دم سے تھی۔ وہ عرصہ دراز تک دربار کیمپس میں ماہانہ ادبی نشستیں منعقد کرتے تھے۔**

"مجھے سب سے پہلے 1924 میں شاعری نے گدگدایا جب میں یو۔ پی۔ بورڈ سے ہائی اسکول کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا، لیکن میرا یہ سفر صرف تعلیم کے پیش نظر تھا اس لیے شاعری کو تعلیم پر غالب نہیں آنے دیا۔ مگر اختتام تعلیم کے بعد جب 1938 میں وی ایم ایچ ای اسکول سیوان میں اسسٹنٹ ماسٹر مقرر ہوا تو پھر شاعری مجھ سے آ کر لپٹ گئی۔"[4]

پروفیسر حمید تمنائی نے مذہبی کلام کا وافر سرمایہ چھوڑا ہے۔ ان کا ذہنی، فکری اور طبعی میلان دین اور تصوف کی طرف زیادہ تھا۔ ان کی متعدد غزلوں کا رنگ بھی متصوفانہ ہے۔ وہ محفلِ نعت گوئی، محفل مسالمہ و مناقبہ و مرثیہ خوانی کی نشستوں میں شریک ہوتے تھے اور ہر محفل کے لیے تازہ نعت، منقبت، مرثیہ، اور سلام پیش کرتے تھے۔ جابر فیروز پوری نے ان میں سے چیدہ چیدہ مذہبی کلام کا مجموعہ 'لمعات' کے نام سے شائع کرایا۔ ان کے استاد محترم تمنا عمادی نے نعت گوئی میں افراط وتفریط سے بچنے کی صلاح دی تھی۔ حمید تمنائی نے اس بات کا پورا خیال رکھا ہے۔ انھوں نے معروف نعت گو حضرات کی نعتوں پر تضمینیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی بعض نعتیں فارسی زبان میں بھی ہیں۔ بقول پروفیسر احمد جمال پاشا:

"امیر مینائی، محسن کاکوروی اور حضرت آسی غازی پوری جیسے ممتاز نعت گویوں کی صف میں حمید تمنائی بہ آسانی شامل کیے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے نعتیں کہی ہیں اور خوب کہی ہیں۔ وہ بلند پایہ نعت گو ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی غزلوں میں بھی نعتیہ اشعار داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کی نعت کا ہر شعر عقیدت اور اشتیاق سے منور ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے اشعار بڑے آبدار ہیں۔"[6]

متاع شائگاں پروفیسر حمید تمنائی کے دوسرے شعری مجموعے کا نام ہے۔ اس کی اشاعت ان کے شاگرد رشید پربھو نرائن ودیارتھی نے 1980 میں کرائی تھی۔ تقریباً چالیس کتابوں کے مصنف پربھو نرائن ودیارتھی اس وقت سیوان میں اے ڈی ایم کے عہدے پر تعینات تھے اور پروفیسر موصوف سے اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ متاع شائگاں میں اداریہ کے علاوہ شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، مولانا شبیہ القادری اور حمید تمنائی کے تاثرات شامل ہیں۔ ہر چند کہ یہ مضامین مختصر ہیں لیکن ان کی شاعری کی تفہیم و تقویم کے نقش اول ہیں۔ متاع شائگاں میں ایک ایک حمد، نعت، نعتیہ سہرا، سلام، اور اکہتر غزلیں ہیں۔ آخر میں دو تاریخی قطعات چار نظمیں اور ایک رخصتی نامے کو جگہ دی گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مرتب نے حمید تمنائی کی زنبیلِ شاعری سے الگ الگ گلدستہ سجایا ہے۔ حمید تمنائی کی غزلیں ان کے دلی احساسات و جذبات کی بخوبی عکاسی کرتی ہیں۔ انھوں نے سماج کو جس طرح دیکھا، سمجھا اور پرکھا اسے اشعار کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس طرح ان کے اشعار حقیقت کے

ترجمان بن گئے ہیں۔ بقول سید علی حیدر نیر:

''حمید تمنائی نے اپنے کلام کو صنائع و بدائع سے مرصع کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح اپنے کلام کے صوری حسن میں اضافہ کیا ہے۔ حمید تمنائی اپنے کلام میں فارسی ترکیب استعمال کرتے ہیں جو محل استعمال کے اعتبار سے نہایت موزوں ہوتی ہے اور ان کے کلام میں دلکشی بڑھ جاتی ہے۔ کہیں کہیں نادر ترکیب بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً حیات اجل نما، لطف جفا، جور کرم، لطمۂ طوفاں برق زا، درد تہہ جام، جامہ بردوش۔ ان ترکیبوں کے استعمال سے ان کے کلام میں جاذبیت پیدا ہوگئی ہے۔''[6]

حمید تمنائی کا شمار اعلیٰ درجے کے معلم، دانشور اور ماہر تعلیم میں ہوتا تھا۔ ان کی علمی استعداد کا زمانہ قائل تھا۔ وہ اردو، عربی اور فارسی پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ہندی اور بھوجپوری ان کی گھریلو زبانیں تھیں۔ انھوں نے اردو اور فارسی میں معیاری اور پر اثر شاعری کی ہے۔ ان کی شاعری سنجیدگی اور متانت سے عبارت ہے۔ ابتدائی زمانے کی شاعری میں چند عاشقانہ مضامین مل جائیں گے لیکن بعد میں انھوں نے اس رویہ کو ترک کر دیا۔ ان کے کلام میں شوخی وظرافت کے بھی عناصر ملتے ہیں۔ لیکن انھوں نے شوخی وظرافت کے پس پشت فحش وہزل گوئی سے اپنے قلم کو آلودہ نہیں کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

اڑیں گی دامن انسانیت کی دھجیاں کب تک
رہیں گے بے خبر حالات سے کروبیاں کب تک
اگر ڈوبا ہوں امواج حوادث میں تو کیا پروا
مگر یہ ڈوبنا شرمندۂ ساحل نہ بن جائے
ادب ملحوظ رکھیں شیخ صاحب
یہ مے خانہ ہے کچھ محفل نہیں ہے

حمید تمنائی کے مطالعے کا دائرہ کافی وسیع تھا۔ انھوں نے اسلامی تاریخ، فقہ، حدیث اور تفسیر کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کی شاعری میں قرآنی واقعات اور اسلامی تاریخ و فلسفہ کا ذکر ملتا ہے۔ وہ ایک شعر میں ایک واقعے کو بیان کرنے کے ہنر سے واقف تھے۔ ان کی شاعری میں تلمیحات اور استعارات کے اشعار بھرے پڑے ہیں۔ ان کی تفہیم کے لیے اسلامی تاریخ اور قرآنی واقعات کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ اشعار قارئین سے ویسی ہی ذہنیت اور بلند فکری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ چند اشعار

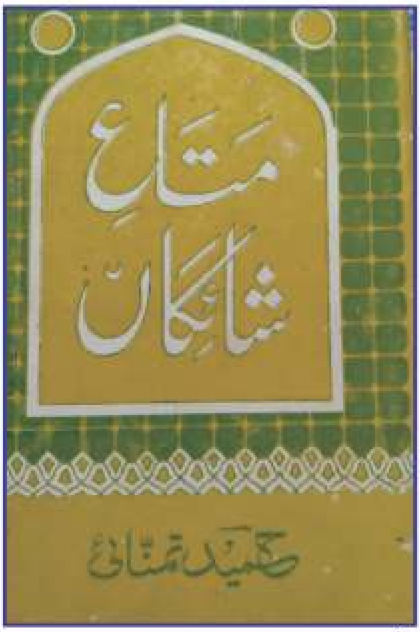

پیش خدمت ہیں۔

تھا موسیٰ کا ذوق دید یا ذوق نمود حسن
نہیں تو آئی یہ لرزش کہاں سے کوہ ایمن میں
کلیم ہوش میں آؤ، کچھ اور آگے بڑھو
یہ جلوہ گاہ کے پردے ہیں جلوہ گاہ نہیں
خدا کے واسطے ساقی سے میری ابتری کہہ دے
میں جی جاؤں باذنی قم جو شیشے کی پری کہہ دے
لعنت کا طوق ایک کرشمہ انا کا تھا
انجام بے شعور خرد کی خطا کا تھا
کیوں آج ہے مطیع فرامین اہرمن
کل تک یہ بد نصیب خلیفہ خدا کا تھا

پروفیسر حمید تمنائی اور زاہد فیروز پوری نے مل کر ''سخن وران سارن کی تالیف کی۔ یہ سارن کمشنری کا پہلا تذکرہ ہے۔ اس کی اشاعت 1972 میں ہوئی۔ 300 صفحات پر مشتمل اس تذکرے میں کل 150 متقدمین، متوسطین اور متاخرین شعرائے اردو شامل ہیں۔ مختصر تعارف کے ساتھ ان کے کلام کا نمونہ بھی دیا گیا ہے۔ ابتدائی صفحات پر سیوان سے تعلق رکھنے والی چند نامور شخصیات کی تصویریں ہیں۔ عرض حال کے تحت پروفیسر حمید تمنائی نے سخن وران سارن کی تالیف میں پیش آئیں مشکلوں کا تذکرہ کیا ہے اور ان حضرات کا شکریہ ادا کیا ہے جنھوں نے اس کام کی تکمیل میں مدد کی۔ زاہد فیروز پوری نے عرض مرتب کے تحت شاعروں کی عدم توجہی اور بے اعتنائی کی شکایت کی ہے۔ ان کی شکایت درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس دور میں جب شعرو ادب کا ذوق عام تھا، صرف 150 شعرا ہی اس تذکرے میں شامل ہو پائے اور ان میں بھی سیوان کے شعرا کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اس کے بعد مشہور سیاسی رہنما سید محمود، محمد یوسف، زوار حسین اور معروف قلمکاروں مثلاً نشور واحدی، ش مظفر پوری، مظہر امام، بکل اتساہی، نعمت اللہ چھپروی، غبار بھٹی، ریاض عظیم آبادی اور قمر ساجدی بلیاوی کے پیغامات شائع ہوئے ہیں۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ بہار میں اردو شعرو ادب کو اپنے خونِ جگر سے سینچنے والے جیالوں اور جاں بازوں میں پروفیسر حمید تمنائی کا نام سنہرے حروف میں لکھا جانا چاہیے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ارشاد احمد نے تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل 'کلیات حمید تمنائی' کی ترتیب و تدوین کا کام مکمل کیا ہے۔ یہ کلیات بالترتیب پانچ ابواب مذہبیات، غزلیات، طربیات، منظومات اور قطعات پر محیط ہے۔ آخر میں پروفیسر احمد جمال پاشا کی وہ بات قارئین کے حوالے ہے جو صداقت پر مبنی ہے۔

''پروفیسر حمید صاحب اگر پٹنہ یا لکھنؤ میں ہوتے تو غالباً تاریخ اردو ادب کا ایک باب ہوتے۔ مگر بھائی! جنگل میں مور ناچا، کس نے دیکھا۔''[7]

حوالہ جات

1 جو یاد رہا: مضمون احمد جمال پاشا، عابد سہیل، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 95، سنہ اشاعت 2012 ص 532
2 نذر حمید، مرتب احمد جمال پاشا، کبیر وچار منچ، سیوان سنہ اشاعت، 1983 ص 26
3 ایضاً، ص 4
4 متاع شائگاں، حمید تمنائی، ناشر، دائرۂ احباب، سیوان 1980، ص 5
5 لمعات، حمید تمنائی، مرتب: جابر فیروز پوری 1972 ص 5
6 نذر حمید، مرتب احمد جمال پاشا، کبیر وچار منچ، سیوان سنہ اشاعت، 1983، ص 124
7 نذر حمید، مرتب احمد جمال پاشا: کبیر وچار منچ، سیوان سنہ اشاعت 1983، ص 28

■

Sadia Parween
Ustaz Urdu, Dukhi Ram Inter College
Kadwa, Disst: Katihar- 855154 (Bihar)
Mob.:9798953598
sadiaimran22oct2016@gmail.com

سرفراز جاوید

سجاد مہدی حسینی کی علمی شخصیت

ڈاکٹر سجاد مہدی حسینی 24 اپریل 2021 کو سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ وہ اپنے عزیز و اقربا کے خانہ ہائے دل میں گہرے رنج و ملال کی ویرانی چھوڑ گئے۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیٹی، بیٹا اور شریک حیات ہیں۔ دونوں بچے ابھی تعلیمی و تربیتی سفر پر ہیں۔ ذاتی طور پر ان کے انتقال کا غیر متوقع سانحہ میرے لیے سانسوں کی تکرار میں سوہان روح بنا ہوا ہے۔ ان کی یاد بار بار احساس زیاں کے خنجر سے سینے کو گود رہی ہے۔ مگر ان کا شفقت و محبت سے بھرا لہجہ کانوں کی سماعت میں ہنوز حیات و زیست کو تقویت عطا کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا اپنے دوست، احباب اور طالب علموں سے پر خلوص انداز سے پیش آنا، ان کی اخلاقی اور علمی شخصیت کا مظہر تھا۔ وہ درس و تدریس کے دوران طلبا و طالبات کو علمی و ادبی جہات سے روشناس کراتے، جس سے طلبا کے مابین علمی شوق و ذوق اور تجسس کی چنگاری پیدا ہو جاتی۔ طلبا و طالبات مطالعہ کتب میں لگ جاتے، اور ان کی بہت سی پریشانیوں کا ازالہ خود بخود ہو جاتا۔ مزید وہ بہت سی علمی پریشانیوں کے معاملات ڈاکٹر سجاد مہدی حسینی سے حل کرا لیتے۔

مجھے ذاتی طور پر ان کی رحلت سے انتہائی صدمہ پہنچا۔ ان سے میری ملاقات ذاکر حسین دہلی کالج میں ہوئی۔ میں ان سے شروع میں بات چیت کرتے ہوئے جھجک محسوس کرتا رہا، لیکن رفتہ رفتہ ان کے اخلاق و خلوص نے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ مزید ان کے علمی و ادبی ذوق نے میرے علمی ذوق کو جلا بخشی، تو ان سے ملاقات اور ٹیلی فون پر گفتگو کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ میں نہ صرف ان سے وقتاً فوقتاً علمی تشنگی کو سیراب کرتا رہا، مزید کوئی مسئلہ درپیش آیا تو مشورہ بھی کرتا۔ ان کے ذاتی اوصاف میں علمی گہرائی، ذہنی دیانت، کردار کی پاکیزگی و استقامت، یقین کامل اور سچے عجز و انکسار کا پیکر معلوم ہوتے۔ وہ تحقیقی و تنقیدی کاموں میں بڑی محنت، دیانت داری اور سوجھ بوجھ سے کام لیتے تھے۔ ان کی زبان و بیان میں لکھنوی لب و لہجہ کا پرتو ضرور ہے، مگر ژولیدہ بیانی نہیں ہے۔ وہ بڑے اختصار کے ساتھ گہرے علمی و ادبی مضامین کو تحمل سے بیان کرنے پر خاطر خواہ قدرت رکھتے تھے۔ وہ ایک لائق و فائق استاد کے ساتھ محقق اور ناقد بھی تھے۔ ان کے نزدیک ضابطہ اخلاق اور وقت کی پابندی بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ وہ ایک استاذ کی حیثیت سے اپنی بہت سی مصروفیات کے باوجود طالب علموں کی پریشانیوں کو مقدم رکھتے تھے۔ حتی المقدور ان کی پریشانیوں کو بڑی خوش اسلوبی اور خندہ پیشانی کے ساتھ اپنا فرض منصبی سمجھ کر حل کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ اپنی علمی اور درسی مصروفیات کے باوجود اپنے خانگی معمولات زندگی کو بھی متاثر نہیں ہونے دیتے۔ ان کے ظاہر و باطن میں بڑی یکسانیت دکھائی دیتی تھی۔ وہ آج کے مادی دور میں نئی نسل کی صحیح اخلاقی تربیت نہ ہونے پر ان سے خفگی کا اظہار کرتے اور ان کی اخلاقی تربیت کی ممکن حد تک بڑے شائستہ انداز میں کوشش بھی کرتے۔ وہ خانگی اور علمی امور کے ساتھ کالج اور گرد و پیش کے ماحول پر نظر رکھتے۔ وہ اس قدر مصروفیت کے باوجود تحقیقی و تنقیدی کاوشوں سے علمی تحریروں میں اضافہ کرتے رہے۔ ان کی تحقیقی و تنقیدی کتب میں 'علی عباس حسینی فکر و فن کا تجزیاتی مطالعہ'، 'پروفیسر مختار حسین مہد سے لحد تک'، 'راہی معصوم رضا، اردو ہندی کی مشترکہ امانت'، 'اردو قصیدہ نگاری آزادی کے بعد'، 'علی عباس حسینی حیات اور ادبی خدمات' وغیرہ ہیں، اس کے علاوہ تدوین اور تراجم بھی کیے۔ علمی و ادبی حلقے میں ان کے کام کی خاطر خواہ پذیرائی ضرور ہوئی، مگر کما حقہ نہیں۔

سیانے کہتے ہیں کہ پیشہ اور منصب کے علاوہ علم کی قدر و پیمائی تحریر میں طے نہیں پاتی، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ فرد نے اعلیٰ تعلیم کے باوجود اپنے پیشہ کے معنی کیسے متعین کیے ہیں۔ اپنا کردار پیشے کی بدولت کس طرح وسیع کیا ہے۔ وہ اعلیٰ ظرف انسان تھے۔ یہ ان کے علم کا اعجاز ہی تھا کہ وہ پھل دار شاخ کی مانند علمی بار سے پیدا ہوئے عجز و انکسار سے جھکے رہتے۔ بہرحال ہر انسان جانتا ہے کہ ہم سب یہاں پر عارضی طور پر مقیم ہیں۔ ہاں اردو زبان و ادب کے دانشوران میں ان کی بڑی عزت تھی۔ ڈاکٹر سید سجاد مہدی حسینی کی 'علی عباس حسینی کے فکر و فن کا تجزیاتی مطالعہ' ان کی دیگر کتابوں کی طرح ایک گراں قدر کتاب ہے۔ اس میں موصوف نے ان پر سابقہ کام کے حوالے سے بھی رجوع کیا ہے۔ مزید ان کے فکر و فن پر نہایت عرق ریزی سے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کو علی عباس حسینی سے آبائی وطن کی خاطر بڑا شغف اور نسبت تھی۔ انھوں نے علی عباس حسینی کے تخلیقی و تنقیدی کاموں پر بھرپور تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب پر اپنے تاثرات کو تصور میں لانے سے قبل صاحب کتاب اپنے وطن مالوف اور نسب نامہ کے حوالہ سے رقم طراز ہیں:

''راقم الحروف کا وطن عزیز موضع گھوئی بزرگ ہے، اگرچہ سید خدا بخش عرف میر صاحب شہید (مدفون نونہرہ) کی نسل میں آتا ہوں اور اپنے وجود سے چند پشت اوپر جا کر سید اخوند کی نسل میں آنے والی ایک دختر کی وجہ سے گھوئی بزرگ کا قدیم باسی ہوں۔ گھوئی بزرگ کی قدامت کے لیے 'کہیت العتیق' (1043ھ) کا مادۂ تاریخ لیے چار سو سال پہلے تعمیر شدہ عظیم جامع مسجد آج بھی شاہد ہے اور یہ مسجد نہ فقط گھوئی بزرگ کو متعارف کرا رہی ہے بلکہ دیگر مواضع میں موجود اہل سادات کی قدامت کی ایک شناخت اور علامت ہے۔''
(حرف دل، علی عباس حسینی کے فکر وفن کا تجزیاتی مطالعہ، ص22)

انسان کا یہ فطری جذبہ ہے کہ وہ اپنے وطن مالوف اور عزیز و اقارب سے نسبت کو سجوئے رکھے۔ ناخواندہ شخص اپنی یادوں میں موت تک رکھتا ہے، مگر تعلیم یافتہ شخص اسے تحریری شکل میں محفوظ کر جاتا ہے۔ اسی علمی میراث سے تحقیق وتنقید کا سلسلہ آگے بڑھتا رہتا ہے اور بہت سی باتیں غلط بیانی اور جعل سازی سے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ یوں تو انسان کو زندگی کے سفر میں خوش حالی اور پریشانی کے معاملات سے گزرنا پڑتا ہے، مگر خالق کائنات اپنی مشیت وسنت کے مطابق بنی آدم اور اس کی معاشرت کا سلسلہ قائم رکھتا ہے۔ ڈاکٹر سجاد مہدی حسینی کو اللہ کی ذات و کتاب پر کامل یقین تھا جس کا عکس ان کی تحریروں میں جابجا ملتا ہے۔ وہ حالات کی ناآسودگی کا بیان کرتے ہوئے اللہ کے کلام کی سعادت اور شہادت پر اپنی ایمانی کیفیت قلم بند کرتے ہیں:

''استمراری بندوبست مفقود ہو جانے یعنی زمین داری کے خاتمہ پر کتنی بستیاں افلاس کے گرداب میں پھنس کر اپنی پہچان کھو بیٹھیں اور مکینوں کو مہاجرت پر مجبور ہونا پڑا اور جب مکین ہی نہ رہے تو مکان کے موجود ہونے یا محترم ہونے کا کیا تصور، نتیجہ سامنے تھا، ماضی تابناک اور حال المناک وعبرت ناک، لیکن شکر ہے اس رب حقیقی کا کہ جس نے ان مع العسر یسراً (سورۃ انشرح 4:98) کا وعدہ کیا ہے۔'' (ص22)

ڈاکٹر سجاد صاحب کی علم دوستی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ اپنے آبائی وطن کے خطہ ارضی کے اکابر علمائے ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ اسی لیے وہ آبروئے وطن کے نام سے ایک تالیفی کام انجام دے رہے تھے، جس کی پہلی جلد انھوں نے معروف فکشن نگار علی عباس حسینی کے علمی و ادبی کاموں پر محیط رکھی۔ وہ آبروئے وطن کے حوالہ سے خود رقم طراز ہیں:

''آبروئے وطن کی تالیف وترتیب میں غیر ارادی طور پر زیادہ تر وہ اہل قلم شامل ہو گئے جو بذاتہ یا محقق تھے یا ناقد اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ غازی پور نے بیسویں صدی کے اہم ناقدین پیدا کیے۔ وقت کی اسی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان افراد کے تحقیقی و تنقیدی مضامین اور تخلیقات پر مشتمل ایک علیحدہ کتاب ترتیب دی جا چکی ہے تا کہ قاری کو احساس تشنگی سے دو چار نہ ہونا پڑے۔'' (ص24)

> ڈاکٹر سید سجاد مہدی حسینی کی 'علی عباس حسینی کے فکر وفن کا تجزیاتی مطالعہ' ان کی دیگر کتابوں کی طرح ایک گراں قدر کتاب ہے۔ اس میں موصوف نے ان پر سابقہ کام کے حوالے سے بھی رجوع کیا ہے۔ مزید ان کے فکر وفن پر نہایت عرق ریزی سے کام کو آگے بڑھایا ہے۔

موصوف نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے تحریر سفر میں تمام دشواریوں کو بیان کیا ہے جس سے علم ہوتا ہے کہ ایک محقق کو تحقیق کے دوران کس قدر پریشانیوں کے ساتھ یاس وامید سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ انھوں نے اس تحریر میں تمام معاونین کا شکریہ ادا کیا ہے۔ مزید تحقیقی نقطہ نظر یہ ہے کہ انھوں نے اپنی رسائی کے مطابق علی عباس حسینی پر ہوئے چھ تحقیقی کام پر خاصی توجہ و وقت صرف کیا ہے۔ انھوں نے تحقیقی اصول کے سیاق میں علی عباس حسینی کے غیر دستیاب علمی اثاثہ کا ذکر بھی کیا ہے، جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہنوز تخلیق کار کا مکمل کلیات منظر عام پر نہیں آسکا ہے۔ ان کے اعترافی بیان پر توجہ کی ضرورت ہے، جس سے علی عباس حسینی کی تمام تخلیقات ایک کلیات کی شکل میں قارئین کو دستیاب ہو سکیں۔

ڈاکٹر سجاد مہدی حسینی نے سید علی عباس حسینی کے خاندانی پس منظر، ولادت، قد و قامت، وضع قطع پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے ان کے بھائی بہن اور تعلیمی دور کے تعلق سے ذکر کیا ہے، مگر ان کے اساتذہ کی تفصیلی معلومات حاصل نہ کر سکے۔ ہاں انھوں نے اس تعلق سے علی عباس حسینی کی تحریر سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے دو اہم استاذ پروفیسر مرزا محمد ہادی رسوا اور پرنسپل میتھو بنجامن کیمرون کے حوالہ سے دو اقتباس نقل کیے ہیں۔ موصوف نے مزید ان کی ازدواجی زندگی، اولاد، معاشی مصروفیت، معاصرین واحباب، تلامذہ کے حوالہ سے مختصر گفتگو کی ہے۔ انھوں نے ان کے علمی آثار، فلمی دنیا کی خدمات اور تنقیدی مضامین، تبصرے اور مقدمے کے بارے میں ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کے سفر آخرت کے حوالہ سے لکھا ہے:

''عمر کے آخری دو تین سال بیماری میں گزرے خاص طور سے عارضۂ قلب میں مبتلا ہوئے اور اسی مرض کے باعث 27 ستمبر 1996 بروز سنیچر مطابق 15 رجب 1389ھ کو صبح ساڑھے آٹھ بجے اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔'' (ص58)

ڈاکٹر صاحب نے فن کار کے افسانوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے معاشرتی زندگی کے بیشتر پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے خالص گاؤں کے ماحول سے تعلق رکھنے والی دو کہانیوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ 'ہمارا گاؤں' افسانہ کی اہمیت اور مقبولیت پر اپنے تاثرات نقل کرتے ہیں:

''اس میں مصنف نے نہ فقط ہندوستان کے دیہاتوں میں رونما ہونے والی سماجی تبدیلیوں کو قبل از وقت محسوس کرلیا، بلکہ مذہب وملت کے نام پر ہندوستان میں پیدا کی جانے والی تفریق اور پھیلائی جانے والی منافرت، بنیاد پرست تنظیموں کی گاؤں کے سادہ لوح انسانوں کے ذہن کی مہدوف مفسو دسازی یعنی برین واشنگ (Brain Washing)، زمین داری کا خاتمہ، سماج میں پائی جانے والی ذات برادری، بلند و پست کی غیر مرئی صفوف کا انہدام، جیسے مسائل کو بہت پہلے محسوس کر کے اس کی پیش گوئی کی گئی ہے، جو واقعات،

افسانے کی تخلیق سے بہت بعد رونما ہوئے ہیں بلکہ جن حالات کی افسانے میں نشاندہی کی گئی ہے ان کے رونما ہونے کا سلسلہ ابھی جاری ہے اور یہی حقیقت افسانے کی حیات کا راز ہے۔'' (ص 374)

دراصل ابن آدم غیب سے قطعی اور مستقبل کے سماجی معاملات سے بھی بخوبی واقف نہیں ہوسکتا، مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اچھا تخلیق کار انسانی معاشرے کی اجتماعی نفسیات کو محسوس کرلیتا ہے کہ معاشرے کی فکر کس نہج پر مستقبل میں اپنے معاملات روا رکھے گی۔ کسی بھی تخلیق کار کی تخلیق میں اپنے معاشرے کے ذریعہ مستقبل میں رونما ہونے والے فکری معاملات کا ذکر کرنا، ایک بڑے تخلیق کار کے شعور پر دلالت کرتا ہے۔ یہی کچھ علی عباس حسینی نے اپنے معروف افسانہ 'ہمارا گاؤں' میں پیش کیا ہے۔ یہ افسانہ ہندوستانی دیہات میں بدلتے ہوئے معاشرے کی فکر کی ترجمانی کرتا ہے۔ ہاں، یہاں پر ذکر مناسب سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے عربی و فارسی کی شدبد کے باعث انگریزی اصطلاح Brain Washing کا ترجمہ یا متبادل اردو میں مہدوف مفسو دسازی بنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ ان کی اپنی کوشش ہے مگر ناچیز اس کا ترجمہ ذہن شوئی قدر غنیمت سمجھتا ہے جو چلن میں بھی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے علی عباس حسینی کے 'کفن' اور پریم چند کے 'کفن' پر تحقیقی اور تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ انھوں نے علی عباس حسینی اور پریم چند کے افسانے 'کفن' کی تخلیق میں غالباً دس سال کا فرق بتایا ہے اور دونوں مواد کے اعتبار سے بھی جداگانہ اہمیت اور نفس مضمون کی حساسیت بھی الگ بتائی ہے۔ اس تعلق سے ان کی تحریر پر غور کیجیے:

''مظہر امام کے بقول، علی عباس حسینی کا تحریر کردہ افسانہ 'کفن' دسمبر 1945 کے ادب لطیف میں شائع ہوا تھا۔ ملاحظہ ہو صبح نو، ص 210، علی عباس حسینی نمبر۔ اس بیان کی روشنی میں پریم چند کے 'کفن' افسانے کے تقریباً دس برس بعد علی عباس حسینی نے ''کفن'' لکھا۔ پریم چند نے جہاں نچلے طبقے میں موجود شدید غربت کی پُردرد منظرکشی کی ہے۔ ساتھ ہی بشری نفسیات کے حساس پہلوؤں کو کریدا ہے اور جذبات کی کشمکش کو انتہائے عروج پر پہنچا دیا ہے وہیں علی عباس حسینی نے اپنی کہانی کے ذریعے ماضی کے صاحبان اقتدار کی، بدلتے زمانے کے ہاتھوں بے حرمتی ان کی تضحیک اور ان کے استہزاء کی پُردرد منظرکشی کی ہے۔'' (ص 76)

پریم چند کے معروف افسانوں میں 'کفن' اور 'دوبیل' بھی ہیں۔ علی عباس حسینی نے بھی 'کفن' کا عنوان تو بعینہٖ اور دوبیل کا عنوان تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ یعنی 'بیلوں کی جوڑی' کے عنوانات تو براہ راست پریم چند سے مستعار ہیں، مگر دونوں کی بنت مواد، اور نفس مضمون میں افتراق ہے۔ ہاں ڈاکٹر سجاد مہدی حسینی سے پریم چند کے افسانہ 'دوبیل' کے معاملے میں سہو ہوا ہے۔ انھوں نے اس کا عنوان دو بیلوں کی جوڑی بتایا ہے جو غلط ہے۔ وہ پریم چند کے 'دوبیل' افسانہ کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''پریم چند کا افسانہ دو بیلوں کی جوڑی ایک تمثیلی افسانہ ہے۔ اس میں مصنف نے بیلوں کو افسانوں کی طرح باشعور اور متکلم دکھایا ہے اور جب ایک گرفتار ہوتا ہے تو دوسرا فرار نہیں ہوتا، بلکہ مصیبت کی گھڑی میں اس کے شانہ بہ شانہ کھڑا رہتا ہے۔ دو بیلوں کا ایثار صرف ایک دوسرے کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ کانجی ہاؤس میں گرفتار اپنی نسل وقوم کے سیکڑوں بھائی بندھوؤں کی رہائی کے لیے بھی ہے اور آخرکار کانجی ہاؤس کی دیوار گرا کر بہتوں کو قید و بند کی مصیبت سے آزادی دلا دیتے ہیں۔ اس کہانی میں پریم چند نے پوری انسانیت کو ایک پیغام دیا ہے۔'' (ص 78)

وہ علی عباس حسینی کے افسانے 'بیلوں کی جوڑی' کے نفس مضمون اور موضوع کے تعلق سے تحریر کرتے ہیں:

''علی عباس حسینی کے افسانے 'بیلوں کی جوڑی' کا موضوع بالکل جدا ہے۔ ان کی کہانی کی اصل تفہیم جانوروں پر ہونے والے مظالم کی طرف عوام کو متوجہ کرنا ہے اور شاید اس کے پس پشت 'واذا الوحوش حشرت' (التکویر: 81:5) کا الٰہی اعلان کارفرما ہو، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت انسان کے دست ظلم سے نہ تو خود اس کا وجود بچا نہ اس کے عزیز و اقارب اور بنی نوع آدم اور نہ ہی اللہ کی باقی مخلوق۔ خاص طور سے وہ جانور جو اس کی زندگی کے معمولات میں استعمال ہونے لگے۔'' (ص 79)

تجزیہ نگار نے علی عباس حسینی کے افسانوں میں مختلف شعبہ ہائے زندگی یعنی معاشرتی طور پر چاہے وہ سیاسی ہو یا سماجیاتی ہو ان کی نشاندہی کی ہے، جیسے وزیر، مولوی، معلم، جج، وکیل، ڈاکٹر، سرکاری عملہ، بڑے تاجر، غسال، گورکن، قلی، درزی، جولاہا، مہتر، طوائف، کسان وغیرہ۔ مزید انھوں نے سماجی طبقات جیسے راجہ، نواب، ٹھاکر، سید، شیخ، زمیندار، اعلیٰ اور ادنیٰ طبقات کا ذکر کیا ہے۔ ان سب کے ساتھ معاشرتی مسائل کی طرف توجہ دی ہے۔

علی عباس حسینی کا مطالعہ، تجربہ اور مشاہدہ کافی گہرا تھا۔ ان کی نظر ہندوستان کی سیاست سے لے کر عالمی منظرنامہ پر تھی۔ یہ وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں گاؤں، شہر اور دیگر ممالک کے معاملات بھی ملتے ہیں۔ تخلیق کار کے یہ افسانے لیڈر، بندوں کی جوڑی اور عمل خیر عالمی سیاست کا ہلکا پھلکا عکس رکھتے ہیں۔ تجزیہ نگار ان افسانوں کے حوالے سے اپنی رائے تحریر کرتا ہے:

''آپ کی نظر عالمی سیاست پر گہری تھی۔ کسی سیاسی مسئلہ پر کھل کر اپنی بات رکھنا وہ بھی ایسے انسان سے جو انگریزوں کی ملازمت کررہا ہو اور اس عہد میں جب پریس کی آزادی مطلق نہ ہو یقیناً ایک مشکل امر تھا، لیکن ایسے وقت میں بھی اس طرح لکھنا ہمت کو واضح کرتا ہے۔'' (ص 105)

ڈاکٹر سجاد مہدی حسینی نے علی عباس حسینی کے دستیاب جملہ افسانوں کو اپنے مطالعہ اور فکر و رسا کے ذریعہ، تنقیدی نقطہ نظر کے ساتھ، تحلیل و تجزیہ سے گزارا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا جداگانہ کام ہے۔ ان کی یہ کتاب علی عباس حسینی کی تخلیقاتی فکر کی افہام و تفہیم میں قارئین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ ریسرچ کے طلبا و طالبات اس کتاب کے مطالعہ سے فکشن کی تحقیق و تنقید کے لیے اپنے فہم و شعور کو جلا بخشیں گے۔ ہاں آخر میں یہ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کا جائزہ لینے کے لیے ایک تحقیقی مقالہ کی ضرورت ہے۔ امید ہے کوئی طالب علم مستقبل قریب میں ضرور ان کی تحقیقی و تنقیدی کاوشوں کا جائزہ لے گا۔ اور اردو دنیا ان کی جملہ نگارشات سے استفادہ کرے گی۔ ان کی تحریریں عربی فارسی لفظیات سے خاصی مستفید ہیں۔ ان کا اپنا ایک تحریری اسلوب بن رہا تھا۔ ان کی چند کتابوں کا مطالعہ کرنے سے قاری اپنے ذہن میں ان کی لفظیاتی گھن گرج، کانوں میں محسوس کرنے لگتا ہے۔

■

Sarfaraz Javed
R-155, Third Floor, Gali No: 6
Sir Syed Road, JogabaiExt.
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi- 110025
javedsarfaraz@yahoo.in

شہاب ظفر اعظمی

قاسم خورشید کا تخلیقی انفراد

بہار کی بھی ہے شرکت بہارِ گلشن میں
لہو سے ہم نے بھی سینچا ہے باغ اردو کو

جب جب گلستان بہار کا کوئی پھول مرجھا تا ہے حمید عظیم آبادی کا یہ شعر شدت سے یاد آتا ہے، کیونکہ اردو زبان وادب بالخصوص اردو فکشن کی دنیا کو وسعت دینے میں بہار نے جو حصہ لیا ہے اسے قطعی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہمعصر فکشن کی تاریخ تو بہار کے ہی افسانہ نگاروں اورناول نگاروں سے روشن ہے۔مگر اب جس تیزی سے یہاں کی افسانوی دنیا اجڑ رہی ہے،اس گلشن کی بقا کی فکرستانے لگی ہے۔گذشتہ دنوں شفق، ذوقی،شوکت حیات،اشرف جہاں،قمر جہاں، حسین الحق، شموئل احمد نے جوغم دیے تھے ابھی اس کے زخم بھرے بھی نہیں تھے کہ شاعر،افسانہ نگار،ڈرامہ نگار، زندہ دل،متحرک اور یارباش قاسم خورشید بھی ہمیں داغ فرقت دے کرنڈھال کرگئے۔ادبی دنیا حیرت زدہ ہے کہ دکھاتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔

قاسم خورشید یوں تو متنوع خوبیوں کے مالک تھے مگر میری نگاہ میں وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے۔ ناقدین کے شورشرابے سے دور ہوکر جن ادیبوں نے اپنی صحبت سے فائدہ اٹھایا اور زندگی کے تجربات سے ادب میں کوئی نئی جوت جگائی، ایسے ہی ادیبوں میں قاسم خورشید بھی شامل تھے۔اسی لیے ان کے افسانوں میں نہ تو کسی قسم کی نعرے بازی ہے اورنہ ہی ان کے ذریعے کسی مخصوص سیاسی نظریے کی تبلیغ کی گئی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں حقیقت نگاری سے کام لیا،جس کی داغ بیل پریم چند نے ڈالی تھی اور جسے سہیل عظیم آبادی کے قلم نے پروان چڑھایا تھا۔گہرے سماجی شعور کے عکاس قاسم خورشید کے افسانے،انسانی زندگی اوراس سے وابستہ مسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے اعلیٰ اور مثبت انسانی قدروں کو نمایاں کرتے ہیں۔ان افسانوں میں انھوں نے ہر مسئلے کو اپنے مشاہدے اور تجربے کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔انھیں انسانی زندگی سے جڑے ہوئے مسائل،دکھ سکھ،نارسائی،محرومی وناکامی اور انسانیت وشرافت کے استحصال کا گہرا ادراک ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنی کہانیوں میں ان تمام احساسات اور مشاہدات کو پورے خلوص، صداقت، فنکاری اور اثر پذیری کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

قاسم خورشید ذہنی طور پر ترقی پسند نقطۂ نظر کے حامل تھے،اس لیے ترقی پسند تحریک کے نظریات و خیالات کا اثر ان کے حساس ذہن پر گہرا رہا۔لہٰذا جب بھی انھوں نے قلم اُٹھایا انھیں وہ دنیا سب سے پہلے دکھائی دی جو دبے کچلے،تباہ حال،کمتر وسائل حیات کے ساتھ زندگی گزارنے والے غریب اور نادار لوگوں نے بسائی تھی۔اس طبقے میں بھی انسانوں کی جو متنوع اور ہمہ رنگ اقسام پائی جاتی ہیں،ان میں سے انھوں نے ایسے کرداروں کا انتخاب کیا،جن پر عام فن کاروں کی نظر نہیں پڑتی۔شاید ان لوگوں کے مسائل کی تہ میں اترنا ہر کس وناکس کے بس کی بات بھی نہیں ہے،کہ اپنی لائبریری میں بیٹھ کر غریبوں کے مسائل پر لکھنے اور ایسے کرداروں کے ساتھ زندگی کے شب وروز گزارنے میں بڑا فرق ہے۔قاسم خورشید ایسے افسانہ نگار تھے، جنھوں نے اپنی بے شمار صبحیں اور ان گنت شامیں ترقی پسند قافلوں،نکڑ ناٹکوں،مزدوروں کی لڑائیوں اور احتجاجی جلوسوں کی نذر کیں،اورتب انھوں نے غریبوں، مظلوموں اور تباہ حالوں کا دکھ درد قریب سے دیکھا۔لئی کھاتا ہوا بچہ،میّا،سُبا،کٹّی،سائمن باسکی،چھوبابا،سُکھیا، جتندر پرساد،مُنّو پہلوان،رُکسنا،پھولی اور وہ لڑکی جیسے کردار ان کی کہانیوں میں اپنی تمام جلوہ سامانیوں، دنیائے سوز والم،خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کی کہانیوں میں مظلوموں اور غریبوں کا دل دھڑکتا ہے۔قاسم خورشید نے ایسے ہی دلوں کی نفسیات، محبتوں،وفاداریوں اور نارسائیوں کے کامیاب مرقعے پیش کیے ہیں۔

موضوع کے اعتبار سے قاسم خورشید کی کہانیوں کو تین رنگوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے،کہ ان تینوں رنگوں میں سماج کے تین چہروں کو پینٹ کرنے کی کامیاب

کوشش ملتی ہے۔ اور یہ تینوں چہرے بنیادی طور پر افسانہ نگار کے اُس نقطۂ نظر کا عکس ہیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ پہلا رنگ اتحاد، یگانگت اور اخوت ومحبت سے علاقہ رکھتا ہے(مینا، کشن پور کی مسجد، کوئی ہاتھ، ریت پہ ٹھہری ہوئی شام، جڑیں وغیرہ) دوسرے رنگ میں محبت، تنہائی، اقدار کی بازیافت اور ناسٹلجیا کی جھلک ملتی ہے(کاہے راکھے سائیاں، دیواریں، رات، پھانس، اندر بارش باہر دھوپ، کوئی آواز وغیرہ) اور تیسرا رنگ غربت، ظلم اور استحصال کے خلاف احتجاج پر مبنی ہے(باگھ دادا، کئی کا راجکمار، وہ لڑکی، سیلاب، حربہ، تجارت، پوسٹر، اندر آگ ہے، سائمن باسکی وغیرہ)۔ ان تینوں رنگوں میں بعض بہت اچھی کہانیاں بھی ہیں اور بعض اچھی اور کم اچھی بھی۔ مگر ایک بات ان سب میں مشترک ہے کہ افسانہ نگار نے زندگی اور اس کے واقعات ومفروضات کو طرح طرح سے دیکھ کر اپنی کہانیوں میں تنوع اور رنگا رنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ رنگا رنگی کہانیوں کی وجہ سے انداز بیان اور تکنیک میں بھی دکھائی دیتی ہے، کہ بعض کہانیاں راوی نے صیغہ واحد غائب کی شکل میں بیان کی ہیں تو بعض میں راوی واحد متکلم بن گیا ہے۔ کسی میں پوری کہانی مکالموں میں مکمل ہوئی ہے تو کسی میں ڈراما یا فلیش بیک تکنیک کا خوبصورت استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی ان افسانوں میں بیانیہ کی مختلف تکنیکیں کم وبیش کامیابی کے ساتھ برتی گئی ہیں۔ لہٰذا ان کو پڑھتے وقت کسی قسم کی تکرار کا احساس نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ضرور احساس ہوتا ہے کہ بہت سے افسانے ایک ہی کردار یا ایک ہی شخص کے تاثرات پر مبنی ہیں مگر راوی یا تکنیک کے تنوع کی وجہ سے اس بات کا احساس ناگواری کی حد کو نہیں پہنچتا۔

قاسم خورشید افسانہ گوئی کے فن سے واقف تھے۔ کسی واقعے یا تجربے کو کس طرح قصہ بنانا چاہیے وہ یہ فن جانتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے افسانے کا موضوع ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے۔ ان کے افسانوں کا پلاٹ مربوط ہوتا ہے۔ مختلف واقعات میں مختلف کردار اس طرح لاتے ہیں جیسے وہ ان ہی واقعات کے لیے بنے ہوں۔ ماحول اور واقعات کی مناسبت سے قاسم خورشید کی مکالمہ نگاری ان کرداروں کو ٹھوس شکل عطا کرتی ہے۔ انسانی رشتوں اور اس کی فطری جبلتوں سے متعلق ان کرداروں کی داخلی اور خارجی کشاکش، ان کی حسرت و ناکامی، بے یقینی و بے اطمینانی، عیش و طرب اور درد وکرب کی تصویریں بنا کر وہ قاری کو زندگی کی حقیقی تصویریں دکھاتے ہیں۔ مثلاً کینوس پر جو چہرے اتحاد، یگانگت اور اخوت ومحبت کا پیکر بن کر ابھرے ہیں اُن میں 'مینا' کو آپ چاہ کر بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ یہ انسان کی انسان سے بے لوث محبت کا نمائندہ کردار ہے، جس نے جعفر امام کو دو بتاشے پر خرید کر اُس کی تقدیر بدل دی۔ افسانے میں نیم کے پیڑ کا کٹ جانا در اصل ایسے ہی بے لوث کرداروں اور قدروں کے ختم ہونے کا استعارہ ہے جنھیں ہمارے صارفیت زدہ سماج نے کاٹ کر ہمارے سروں سے محبتوں، شفقتوں اور روایتی قدروں کا سایہ چھین لیا ہے۔ انھیں قدروں کو زندگی بخشنے والے افسانے کشن پور کی مسجد، کوئی ہاتھ اور جڑیں وغیرہ بھی ہیں۔ وطن پرستی، سیکولرزم اور بابری مسجد انہدام کے المیے پر بہت ساری کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ ایسی ہر کہانی میں سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ ہندستان فرقوں میں کیوں بٹا ہوا

ہے؟ ہم سکون کی زندگی کیوں نہیں گزار پاتے؟ آزادی مل گئی مگر زندگی خون آلود کیوں ہے؟ جیسے سوالات۔ قاسم خورشید نے ان سوالات سے نبرد آزما ہونے کے بجائے اتحاد، یگانگت اور سیکولرزم کی اُس روح تک پہنچنے کی کوشش کی جو ان سوالات کا واحد جواب ہے۔ انھوں نے مسجد یا مندر کے انہدام کا ذکر کیے بغیر 'کشن پور کی مسجد' میں ہندستان کے زیادہ تر ہندوؤں اور مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کر دیا ہے، جو نہ تو کسی مسجد کا انہدام چاہتے ہیں اور نہ کسی مندر کی مسماری۔ 'کوئی ہاتھ' اور 'جڑیں' جیسے افسانوں میں بھی اخوت، محبت اور یگانگت کا ایسا ہی ماحول خلق کیا گیا ہے جہاں مثبت قدروں کی بازیافت اور رمضانی اور شیخ جمعراتی جیسے کرداروں کی تلاش سے معاشرے کو منزہ بنانے کا جذبہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ افسانے اپنی روایات کو فراموش کرنے والوں اور اخوت و اخلاقیات کی دھجیاں اڑانے والوں کے لیے تازیانۂ عبرت سے کم نہیں۔ یہ افسانے حقیقت پسندانہ احساسات سے مملو ہیں اور اُس فکری حصار کو توڑ دینا چاہتے ہیں جسے معاشرے کے چند افراد کی ذہنی آوارگی نے کھینچ رکھا ہے۔

دوسرے رنگ میں قاسم خورشید نے عشق ومحبت کے موضوع پر جو کہانیاں لکھی ہیں وہ اس موضوع پر ان کی دسترس کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں وہ چھوٹے سے چھوٹے واقعے کو ایک بڑا قصہ بنا کر پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر پھانس، رات، اندر بارش باہر دھوپ اور کوئی آواز وغیرہ پڑھ جایئے۔ یہاں عشق کی وارفتگی، یادوں کا عذاب اور ناسٹلجیائی کرب تو دکھائی دے گا، مگر وہ بے راہ روی، بے اعتدالی یا عریانیت نہیں ملے گی جسے بعض لوگ رومانی کہانیوں کی جان سمجھتے ہیں۔ رات، دیواریں اور کوئی آواز جیسی کہانیاں تنہائی کے اُس کرب کو بڑے دلآویز اسلوب میں پیش کرتی ہیں، جب انسان دعا کرنے لگتا ہے۔

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

'ریت پر ٹھہری ہوئی شام' راجستھان کے ایک غریب قبیلے کی کہانی ہے جہاں پھولی اور کِسنا کی محبت پروان چڑھتی ہے۔ محبت اور اعتماد کا رشتہ اتنا مضبوط ہے کہ غربت اور بھوک بھی نہ تو کسنا کی محبت کو نقصان پہنچا

پاتی ہے اور نہ پھولی کی معصومیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کی دوسری خوبی راجستھانی کلچر اور بالخصوص اُس قبیلے کی ٹوپوگرافی ہے جس کو نگاہ میں رکھ کر یہ کہانی بُنی گئی ہے۔ 'پھانس' اس حصے کی سب سے الگ کہانی ہے جو مکالماتی تکنیک کے سہارے پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ مسکان ایک ماڈرن لڑکی ہے مگر مشرقی اندازِ فکر اور قدروں سے وابستہ ہے، اس لیے وہ واحد متکلم سے بے انتہا عشق کے باوجود اپنے پاپا کی تنہائی کے خوف سے نہ صرف شادی سے انکار کر دیتی ہے بلکہ واحد متکلم کی شادی روبینہ سے کروا کر اس کی زندگی سے نکل جاتی ہے۔ مگر کہاں؟ وہ تو دور جا کر بھی واحد متکلم کی سانسوں میں بسی ہوئی ہے، اور اس قدر رچی بسی ہے کہ وہ اس سے مکتی پانے کی دعائیں کرتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ افسانہ نیا نہیں ہے اور نہ منفرد ہے، مگر تکنیک، زبان اور اسلوب کے لحاظ سے اسے یقیناً انفرادیت حاصل ہے۔ لیپ ٹاپ، موبائل اسکرین، کپل جیسے الفاظ کے علاوہ ماڈرن انگریزی اردو مکالمے اور لب و لہجے سے اس افسانے میں وہ نیا پن، بے ساختگی اور فطری انداز در آیا ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ اس حصے کی زیادہ تر کہانیاں ایک ایسے پڑاؤ پر جا کر ختم ہوتی ہیں جہاں سے زندگی کی نئی سچائیاں شروع ہو کر قارئین کو نئی ڈگر سے روشناس کراتی ہیں۔ یہ نئی ڈگر انسان کو اپنے آپ میں سمو لینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ یہاں قاسم خورشید نے فرد کی نفسیات اور اس سے متعلق مسائل کو اجاگر کرنے میں اپنی بھرپور صلاحیت سے کام لیا ہے۔ یہ کہانیاں رشتوں کو لے کر لکھی گئی ہیں جہاں رشتے اپنے تقدس، اپنی حرمت کے تحفظ اور فرائض و ذمہ داریوں کے تئیں حساس ہوتے ہیں۔ یہاں مرکزیت نسوانی کرداروں کو حاصل ہے جو حالات سے سمجھوتہ تو کرتی ہیں مگر نہ ضمیر فروشی کی ترغیب دیتی ہیں اور نہ خودکشی کا تصور۔ مذکورہ افسانوں کے علاوہ 'ٹھیس'، 'اندر بارش باہر دھوپ'، 'رات'، 'سبا رو نہیں سکتی' وغیرہ بھی زندگی کا محاصرہ کیے ہوئے ایسے ہی توانا کرداروں اور زندہ احساسات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

تیسرے رنگ کے طور پر، کئی کا راجکمار، وہ لڑکی، حربہ، تجارت، پوسٹر، اندر آگ ہے اور سائمن باسکی وغیرہ میں قاسم خورشید نے غربت، ظلم، نفرت اور استحصال کے خلاف احتجاج کو موثر اور بلند آواز کے ساتھ ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ استحصال اور احتجاج کے سایے تلے لکھی گئی یہ کہانیاں ہمارے سماج کی مختلف سچائیاں اجاگر کرتی ہیں، جہاں غربت، ظلم، دہشت گردی، حیوانیت اور مشینی زندگی نفرت کے بیج بو رہی ہے۔ انسان میکانکی نفسیات کا شکار ہو رہا ہے اور مادیت روحانیت کی جگہ قبضہ جمانے پر تلی ہے۔ ایک حساس آدمی ایسے ماحول سے متاثر ہو کر کیسی feelings رکھتا ہے، اس کی اچھی عکاسی ان کہانیوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ 'پوسٹر' تو وہ مشہور زمانہ افسانہ ہے جو قاسم خورشید کی شناخت بنا، اس لیے اس پہ زیادہ گفتگو نہیں کروں گا، مگر احمد یوسف کی اس بات سے ضرور اتفاق کرنا چاہوں گا

> **قاسم خورشید نے چونکہ اپنے شب وروز مزدوروں کے بیچ، جھریا کی کولریوں میں، کسانوں کے گائوں میں اور اپٹا کو متحرک کرتے ہوئے پٹنہ جیسے کئی شہروں کی سڑکوں پہ گزارے تھے اس لیے انھوں نے پوسٹر، اندر آگ ہے، سائمن باسکی اور کئی کا راجکمار جیسی سچائیوں کا سامنا کیا ہے۔ اور انہیں سچائیوں کو بڑے خلوص، ذمہ داری اور سنجیدگی کے ساتھ قاری کی نذر کر دیا ہے۔**

کہ 'پوسٹر جیسا افسانہ کبھی کبھی سرزد ہوتا ہے'۔ محمد حسن سے وہاب اشرفی تک سب نے پوسٹر کو اتنا سراہا کہ اب یہ اردو فکشن کا اہم حصہ بن گیا ہے۔ اس میں ایسی سفاک حقیقتوں کا بیان ملتا ہے جن کا تصور وہ شخص کبھی نہیں کر سکتا جس کا تعلق زمینی سچائیوں سے نہ ہو۔ قاسم خورشید نے چونکہ اپنے شب و روز مزدوروں کے بیچ، جھریا کی کولریوں میں، کسانوں کے گاؤں میں اور اپٹا کو متحرک کرتے ہوئے پٹنہ جیسے کئی شہروں کی سڑکوں پہ گزارے تھے اس لیے انھوں نے پوسٹر، اندر آگ ہے، سائمن باسکی اور کئی کا راجکمار جیسی سچائیوں کا سامنا کیا ہے۔ اور انھیں سچائیوں کو بڑے خلوص، ذمہ داری اور سنجیدگی کے ساتھ قاری کی نذر کر دیا ہے۔ ان کہانیوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی صداقت اور جذبے کا خلوص ہے جو محمد حسن کو ہی نہیں انور سدید اور وہاب اشرفی جیسے ناقدین کو بھی متاثر کرتا ہے۔ سائمن باسکی جو مزدوروں کے استحصال کی ہی نہیں اُن کے احتجاج کی کہانی بھی ہے، پروفیسر وہاب اشرفی کی نظر سے گزرتی ہے تو لکھتے ہیں:

''قاسم خورشید کی 'سائمن باسکی' مجھے آج بھی گرویدہ کیے ہوئے ہے۔ پہلے میں نے اسے محض مزدوروں کے استحصال کی کہانی کے طور پر پڑھنے پر بس کیا تھا لیکن تاثر دیرپا تھا۔ اب جب کہ قاسم خورشید کا افسانوی سفر آگے بڑھ گیا ہے، اس کہانی کی سماجی اور تہذیبی معنویت مزید گہری ہو گئی ہے۔ یہ کہانی مزدوروں کی پسپائی پر ختم نہیں ہوتی بلکہ یہاں شکستہ حالات میں بھی آگے بڑھنے کا حوصلہ ختم نہیں ہوتا۔''

دراصل سائمن باسکی کے ہاتھ سے اُس کے اکلوتے بیٹے کا ہاتھ میں مشعل لے کر آگے بڑھنا اُس مستقبل کی طرف اشارہ ہے جہاں احتجاج کی آواز میں مزید توانائی پیدا ہو جاتی ہے اور حوصلوں کی آگ زیادہ روشن ہو جاتی ہے۔

'اندر آگ ہے' بھی کولکری مزدوروں کی زندگی، اُن کے کرب کو موثر ڈھنگ سے پیش کرتا ہے۔ یہاں کولکری کے اندر کی آگ کب کس زندگی کو خاکستر کر دے، کہا نہیں جا سکتا۔ اب تک بے شمار زندگیاں اس کی نذر ہو چکی ہیں۔ مگر یہی آگ جب احتجاج بن کر سینوں میں جل اٹھتی ہے تو زندگیوں کو روشن بھی کر دیتی ہے۔ ایسا ہی رام دین کے ساتھ ہوا جس نے سُکھیا کی زندگی کو تو خاکستر کیا مگر دوسرے مزدوروں کو بیدار بھی کر گیا۔ افسانے کا آخری جملہ ''یہی انگارے مزدوروں کے وجود میں منتقل ہونے لگے'' دراصل احتجاج کی آگ کا اشاریہ ہے جو مزدوروں کے اندر رام دین کی موت پر دھیرے دھیرے پیدا ہونے لگی تھی۔ اس افسانے میں ''پنجرے کی مینا'' بھی اہم کردار ہے جو سُکھیا کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ یہ تو افسانہ پڑھ کر ہی آپ کو پتہ چل سکتا ہے کہ آخر کولکری کا ہر مزدور اپنے گھر کے سامنے پنجرے میں مینا کیوں رکھتا ہے؟

افسانہ 'تجارت' ہمارے نام نہاد ترقی پذیر، روشن خیال سماج میں عورت کے استحصال کا آئینہ ہے۔ ماتھر جو بظاہر بے حد معزز، مخلص اور دولت مند شخصیت کا مالک ہے، جیتندر پرساد کے خلوص، اعتماد اور بھروسے کو اُس وقت چور کر دیتا ہے جب وہ جیتندر کی بیٹی 'سیما' جو ماتھر کو انکل کہتی تھی اور اس کی تیمارداری بیٹی کی طرح کر رہی تھی' کی عزت لوٹ لیتا ہے۔ اور بدلے میں جیتندر پرساد کا ایک ٹنڈر پاس کر دیتا ہے۔ یہ افسانہ بدلتی قدروں اور رشتوں کا نوحہ تو ہے ہی، یہ بھی بتاتا ہے کہ

قاسم خورشید نے اپنے افسانچے شاعرانہ سلیقہ مندی سے تحریر کیے ہیں۔سیلاب، دھرم اور عبادت کو تو اُردو کے نمائندہ افسانچوں میں شمار کیا جاسکتاہے۔ان میں سماجی امتیازاور مٹتی ہوئی قدروں کا ذکر بڑے بولڈ اور چونکانے والے انداز میں ہواہے۔

تاجر بہر حال تاجر ہوتا ہے۔وہ بزنس اور استحصال کے نت نئے طریقے ڈھونڈ تا رہتا ہے۔افسانہ 'وہ لڑکی' میں بھی اسی طرح کے ایک استحصال کی دردناک داستان ہے۔ انسان کی حیوانیت پر مبنی مختصر افسانہ 'سیلاب' بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے جس میں لوگ سیلاب میں مرنے والوں کی لاشوں سے اُن کے زیورات نوچ رہے ہیں۔اس بیچ گہنے سے لدی عورت کسی کونظر آئی۔ اُس نے اسے نوچنا شروع کیا ہی تھا کہ وہ کراہ اٹھی۔ آدمی پل بھر کے لیے پیچھے ہٹتا ہے اور پھر عورت کو یہ کہتے ہوئے موجوں کے حوالے کر دیتا ہے کہ 'سالی زندہ ہے'۔ ظاہر ہے انسانیت کے زوال،اور حیوانیت و سفاکیت کی اس سے بدتر کہانی مشکل سے مل سکتی ہے۔ یہی سفاکیت 'حربہ' میں بھی دکھائی دیتی ہے جب شیر خاں اپنی فتح اور انا کی تسکین کے لیے نہ صرف منو کا استحصال کرتا ہے بلکہ بے قصور نصرت بائی کا بھی قتل کروا دیتا ہے۔اس طرح کے افسانوں سے زوال پذیر سماج کی مختلف تصویریں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ معاشرہ ناسوروں سے بھر چکا ہے، جان کی کوئی قیمت نہیں رہ گئی ہے،خون کی ہولی فخر کے ساتھ کھیلی جارہی ہے۔قتل کا تیوہار منایا جارہا ہے۔ ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگلنے کے درپے ہے۔نفرت، بدلے اور ظلم کی آگ میں جلتا ہوا سماج دوزخ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ظاہر ہے اس میں تبدیلی آسانی سے نہیں ہونے والی اور نہ افسانہ نگار کا مقصد اصلاح کا سبق پڑھانا ہے۔ جب پورا معاشرہ ہی زہر آلود ہو گیا ہو تو اس میں اصلاح کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے؟ ہاں کچھ کرداروں کی تخلیق کر کے افسانہ نگار نے روشن مستقبل کی ایک امید ضرور جگائی ہے۔سائمن بو سکی کا لڑکا،منو پہلوان کی فتح،اجو بابا،شیخ رمضانی،منو اور رام دین بابو وغیرہ اس روشن مستقبل کا اشاریہ ہیں کہ افسانہ نگار نا امید نہیں ہے۔اُسے امید ہے کہ ظلم و استحصال کا ننگا رقص اب زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہے گا۔آنے والے دنوں میں تڑپتی اور کراہتی انسانیت کو تمام تر دکھوں سے نجات حاصل ہوگی۔یہ کردار ''افراد'' نہیں ہیں بلکہ بیشتر دلوں میں احتجاج اور بغاوت کے جو شعلے روشن ہیں، اُن کی علامت ہیں، انہی سے ایک دن ظلم و استحصال کا خاتمہ ہوگا اور انسانیت مسکرا اٹھے گی۔

قاسم خورشید کو پڑھتے ہوئے ان کے کچھ افسانچے بھی ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔تین چہروں والا میں،سیلاب،پھوڑا،دھرم اور عبادت جیسے افسانچوں میں مجھے طویل افسانوں سے زیادہ دم خم نظر آیا ہے۔اور یہ بڑی بات ہے کیونکہ افسانچہ لکھنا طویل کہانی لکھنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔یہ ایک شعر کی طرح ہوتا ہے۔ اس میں کہانی کی فنی خامیاں چھپائی نہیں جا سکتیں۔چند سطروں میں کہانی کا تار پود بُنا ہوتا ہے۔ اس کا تیور بولڈ اور شارپ ہوتا ہے اور وہ قاری کے ذہن کو ہانٹ کرتا ہے۔جس لفظ سے افسانچہ کاغذ کی سطح پر شروع ہوتا ہے وہ اس کا نقطۂ آغاز نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کا آخری لفظ نقطۂ اختتام۔بلکہ اصل کہانی تو ان لفظوں کے پس پردہ قاری کے ذہن میں برسہا برس چلتی رہتی ہے۔قاسم خورشید نے اپنے افسانچے شاعرانہ سلیقہ مندی سے تحریر کیے ہیں۔سیلاب،دھرم اور عبادت کو تو اُردو کے نمائندہ افسانچوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ان میں سماجی امتیاز اور مٹتی ہوئی قدروں کا ذکر بڑے بولڈ اور چونکانے والے انداز میں ہوا ہے۔یہ افسانچے کہیں فکر کو مہمیز کرتے ہیں تو کہیں طنز کے نشتر چبھوتے ہیں، اور کہیں مکالماتی انداز میں بین السطور کوئی پیغام بھی سنا دیتے ہیں۔قاسم خورشید نے ان افسانچوں کے ذریعہ کم سے کم لفظوں کے اظہار کے چیلنج کو نہ صرف قبول کیا ہے بلکہ کامیابی سے برت کر بھی دکھایا ہے۔

قاسم خورشید نے افسانوی کینوس پر بڑی والہانہ کیفیت میں چہرے بنائے ہیں۔یہ چہرے ہمارے مکروہ سماج کا آئینہ ہیں۔ان چہروں کے پیچھے آگ کا صحرا بھی ہے اور قلم کی آگ بھی۔اُس وقت جب اردو افسانے میں کہانی کی گم شدگی اور قاری کی عدم دلچسپی کی بات ہو رہی تھی،قاسم خورشید جیسے لوگوں نے احساس دلایا کہ کہانی زندہ ہے،مری نہیں۔ وہ سادہ بیانیہ انداز میں کہانیاں لکھتے تھے مگر ان کہانیوں میں قلب اور قرب کا بہت گہرا عنصر ہوتا تھا۔انھوں نے کہانیاں وہی لکھیں جن کے مشاہدے یا تجربے سے وہ گزر چکے تھے۔ وہ ایر کنڈیشنڈ روم میں بیٹھ کر جھونپڑیوں کی کہانیاں نہیں لکھتے تھے اور نہ ہی عیش وطرب کی محفل میں درد کا نغمہ سناتے تھے۔انھوں نے جس درد کو جیا، جس کرب کو سہا اسی کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ اس لیے داخلی کشمکش، ذہنی تناؤ، باطنی کرب،انسان کی بے حسی، بے مروتی،استحصال،جبر کے مسائل اور المیوں کا سچا بیان ان کی کہانیوں میں ملتا ہے۔

اردو افسانوں کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ان میں تنوع نہیں ہوتا،مگر قاسم خورشید کے افسانے زندگی کے مختلف گوشوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ موضوعات کی سطح پر ان میں تنوع کا احساس ہوتا ہے تو محسوسات کی سطح پر بھی یہ ہمارے ذہن و دل کو مضطرب کر دیتے ہیں۔ان کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے قاری سرسری طور پر نہیں گزر سکتا۔کوئی افسانہ اسے چونکائے گا تو کوئی غور وفکر کے لیے مجبور کرے گا۔کوئی واقعہ اپنے حیرت انگیز اختتام کی بنا پر اسے استعجابی کیفیتوں میں مبتلا کرے گا تو کوئی کردار اپنے غیر یقینی رویے اور ردعمل کی بنا پر اُس کی فکر کو منتشر کر دے گا۔قاسم خورشید کے افسانوں میں اس نوعیت کی کیفیات قدم قدم پر محسوس ہوتی ہیں۔یہ افسانے وحدت تاثر اور وحدت مکاں کے تصور سے بھی آزاد ہیں۔کچھ افسانوں کی مدت چند لمحوں تک محدود ہے تو کچھ افسانے زندگی کے وسیع منظر نامے کا احاطہ کرتے ہیں۔ان افسانوں کی قرأت جب تک مکمل نہیں ہوتی قاری کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائے گا۔اکثر افسانوں کا آخری جملہ تاثرات کی بکھری کڑیاں جوڑنے میں معاون ہوتا ہے اور کاغذ پہ ختم ہونے کے بعد کہانی دوبارہ ہمارے ذہن میں شروع ہو جاتی ہے۔ شاید ایک اچھے افسانے کی یہی خوبی ہوتی ہے، جو قاسم خورشید کے افسانوں میں بہت حد تک موجود ہے اور انھیں ادب میں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

■

Dr. Shahab Zafar Azmi
Department of Urdu
Patna University
Patna- 800005 (Bihar)
Mob.:8863968168
shahabzafar.azmi@gmail.com
urdujournalpatna@gmail.com

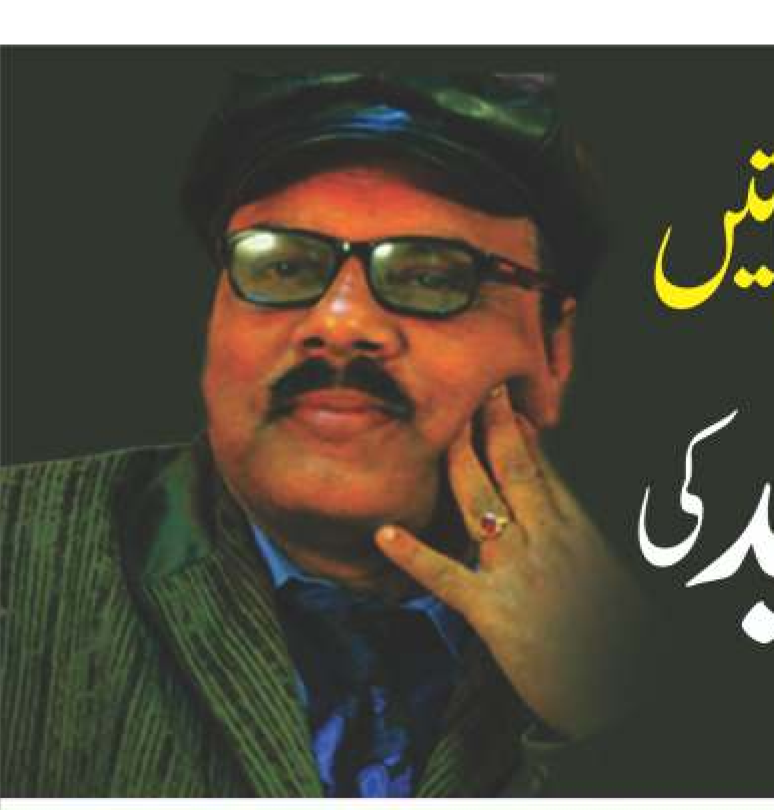

صدر عالم گوہر

کچھ یادیں کچھ باتیں قاسم خورشید کی

30 ستمبر کی صبح فیس بک کھولتے ہی موبائل کی اسکرین پر ایک نوٹیفکیشن آیا۔ میں چونکا اور اس نوٹیفکیشن کو کھولا تو دیکھا کہ قاسم خورشید کے انتقال کی خبر فیس بک پر مسلسل آرہی تھی۔ میں سکتے میں آگیا۔ بہت افسوس ہوا، یقین ہی نہیں ہوا۔ میں نے اور پوسٹیں دیکھنا شروع کیں۔ فیس بک پر چاروں طرف وہی خبر نظر آئی، مختلف لوگوں نے تعجب اور غم و افسوس کا اظہار کیا تھا۔

ایک دو دن پہلے ہی قاسم خورشید نے ایک پوسٹ لگائی تھی جس میں انھوں نے ساہتیہ اکادمی کے سہ روزہ بین الاقوامی پروگرام کے اختتام کی خبر تصویروں کے ذریعے دی تھی۔ وہ اکثر اپنی سرگرمیوں کو فیس بک پر ڈالتے رہتے تھے اور احباب کو آگاہ کرتے رہتے تھے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ انھوں نے ہندی میں بھی ایک پوسٹ کی تھی جس کا اردو ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:

''آج ساہتیہ اکادمی کا عظیم الشان اور انتہائی کامیاب بین الاقوامی ادبی میلہ محترم نائب صدر کے ہاتھوں اختتام پذیر ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کے علاوہ 16 ممالک کے نمائندہ ادیبوں کے ساتھ چار دنوں تک بہار، ہندوستان اور دنیا پوری طرح تہوار کے ماحول میں تھی۔ چونکہ مجھے بھی بطور ادیب مدعو کیا گیا تھا، اس لیے مجھے ایک خصوصی نشست میں بھی شامل کیا گیا تھا۔ تقریباً ہر روز الیکٹرانک، پرنٹ اور سوشل میڈیا نے میری رائے لی اور مجھے بہترین کوریج دی، آج پر بھات خبر نے ایک پورا صفحہ وقف کر دیا ہے۔ اسی طرح آج اختتامی تقریب کے بعد مختلف صحافیوں نے مجھ سے طویل فیڈ بیک لیا۔ میں نے اس ادبی میلے پر آکاشوانی کو ایک خصوصی انٹرویو بھی دیا ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ بہترین وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے، بہت سی خوبصورت یادیں ذہن میں ہلچل مچا دیتی ہیں۔ اس کامیاب پروگرام کے لیے ساہتیہ اکادمی کو دلی مبارکباد۔ آج کی کچھ تازہ ترین تصویری جھلکیاں جو خود ہی بول سکتی ہیں۔''

کیا پتہ تھا کہ فیس بک پر یہ قاسم خورشید کی آخری پوسٹ ہوگی۔ بہت خوش و خرم نظر آرہے تھے۔ یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ یہ چراغ کے آخری وقت کی تیز روشنی ہے۔ اس کے بعد یہ چراغ بجھنے والا ہے۔ خورشید ڈوبنے والا ہے۔

مجھے یاد آنے لگا قاسم خورشید کا دور درشن کے مشاعرے میں نظامت کا وہ لمحہ جب وہ میرا تعارف کچھ اس طرح سے کرا رہے تھے:

''اب میں جس شاعر کو زحمت دینے جارہا ہوں جو اپنے منفرد ڈکشن اور فکشن کے لیے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ میری مراد صدر عالم گوہر سے ہے۔ میں ان سے کہوں گا کہ وہ اپنے کلام سے نوازیں، جناب صدر عالم گوہر۔'' بچوں نے اس پروگرام کو ٹی وی سے ریکارڈ کر لیا تھا۔ جسے وہ وقتاً فوقتاً موبائل اور لیپ ٹاپ پر دیکھتے رہتے ہیں۔ میں جب بھی اس پروگرام کو دیکھتا ہوں قاسم خورشید کا ہنستا مسکراتا چہرہ سامنے آجاتا ہے۔

وہ ایک شاعر، افسانہ نگار کے ساتھ ایک بہترین ناظم بھی تھے۔ دور درشن میں رہنے کی وجہ سے وہ جانتے تھے کہ نظامت کو کس طرح جاندار بنانا ہے۔ ایک ڈرامائی انداز سے وہ نظامت کے فرائض انجام دیتے تھے جس سے پروگرام کامیاب اور خوبصورت ہو جاتا تھا۔

ان کے مشاعرہ پڑھنے، غزل کے اشعار کو ادا کرنے کا اتنا اچھا انداز تھا کہ ناظرین کو متوجہ کرنے میں وہ بہت کامیاب تھے۔ جو غزل پڑھتے وہ اتنے اہتمام کے ساتھ اور اس انداز میں کہ غزل اور زیادہ پر اثر ہو جاتی تھی۔ لوگ واہ واہ کرتے اور تالیاں بجاتے تھے، میں نے دور درشن کے علاوہ دوسرے مشاعروں میں بھی ان کا یہ انداز دیکھا تھا۔

آج کے مشہور گلوکار شان کے والد مانس مکھرجی جو ایک اچھے موسیقار تھے، ان سے میری دوستی تھی۔ ایک دن میں ان کے ہاں بیٹھا تھا۔ اس وقت صرف دلی دور درشن تھا۔ شاید بدھ کا دن تھا تو ٹیلی ویژن پر فلمی گانوں کا پروگرام 'چترہار' آرہا تھا، جس میں فلم آر پار کا یہ گانا 'بابو جی دھیرے چلنا' چل رہا تھا۔ ہم لوگ بیٹھے تھے کہ ایک صاحب آئے۔ انھوں نے کہا عجیب بات ہے۔ اندرا گاندھی کا قتل ہو گیا ہے۔ سارا ملک غم میں ڈوبا ہوا ہے اور آپ لوگ یہاں ہنس رہے ہیں، مسکرا رہے ہیں۔ کیا آپ لوگوں کو معلوم نہیں، اندرا گاندھی کا قتل ہو گیا ہے۔ ہم لوگوں کو لگا کہ شاید یہ خبر افواہ ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ٹیلی ویژن پہ گانا نہیں چل

> ان کے مشاعرہ پڑھنے،غزل کے اشعار کوادا کرنے کا اتنا اچھا انداز تھا کہ ناظرین کو متوجہ کرنے میں وہ بہت کامیاب تھے۔ جو غزل پڑھتے وہ اتنے اہتمام کے ساتھ اور اس انداز میں کہ غزل اور زیادہ پر اثر ہو جاتی تھی۔ لوگ واہ واہ کرتے اور تالیاں بجاتے تھے، میں نے دور درشن کے علاوہ دوسرے مشاعروں میں بھی ان کا یہ انداز دیکھا تھا۔

رہا ہوتا۔ ہم لوگ اس کو افواہ سمجھے۔ وہیں بیٹھے شاید معروف نغمہ نگار نوروے واسی جن کا گانا ہے۔

آؤ حضور تم کو ستاروں میں لے چلوں
دل جھوم جائے ایسی بہاروں میں لے چلوں

انھوں نے یا ہم لوگوں میں سے کسی نے یہ شعر پڑھا۔

آپ سے ہنس کے جو ملتا ہوگا
اس کا غم آپ سے زیادہ ہوگا

یہ شعر انھوں نے مذاق میں کہہ دیا تھا مگر اسی وقت گانا چلنا بند ہوا اور ٹیلیویژن پر قرآن کی تلاوت ہونے لگی، بھجن، شبد ممبئی دور درشن سے پڑھے جانے لگے۔ تب ہم لوگوں نے سمجھا کہ نہیں یہ واقعہ سچ ہے۔ اس شعر کا موقع اور محل ایسا تھا کہ مجھے ہمیشہ کے لیے یاد ہو گیا۔ مجھے جب قاسم خورشید کے بارے میں پتہ چلا کہ انھیں اولاد نہیں ہے تو مجھے لگا جیسے یہ شعر قاسم خورشید کے لیے ہی کہا گیا ہے۔

کتنے غموں کو دل میں چھپائے ہوئے وہ ہمیشہ ہنستے، مسکراتے چھپاتے تھے۔ جس محفل میں جاتے سب لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے۔ ہر پروگرام میں اپنی حاضری اور موجودگی کا احساس دلاتے تھے۔ میں

نے فلمی دنیا کے شاعر، ادیب، گلوکار اور فلم سے منسلک بڑی ہستیوں کے انٹرویوز لیے ہیں۔ انھوں نے اپنی جدوجہد کی کہانی سنائی، سنگھرش کا ذکر کیا، اسٹرگل کی بات کہی، لیکن ایک عام آدمی کی زندگی میں بھی کم جدوجہد نہیں ہے۔ قاسم خورشید کی زندگی میں بھی بہت جدوجہد تھی۔ انھیں بچپن سے ہی زندگی جینے کے لیے سنگھرش کرنا پڑا تھا۔ اور ان کا سنگھرش بھی کسی فلم والے کے سنگھرش سے کم نہیں تھا، جو ان کے دوستوں نے بتایا۔ لیکن انھوں نے اپنی اس جدوجہد کو اپنے سنگھرش کو، کبھی زبان سے نہیں کہا مگر اپنی شاعری میں ضرور باتوں کی طرف اشارہ کیا۔ ان کے اشعار سے یہ باتیں واضح ہوتی ہیں۔

مجھے پھولوں سے، بادل سے ہوا سے چوٹ لگتی ہے
عجب عالم ہے اس دل کا وفا سے چوٹ لگتی ہے

———

بہت چھل کر چکی دنیا مجھے تنہا بھٹکنے دو
ہوا بھی ہم سفر ہو تو ہوا سے چوٹ لگتی ہے

میرا ماننا ہے کہ اگر کوئی تخلیق کار اپنی تخلیقی زندگی کا سفر شاعری سے شروع کرتا ہے اور پھر وہ افسانے یا نثر یا کسی دوسری صنف کی طرف جاتا ہے تو وہ اگر محنت کرے اور شوق ہو تو وہ کسی بھی صنف پر لکھ سکتا ہے۔ جس کی ایک مثال میں بھی ہوں اور یہ میں نے قاسم خورشید میں بھی دیکھا۔ میں انھیں شاعر اور افسانہ نگار کے طور پر جانتا تھا لیکن جب انھیں موقع ملا تو بچوں کا ادب بھی تخلیق کیا۔

پہلے وہ پٹنہ، گردونواح اور صوبائی سطح پر شعر و ادب میں سرگرم تھے۔ لیکن SCERT سے ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے مرکز کا رخ کیا اور قومی شناخت قائم کی۔ گزشتہ چند برسوں میں قومی سطح پر ان کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ مجھے خوشی ہوتی تھی ان کی کامیابی پر۔ وہ اکثر میسنجر پر مجھے اس کی اطلاع بھی دیتے تھے اور فیس بک پر تو لکھتے ہی تھے۔

قاسم خورشید سے میری بہت پرانی جان پہچان تھی۔ پہلی ملاقات کیسے ہوئی یہ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہے لیکن ایک ملاقات مجھے یاد ہے جب میں محکمہ اردو ڈائریکٹوریٹ پٹنہ کے کسی پروگرام میں آیا تھا اور میں نے قاسم خورشید صاحب کو فون کیا تو انھوں نے SCERT کے دفتر میں ملاقات کا وعدہ کیا اور اس جگہ کا انھوں نے پتہ بتایا۔ میں وقت مقررہ پر ان کے ایس سی ای آر ٹی کے دفتر پہنچا۔ پرتپاک خیر مقدم کیا انھوں نے اور ہم لوگ دیر تک بیٹھے رہے۔ مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں، جن میں ادب، ثقافت، فلم، ریڈیو سارے موضوعات تھے۔ اس کے بعد پھر ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کئی بار میں ان کے گھر بھی گیا جہاں وہ بڑے خلوص سے ملے اور انھوں نے مجھے کچھ کتابیں بھی دیں، جو ان کے افسانوں کے مجموعے تھے۔ وہ ہمہ جہت صلاحیت کے حامل تھے اس لیے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ چونکہ میرا تعلق ممبئی اور فلمی دنیا سے ہے۔ اس لیے انھوں نے ممبئی اور فلمی دنیا سے متعلق گفتگو کی اور مجھے انھوں نے کہا کہ کبھی دور درشن پر بھی آیئے۔ ان دنوں وہ دور درشن کا اردو پروگرام 'آئینہ' دیکھ رہے تھے۔ اس طرح انھوں نے بزم اردو کے پروگرام آئینہ کے تحت ایک مشاعرے میں مجھے مدعو کیا۔

چونکہ قاسم خورشید اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے تخلیق کار تھے۔اور دونوں زبانوں کے علمی اور ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل تھی، اس لیے ہندی زبان کے شاعر وادیب جن کے تلفظ درست تھے ان کو بھی مشاعروں میں مدعو کیا کرتے تھے۔کیونکہ میں جس دور درشن کے ’آئینہ‘ پروگرام میں مدعو تھا اس میں ایک شاعرہ کے طور پر آرادھنا پرساد کو بھی قاسم خورشید نے مدعو کیا تھا۔

ایک بار میں نے اپنے کہکشاں پبلی کیشن سے اپنے دوست گووند راکیش کے شعری مجموعے ’دیکھتا ہوں خواب‘ کو شائع کیا تو گووند راکیش نے اس کے اجرا کی ذمہ داری بھی مجھے ہی سونپی۔اس کے لیے گووند راکیش کے شہر دلسنگ سرائے میں ایک سنیما ہال کے تینوں شو کو بک کر لیے گئے اور اسی میں کتاب کا اجرا ہونا طے پایا۔میں نے اس کے لیے ایک آل انڈیا مشاعرے کی فہرست ترتیب دی۔جس میں ہندی اردو کے معروف شعرا اور کویوں کو مدعو کیا۔اسی سلسلے میں میں نے پٹنہ سے قاسم خورشید کو دعوت دی۔پٹنہ سے دل سنگھ سرائے کا کار میں ایک تھکا دینے والا سفر ہوتا ہے لیکن میری دعوت پر قاسم خورشید نے کوئی حیلہ بہانہ نہیں کیا بلکہ خوشی خوشی انھوں نے پروگرام میں شامل ہونے کی دعوت قبول کی اور پٹنہ سے سڑک کے راستے کار سے دل سنگھ سرائے آئے۔ان کے آتے ہی محفل قہقہوں اور مسکراہٹوں میں تبدیل ہوگئی۔

قاسم خورشید نے اپنے مخصوص لب ولہجے کی وجہ سے سامعین سے خوب داد وتحسین وصول کی اور اسی شاندار مشاعرے میں کتاب کا اجرا ہوا۔یہ ان کی محبت تھی کہ انھوں نے میرے تعلقات کا بھرم رکھا اور کسی تکلیف کا خیال کیے بغیر دل سنگھ سرائے تشریف لائے اور اپنی ادب دوستی کا بھی ثبوت دیا۔قاسم خورشید سے یہ یادگار ملاقات اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔

اس کے بعد پٹنہ میں قاسم خورشید سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔خاص کر رحمانیہ ہوٹل میں جو بہت مشہور ہے۔وہاں ہم لوگ چائے پیتے اور گفتگو کرتے۔

فون پر بھی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔اس بیچ ان کی ادبی سرگرمیاں تیز ہوگئیں۔وہ اکثر اپنی سرگرمیوں کا ذکر فیس بک کے ذریعے کرتے اور خاص کر میسنجر سے مجھے اطلاع دیتے جیسے این سی پی یو ایل کا کوئی پروگرام

قاسم خورشید کی شاعری میں زندگی کا پورا منظرنامہ موجود تھا۔ اُن کے اشعار میں محبت کی لطافت بھی تھی، کرب و دکھ کی گہرائیاں بھی، اور امید کی کرنیں بھی۔ وہ لفظوں کے ایسے معمار تھے جو جذبات کی نازک تراش خراش سے پیکر عطا کرتے تھے۔ اُن کی غزلوں میں روایت کی خوشبو اور جدیدیت کی تازگی ایک ساتھ ملتی ہے۔ قاری اُن کے کلام میں اپنی روح کی آواز سنتا ہے اور دل کے زخموں پر مرہم پاتا ہے۔ ان کے شعری مجموعوں کے نام ہیں ’تھکن بولتی ہے‘ اور ’دل کی کتاب‘۔

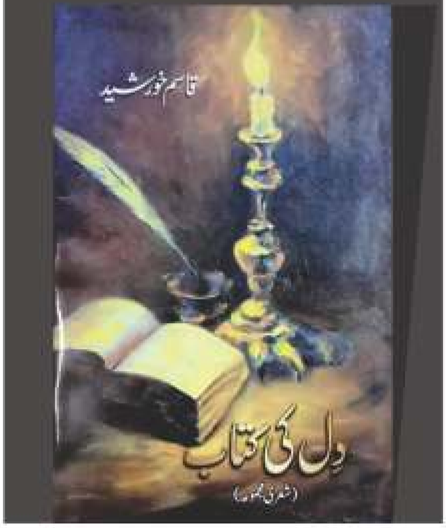

ہو یا ساہتیہ اکادمی کا کوئی پروگرام ہو تو اس کی خبر وہ فیس بک کے ذریعے بھی دیتے اور فون سے بھی باتیں ہوتیں۔میں ان کی کامیابیوں پر مبارکباد دیتا تو وہ بہت خوش ہوتے۔

قاسم خورشید کی شاعری میں زندگی کا پورا منظرنامہ موجود تھا۔اُن کے اشعار میں محبت کی لطافت بھی تھی، کرب ودکھ کی گہرائیاں بھی، اور امید کی کرنیں بھی۔وہ لفظوں کے ایسے معمار تھے جو جذبات کی نازک تراش خراش سے پیکر عطا کرتے تھے۔اُن کی غزلوں میں روایت کی خوشبو اور جدیدیت کی تازگی ایک ساتھ ملتی ہے۔قاری اُن کے کلام میں اپنی روح کی آواز سنتا ہے اور دل کے زخموں پر مرہم پاتا ہے۔ان کے شعری مجموعوں کے نام ہیں ’تھکن بولتی ہے‘ اور ’دل کی کتاب‘۔

افسانے قاسم خورشید کی تخلیقی قوت کا دوسرا پہلو ہیں۔اُن کے افسانوں میں زندگی کے تلخ حقائق اور انسانی جذبات کی پیچیدگیاں بڑی سچائی کے ساتھ ابھرتی ہیں۔وہ کرداروں میں جان ڈالنے کا ہنر جانتے تھے۔اُن کے افسانے قاری کو جھنجھوڑتے بھی تھے، مسکراتے بھی تھے اور سوچنے پر مجبور بھی کرتے تھے۔اُن کی کہانیوں میں وقت کے دھارے کے ساتھ بہتی ہوئی زندگی کا عکس ملتا ہے۔ان کے افسانوں کے مجموعوں کے نام ہیں ’پوسٹر‘، ’ریت پر ٹھہری ہوئی شام‘ اور ’کینوس پر چہرے‘۔

قاسم خورشید محض شاعر اور افسانہ نگار نہیں تھے بلکہ ایک مکمل ادیب تھے۔اُن کی تحریروں میں مطالعے کی وسعت، زبان کی شستگی اور فکر کی گہرائی صاف جھلکتی تھی۔وہ نئی نسل کے ادیبوں کے لیے ایک رہنما تھے۔اپنی محفلوں میں ہمیشہ ادب کی ترویج وترقی کی بات کرتے اور نوجوانوں کو لکھنے پر اُکسایا کرتے۔اُن کا ماننا تھا کہ ادب صرف دل بہلانے کا ذریعہ نہیں بلکہ سماج کی اصلاح کا ہتھیار ہے۔

قاسم خورشید کا رخصت ہوجانا اردو ادب کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ان کی جدائی سے ایسا خلا پیدا ہوا ہے جو برسوں میں بھی پر نہ ہو سکے گا۔ان کے جانے کے بعد نہ صرف محفلیں سنسان ہوگئیں بلکہ دلوں پر ایک گہرا بوجھ بھی آگیا۔یہ صدمہ اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتا ہے جب ہم سوچتے ہیں کہ ان کے پاس ابھی کہنے کو بہت کچھ تھا، لکھنے کو بہت کچھ تھا، اور دینے کو بہت کچھ تھا۔

ہم سب کے دل اس وقت غم سے بوجھل ہیں، لیکن یقین رکھتے ہیں کہ قاسم خورشید کی تحریریں ان کا زندہ ویادگار سرمایہ ہیں۔وہ دنیا سے رخصت ہوگئے مگر اُن کے لفظ، اُن کے افسانے، ان کی غزلیں اور اُن کی سوچ ہمیشہ زندہ رہیں گی۔اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، انھیں اپنے جوارِ رحمت میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور اُن کے اہلِ خانہ کو صبر وحوصلہ دے۔

■

Sadre Alam Gauher
At+Po-Pursaulia
Distt- Madhubani- 847226 (Bihar)
Mob.:7715980144
Email: gauhersadre@gmail.com

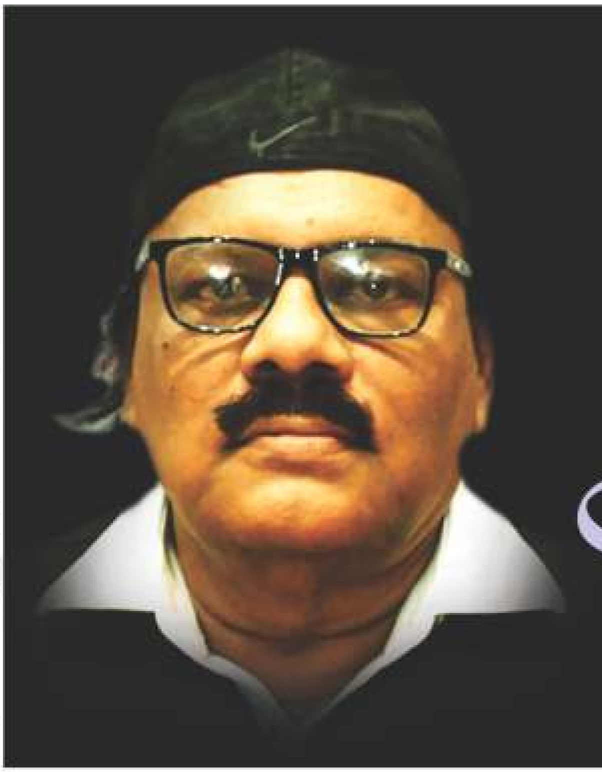

عشرت صبوحی

آسمانِ ادب کا نیر تاباں
قاسم خورشید

ادب کے آسمان پر کبھی کبھی ایسے نام جگمگاتے ہیں جنھیں وقت کے غبار میں چھپانا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ وہ آفتاب ہیں جو اپنی زندگی میں بھی روشنی بانٹتے ہیں اور بعد از مرگ بھی ان کی روشنی ماند نہیں پڑتی۔ قاسم خورشید آسمانِ ادب کے ایسے ہی نیر تاباں تھے۔ ان کا تاریخی نام سید محمد قاسم خورشید اور گھریلو نام جعفر تھا۔ والد کا نام سید غلام ربانی عرف خورشید سبحانی اور دادا کا سید غلام محمد عمر تھا۔ تعلیمی سند کے اعتبار سے ان کی پیدائش 2 جولائی 1960 کو ضلع جہان آباد بہار کے ایک علمی قصبہ کاکو میں ہوئی تھی۔ 1975 میں انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اورینٹل کالج پٹنہ سٹی سے انٹرمیڈیٹ، پٹنہ کالج سے گریجویشن اور پٹنہ یونیورسٹی سے اردو مضمون میں ایم اے اور 'گئودان کا تنقیدی و تقابلی مطالعہ' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری (1983) حاصل کی۔ اس کے بعد ٹیلی وژن پروگرام پروڈکشن، تکنیکی آپریشن، اسکرپٹنگ کورس وغیرہ کی تربیت اے اے آئی ڈی ISRO احمد آباد اور سی آئی ای ٹی نئی دہلی سے حاصل کی۔ ملازمت کی ابتدا آل انڈیا ریڈیو پٹنہ میں عارضی اناؤنسر کی حیثیت سے کی۔ وہیں شاہدہ وارثی سے ملاقات ہوئی اور 1988 میں وہ ان کی شریک حیات بن گئیں۔ جلد ہی باضابطہ سرکاری ملازمت مل گئی جہاں ترقی کرتے ہوئے وہ ایس سی ای آر ٹی میں صدر شعبۂ السنہ کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ وہ اس درمیان ایجوکیشنل ٹیلی وژن میں پروڈیوسر بھی رہے، اور پروڈیوسر رہتے ہوئے انھوں نے کئی معیاری ڈرامے لکھے اور پروڈکشن انچارج کی حیثیت سے ایجوکیشنل فلمیں اور ڈرامے بھی بنائے۔ انھوں نے پہلی ٹیلی فلم 'پیڑ ہمارے ساتھی' بنائی جو دہلی دوردرشن سے نشر ہوئی۔ اس کے بعد کم از کم پانچ سو فلمیں انھوں نے تیار کیں جن کو ملک اور بیرون ملک کے فلم فیسٹیول میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایک مصنف اور ہدایت کار کی حیثیت سے انھیں جاپان فلم فیسٹیول اور نیشنل فلم فیسٹیول میں انعامات سے بھی نوازا گیا۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی کافی فیچر فلمیں تیار کیں۔ انھوں نے ایس سی ای آر ٹی میں بھی کئی معیاری درسی کتابوں کی ترتیب میں اہم کردار ادا کیا۔

قاسم خورشید کا تعلق سادات کے ایک زمیندار گھرانے سے تھا مگر یہ زمینداری ان کے دادا کے وقت میں ہی ختم ہو گئی تھی۔ سفید پوشی پھر بھی قائم رہی مگر والد کی اچانک وفات نے سارا نظام زندگی درہم برہم کر دیا۔ ماں کی گود ہی وہ واحد سائبان تھی جس کے سائے میں تین معصوم بچوں نے زندگی کے طوفان جھیلے۔ قاسم خورشید کے دو بھائی اس وقت ڈھائی سال اور چھ ماہ کے تھے۔ اس کمسنی میں یتیمی کا بوجھ اور بیوگی کا زخم ماں کے دل پر ثبت ہوا تو اس نے صبر و تحمل کو اپنی ڈھال بنا لیا۔ یہی ماں اپنے بچوں کے لیے امید کی آخری کرن بن گئی۔ دادا کے دور تک زمینداری کا جو ڈھانچہ کھڑا تھا اب کھوکھلا ہو چکا تھا۔ عزت و شہرت کے سہارے سفید پوشی کا بھرم باقی رکھنے کی کوشش کی گئی لیکن آنگن سے کبوتروں کی ہجرت نے اس بھرم کو بھی توڑ ڈالا۔ ایسے ماحول میں زندگی نے انھیں پٹنہ پہنچا دیا۔ صرف سات برس کی عمر میں خالہ زاد ماموں مظفر الجاوید کے زیر سایہ وہ پٹنہ کے تعلیمی و ادبی ماحول میں داخل ہوئے۔ مگر یہ داخلہ آسان نہ تھا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ روزگار کی جستجو نے بچپن کو بہت جلد جوانی کے راستے پر ڈال دیا۔ رام موہن رائے سیمینری اسکول کی تعلیم کے دوران وہ گورنمنٹ اردو لائبریری میں اکثر بیٹھا کرتے۔ لائبریری کے ملازم حسن احمد نے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے اور مطالعۂ کتب کا ماحول فراہم کیا۔ یہی کتابیں آگے چل کر ان کی روح کی غذا بنیں۔ کبھی ہاف پینٹ میں ٹیوشن پڑھانے جانا اور ہم عمر لڑکیوں کی ہنسی کا سامنا کرنا، کبھی پرل موٹرز میں کام کرنا اور کبھی بس کے اسٹیل پرزوں کو پالش کرنا، یہ سب تجربے ان کی شخصیت کو صیقل کرتے گئے۔ جد و جہد ان کا دوسرا نام بن گئی۔ ماں کی دعاؤں اور ماموں کی حوصلہ افزائی نے انھیں زندگی کی ہر دشواری میں سہارا دیا جس کا اعتراف وہ زندگی بھر برملا کرتے رہے۔

قاسم خورشید کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ شاعری کی دنیا میں قدم تو طالب علمی کے زمانے میں ہی رکھا تھا۔ پہلا شعلہ دو غزلوں کی صورت میں ہندی کے مشہور رسالے 'پرگتی شیل سماج' میں بھڑکا۔ پھر کہانیاں، ڈرامے اور مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ 1977 میں ان کا پہلا افسانہ 'روک دو' زبان و ادب پٹنہ میں شائع ہوا اور رفتہ رفتہ ان کے تقریباً پچاس افسانے مختلف معیاری پرچوں میں چھپتے گئے۔ افسانے کے ساتھ ڈراما نگاری میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھے۔

انھوں نے پہلی بار بہار میں اردو اسٹیج کو پریم چند کے ڈرامے 'جیل' کے ذریعے متعارف کرایا۔ پھر 'ایک اور ہندوستان'، 'چوہے'، 'بچوں کی عدالت'، 'عید گا عید گاہ'، 'انگولا کی آواز' اور 'کہرا' جیسے ڈرامے اسٹیج کیے گئے اور مقبول ہوئے۔ اپٹا (IPTA) اور دیگر تنظیموں کے ساتھ مل کر انھوں نے نہ صرف بہار بلکہ ملک کے مختلف گوشوں میں اردو ڈرامے کی آبیاری کی۔ انھوں نے اردو ہندی کے بعض مشہور افسانوں کو ڈراموں کی شکل میں اسٹیج سے پیش کیا۔ ساتھ ہی ریڈیائی ڈرامے بھی تحریر کیے۔ انھوں نے ریڈیو اور ٹی وی کے لیے فیچرز بھی لکھے جو بے حد مقبول ہوئے۔ ان سب کے ساتھ مشق سخن بھی جاری رہی اور مشاعروں کے علاوہ ریڈیو یا ٹی وی کے وسیلے سے ان کا کلام بھی سامنے آتا رہا۔ انھوں نے اردو کے ساتھ ہندی زبان کی طرف بھی توجہ دی اور ان کی کہانیاں اور غزلیں معیاری ہندی رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ ان کی شعری و نثری تصانیف کی تعداد نصف درجن سے زائد ہے۔ افسانوی مجموعے 'پوسٹر' (1994) ریت پر ٹھہری ہوئی شام (2010) کینوس پر چہرے (2010)، شعری مجموعے 'تھکن بولتی ہے' (ہندی)، 'دل تو ہے بنجارہ'، 'دل کی کتاب'، سنولائی دھوپ (کیف عظیم آبادی کی غزلوں کی ترتیب) ٹوٹے ہوئے چہرے (مزاحیہ شاعری کی ترتیب) 'گئودان کی تنقید' (تنقید و تحقیق) متن اور مکالمہ (تنقیدی مضامین) 'تماشہ' (ڈراموں کا مجموعہ) 'قانون ساز کاؤنسل میں اقلیت' (سیاسی تجزیہ) کے علاوہ ان کی ہندی کہانیوں کے بھی کئی مجموعے منظر عام پر آئے جب کہ کئی کتابیں منتظر اشاعت رہ گئیں۔ ان کے ایک افسانوی مجموعے کا انگریزی ترجمہ بھی WAVES کے عنوان سے شائع ہوا۔

قاسم خورشید نے شاعری کی، فیچرز اور ڈرامے لکھے مگر بنیادی طور پر وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے ہی پہچانے گئے۔ ان کے ابتدائی افسانوں پر ترقی پسند نقطۂ نظر کا عکس واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے دبے کچلے، استحصال کے شکار، مجبور اور بے بس انسانوں کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ حربہ، پوسٹر، پتھر، سائمن بوسکی، اندر آگ ہے، باگھ دادا، کشن پور کی مسجد، کئی کا راجکمار اور ٹوٹے ہوئے چہرے، ان کی نمائندہ کہانیاں قرار دی جاسکتی ہیں۔ ان کہانیوں میں انھوں نے سماج کی جڑوں میں پوشیدہ برائیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلوب بیان اور فنی نقطہ نظر سے بھی یہ کہانیاں اچھی ہیں۔

"قاسم خورشید نے شاعری کی، فیچرز اور ڈرامے لکھے مگر بنیادی طور پر وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے ہی پہچانے گئے۔ ان کے ابتدائی افسانوں پر ترقی پسند نقطۂ نظر کا عکس واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے دبے کچلے، استحصال کے شکار، مجبور اور بے بس انسانوں کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔"

قاسم خورشید پریم چند، میکسم گورکی اور نیکولائی استراوسکی سے بہت متاثر تھے۔ وہ پریم چند کی حقیقت نگاری کے دلدادہ تھے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں حقیقت نگاری پر خاص توجہ دی ہے۔ ان کا اپنی کہانیوں کے سلسلے میں کہنا تھا کہ '' میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میری کہانیوں سے گزرتے ہوئے کوئی بھی حساس قاری اپنے احتساب کے دوران مجھے بھی ہمسفر بنانے کا شرف عطا کرے گا''۔ کہانی 'باگھ دادا' ان کی آپ بیتی ہے۔ اس کہانی میں انھوں نے اپنے خاندان کی مفلسی اور محرومی کو اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری کو وہ اپنی داستان محسوس ہونے لگتی ہے۔ ان کی مقبول ترین کہانی باگھ دادا کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اس رات سبھی سو چکے تھے۔ میں نے دھیرے سے دروازہ کھولا۔ زوروں کی بھوک لگی تھی۔ باگھ دادا کے مقبرے پر گیا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ میں نے سرہانے ٹٹولنے کی کوشش کی۔ کچھ بھی نہیں ملا۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ دیر تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ میرے دل نے اس وقت باگھ دادا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا: آپ باگھ دادا ہیں۔ آپ نے آدم خور کو مار ڈالا تھا۔ بھوک ہمیں مار رہی ہے۔ کیا آپ اسے نہیں مار سکتے۔''

قاسم خورشید افسانہ نگار کے ساتھ ایک شاعر کی حیثیت سے بھی ادب کے آسمان پر روشن ہوئے۔ ہندی میں ایک اور اردو میں ان کے دو شعری مجموعے منظر عام پر آئے اور مقبول ہوئے۔ ان کی شاعری میں زندگی کا دکھ، خوابوں کی ٹوٹ پھوٹ، اور امید کی جھلک ایک ساتھ ملتی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ روشنی عارضی ہے، مگر جب تک چراغ جل رہا ہے، اندھیرا پوری طرح حاوی نہیں ہو سکتا۔ قاسم خورشید نے اپنا تخلیقی سفر شاعری سے ہی شروع کیا تھا۔ تب وہ 'جعفر' یا 'کیو کے جعفر' کے نام سے شاعری کرتے تھے۔ جعفر سے ان کے قاسم خورشید بننے کا قصہ بہت طوالانی ہے۔ آیئے پہلے شاعر جعفر کے کچھ اشعار سے محظوظ ہوں۔

پھولوں کی خامشی سے ظاہر یہ ہو رہا ہے
کہ اس چمن کا مالی پھر خار بو رہا ہے
یہ تنکا زمیں پر سے اٹھ جائے گا
کہ چڑیا کہیں گھر بسانے کو ہے
آواز دے رہا ہے پورب سے پھر سویرا
اپنا شریر سورج دریا میں دھو رہا ہے

شاعر کے ان ابتدائی اشعار سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے شعری سفر میں اچھی اور بڑی شاعری کے روشن امکانات موجود ہیں۔ چنانچہ قاسم خورشید نے بعد میں مشاعروں اور ادبی محفلوں میں اردو کے نامور شعرا کے ساتھ کلام پیش کر کے اس کا ثبوت بھی دیا کہ ان کی شاعری نظر انداز کی جانے والی نہیں ہے۔ ان کے کچھ مقبول اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

مجھے پھولوں سے بادل سے ہوا سے چوٹ لگتی ہے
عجب عالم ہے اس دل کا، وفا سے چوٹ لگتی ہے
عشق میں اتنے تماشے ہیں کہ اے جان جگر
زندہ رہتے ہوئے مر کر نہیں دیکھا جاتا
خوشبوئیں دور سے احساس کرا دیتی ہیں
ہر کسی پھول کو چھو کر نہیں دیکھا جاتا
نیند سے ترک تعلق جو ہوا تیرے بعد
دن گزرتا ہے مگر رات کہاں ہوتی ہے
میں خوش ہوا تو آنکھ سے آنسو نکل پڑے
میری خوشی میں درد کا حصہ ضرور ہے

انھوں نے مختصر بحروں میں بھی بعض خوبصورت غزلیں کہیں۔ جیسے یہ اشعار دیکھیے۔

رشتوں کا بازار ملے گا
جو چاہو کردار ملے گا
سکھ میں تیرے ساتھ رہیں گے
اور دکھ میں بیزار ملے گا
دل کی جب نادانی لکھنا
پیار، محبت، پانی لکھنا
بزم سے ان کی واپس آکر
دریا، آنکھ، روانی لکھنا
روایت سے بغاوت کر رہا ہوں
رئیسوں پر حکومت کر رہا ہوں
اندھیرے چار سو بکھرے ہوئے ہیں
میں جگنو کی حفاظت کر رہا ہوں

شاعری اگر اچھی ہو اور دل کے سچے جذبات پر مبنی ہو تو پڑھنے اور سننے میں اچھی لگتی ہے۔ دونوں حالت میں دل متاثر ہوتا ہے، برخلاف اس کے اگر شاعری میں دل کی صدا سنائی نہ دے، روح کی پکار نہ ہو تو ایسی شاعری کی حیثیت صحرا میں اذان جیسی ہوتی ہے۔ اچھی شاعری اپنے دور اور عہد کی تاریخ ہوتی ہے، جسے وقت بار بار یاد دلاتا اور دہراتا رہتا ہے۔ اچھی شاعری رطب و یابس، یاوہ گوئی اور اشعار کے ڈھیر لگانے کا نام نہیں ہے بلکہ قطرہ کو سمندر بنانے کا فن ہے۔ قاسم خورشید کے پاس یہ فن تھا اس لیے ان کی شاعری دل ودماغ کو متاثر کرتی ہے اور رطب ویابس سے کم واسطہ پڑتا ہے۔ وہ احمد فراز، ندا فاضلی اور شہریار جیسے شعرا سے متاثر تھے اس لیے ان کی شاعری میں موضوعات کے ساتھ اظہار کی دلکشی بھی ہے۔ وہ عام اور پرانے موضوع کو بھی نئے انداز میں کہنے کا ہنر جانتے ہیں، جنھیں پڑھ کر احمد فراز اور ندا فاضلی کی یاد آجاتی ہے۔

ہمارے ذکر سے دل کی کتاب روشن ہے
ہمارے ذکر کا ہر اقتباس رہنے دو
میں سوچتا ہوں تصور میں ماہتاب رہے
میں سوچتا ہوں کہ دل کی کوئی کتاب رہے
میں سوچتا ہوں وہ شعلہ بدن بلائے مجھے
میں سوچتا ہوں کہ ہاتھوں میں اک گلاب رہے
میں سوچتا ہوں کہ آنکھیں غزال ہوں اس کی
میں سوچتا ہوں کہ کہ جنت میں وہ شراب رہے

جہاں تک مشاعروں کا معاملہ ہے تو کئی آل انڈیا اور بین الاقوامی مشاعروں میں انھوں نے تخلیق کار کے ساتھ ایک ناظم کی حیثیت سے بھی کامیابی حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مشاعرے میں احمد فراز، شہریار، بیکل اتساہی، مخمور سعیدی اور دنیا کے دوسرے اور کئی بڑے شعرا موجود تھے، اس مشاعرے کی نظامت ملک زادہ منظور احمد نے کی تھی۔ مسئلہ تھا کہ کس شاعر کے ذریعہ مشاعرے کی شروعات کی جائے، اس میں قاسم خورشید بھی بحیثیت شاعر مدعو تھے۔ چنانچہ ان سے ہی مشاعرے کا آغاز کیا گیا اور انھیں بے پناہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ پھر وہ قومی و عالمی سطح کے مشاعروں میں مسلسل اپنا تخلیقی جوہر دکھاتے رہے۔

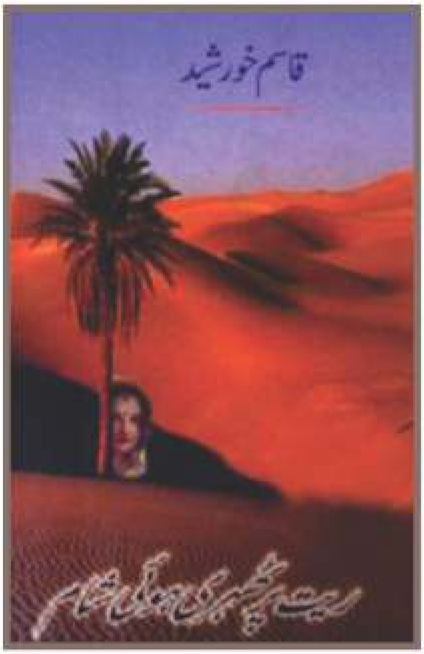

اسی طرح قاسم خورشید اپنے انتہائی مؤثر لہجے، خوبصورت آواز، اور جادو بیانی کے ذریعے قومی و بین الاقوامی پروگراموں کی کامیاب ترین نظامت سے بھی باذوق سامعین کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ کرتے تھے۔ اس کی ایک اہم وجہ تھی کہ انھوں نے میڈیا سے اپنا کیریر شروع کیا تھا۔ جب پہلی بار آل انڈیا ریڈیو کے اردو پروگرام کے لیے اناؤنسر کا آڈیشن ہوا تو اس میں اپنی آواز سے سب سے زیادہ انھوں نے ہی متاثر کیا اور وہ اول آئے۔ بعد میں ان کی پیش کش کو دیکھ کر آل انڈیا ریڈیو کے جنرل پروگرام میں انھیں موقع دیا گیا اور وہ لگاتار اپنی بہترین خدمات سے متاثر کرتے رہے۔ یہ تجربات ان کی نظامت میں خوب خوب کام آئے۔ ان کا ماننا تھا کہ انھوں نے مشاہیر سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے خصوصی طور پر ملک زادہ منظور احمد ان کے آئیڈیل تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ملک زادہ منظور احمد فن نظامت میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، جو لوگ چاہتے ہیں کہ اس فن کو باریکی سے سمجھیں تو انھیں ملک زادہ منظور احمد کی ریکارڈنگ سن کر بہت کچھ سیکھنا چاہیے۔ قاسم خورشید کو یہ ابھی امتیاز حاصل تھا کہ وہ بیک وقت اردو اور ہندی دونوں اسٹیج پر یکساں مقبول تھے۔ بڑے مشاعرے یا بڑے اسٹیج سے ان کا تعلق اس طور پر بھی رہا کہ IPTA کی بڑی کانفرنسوں میں جہاں ہزاروں کی تعداد میں مجمع ہوا کرتا تھا، قاسم خورشید نے ہمیشہ انھیں خطاب کیا اور مجمع کی توقع کا احترام بھی کیا۔ جب سامعین کی خاصی تعداد ہوا کرتی ہے اور خصوصی طور پر بھیڑ میں کئی مکتبۂ فکر کے لوگ ہوا کرتے ہیں تو اس وقت مجمع کو بہتر ڈھنگ سے سنبھال پانے کی ذمہ داری بھی نقیب پر ہی ہوتی ہے۔ ابھی گذشتہ دنوں شری کرشن میموریل ہال کے جشن اردو کے مشاعرے میں اگلی صف میں کچھ دوستوں میں ہی نااتفاقی ہوگئی۔ ہال میں تھوڑی دیر کے لیے افراتفری کا منظر نظر آیا لوگ ہنگامہ کرنے لگے تو صدر مشاعرہ منور رانا اور سینئر شاعر وسیم بریلوی نے بحیثیت شاعر مدعو ڈاکٹر قاسم خورشید سے گزارش کی کہ وہ مجمع کو خطاب کرتے ہوئے مشاعرے کا ماحول بنائیں۔ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے قاسم خورشید نے جیسے ہی اپنے پروقار اور پراثر لہجے میں خطاب کیا تو پھر سے ماحول بن گیا۔

بھرپور ادبی زندگی جینے والے زندہ دل اور یارباش قاسم خورشید 30 ستمبر 2025 کو صبح نوگھروا سلطان گنج پٹنہ کے اپنے مکان میں حرکت قلب بند ہوجانے کے سبب اچانک ہم سے رخصت ہوگئے۔ دوسرے دن صبح درگاہ شاہ ارزاں کے احاطہ میں ان کی نماز جنازہ مدرسہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل مولانا مشہود احمد قادری نے پڑھائی اور تدفین شاہ گنج قبرستان میں عمل میں آئی اور آسمان ادب کا یہ نیر تاباں ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔

■

Dr.Ishrat Subuhi
Khan Colony, Usman Nagar
Nausha, Phulwari Sharif
Patna- 801505 (Bihar)
Mob: 7091175140
Email: ishu.subuhi@gmail.com

آکاش وانی کا 90 سالہ سفر

اختر آزاد

آکاش وانی سنسکرت کے دولفظوں کا مرکب ہے۔ آکاش + وانی۔ جس کے لغوی معنی 'آسمان سے آنے والی آواز' یا 'الہامی آواز ہے'۔ 'آکاش وانی' لفظ کا پہلی بار استعمال آل انڈیا ریڈیو کے لیے مراٹھی اور انگریزی کے مشہور مصنف پنڈت نرسمہا چنتامن کیلتکر نے کیا تھا جو انڈین نیشنل کانگریس کے فعال رکن، صحافی اور پیشے سے وکیل تھے۔ بعد میں اس سنسکرت اصطلاح کو آل انڈیا ریڈیو کا سرکاری ہندی نام دے دیا گیا۔ جس نے آنے والے دنوں میں تمام ہندوستانیوں کے دلوں پر راج کیا۔

آل انڈیا ریڈیو کی باقاعدہ نشریات 8 جون 1936 کو شروع ہوئی تھی۔ اس کا پہلا نام Indian State Broadcasting Service تھا۔ اس کی پہلی باقاعدہ نشریات 23 جولائی 1927 کو بمبئی ریڈیو اسٹیشن سے ہوئی۔

2025 کے اعداد وشمار کے مطابق اس وقت پورے ہندوستان میں آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن کی تعداد 591 ہے۔ یہ ریڈیو اسٹیشن ملک کی 98 فیصد آبادی تک اپنی رسائی فراہم کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ملک کی 23 زبانوں اور 146 بولیوں میں اپنی نشریات فراہم کرتا ہے۔ اگر ایف ایم نشریات کو شامل کرلیں تو 92 فیصد جغرافیائی حدود کے ساتھ تقریباً 99 فیصد لوگوں تک آکاش وانی اپنی نشری خدمات پیش کرتا ہے۔

جہاں تک آکاش وانی سے نشر ہونے والے اہم پروگراموں کی بات ہے تو کم سے کم سو سے زیادہ پروگرام ایسے ہیں جسے سامعین کا بھرپور پیار ملا، لیکن ان میں سے اگر دس مخصوص پروگرام کی بات کی جائے جس نے برسوں اپنے سننے والوں کے دلوں میں راج کیا تو ان پروگراموں کی ترتیب ہمیں کچھ اس طرح بنتی دکھائی دے رہی ہے۔

1 بناکا گیت مالا: پروگرام جسے امین سیانی کی مخصوص آواز میں (بھائیو اور بہنو!... میں آپ کا دوست امین سیانی) رکارڈ ہونے والا ہر دلعزیز پروگرام 3 دسمبر 1952 کو شروع ہوا۔ ہر بدھ کی شام نغمہ پریمیوں کو اس کا بے صبری سے انتظار رہتا تھا۔ یہ ریڈیو cylon broadcasting corporation سے نشر ہوتا تھا۔ اس کے بند ہونے کے بعد اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اسے آل انڈیا ریڈیو پر Vividh bharti Service کے تحت 1988 سے نشر کیا جانے لگا تھا۔ پہلے اسے 'بناکا' کہا جاتا تھا لیکن ہندوستان میں اسپانسر چینج ہونے کی وجہ سے اس کا نام 'بناکا' سے 'سیبا کا' ہوگیا۔ قریب 42 سال تک یہ پروگرام چلتا رہا۔ اس کی آخری قسط 4 اپریل 1994 کو نشر ہوئی تھی۔

2 یووانی.....: اس کا آغاز 1969 میں ہوا۔ اس پروگرام میں نوجوان نسل کی ذہنی تربیت کو سامنے رکھ کر ان کے لیے مباحثے، ڈرامے، مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اہم شخصیات کے ان انٹرویوز کو نشر کیا گیا جنھیں سن کر نئی نسل اپنے مستقبل کو سجا سنوار سکے۔ یہ پروگرام قریب 35 برسوں تک نوجوان دلوں کی دھڑکن بنا رہا۔ 1 جون 2024 کو چند وجوہات کی بنیاد پر اس پروگرام کو بند کردیا۔

3 ہوا محل: اس کا آغاز 1956 میں ہوا۔ یہ پروگرام ہندوستان کی مختلف زبانوں میں لکھی گئی کلاسیکل کہانیوں اور ڈراموں پر مبنی ہوا کرتا تھا۔ ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کو نہایت ہی ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا۔ جو رات میں 9 سے 9:20 تک ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور فنون لطیفہ سے جڑے فنکاروں کے دلوں میں سانس بن کر دھڑکتا تھا۔ اس پروگرام نے خاص و عام کے دلوں میں اپنی مقبولیت کے جھنڈے گاڑے تھے۔

4 چھایا گیت: اس کی شروعات 1956 میں ہوئی۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد پروگرام تھا جس میں فرمائشی نغمے پیش کیے جاتے تھے۔ موسیقی کے دلدادہ پوسٹ کارڈ میں اپنے پسندیدہ نغمے اور فلموں کے نام لکھ کر بھیجتے تھے اور اناؤنسر میٹھی میٹھی جادو بھری باتوں کے درمیان جب فرمائش کرنے والے کا نام اور اس کے شہر کا نام لیتا تھا تو فرمائش کرنے والے کے ساتھ ساتھ ان کے عزیز واقارب اور دوست احباب جھوم اٹھتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے انھیں قارون کا کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ مہینوں اس کا ذکر چلتا رہتا تھا۔

5 کرشی درشن: اس پروگرام کا آغاز پہلی بار آل انڈیا ریڈیو پر 1966 کو ہوا تھا۔ باقاعدہ اس پروگرام کی شروعات 26 جنوری 1967 سے ہوئی۔ اس میں کسانوں کو زرعی معلومات، نئی تکنیکوں کی جانکاری، کس موسم میں کون کون سی فصل لگائی جاسکتی ہے اور کم محنت میں کس طرح زیادہ سے زیادہ فصلیں اگائی جاسکتی ہیں، اس سے متعلق معلومات زراعت سے جڑے لوگ فراہم کیا کرتے تھے جس کے سبب ہندوستان میں زراعت کا گراف دھیرے دھیرے اپنی اونچائیوں کو پہنچا۔ گرین ریولیشن کا آغاز ہوا۔ غذائی امپورٹ میں کمی آئی اور ایکسپورٹ بڑھا۔

6 ریڈیو نیوز سماچار: اس کی باقاعدہ شروعات 1936 میں ہوئی تھی۔ جس میں بین الاقوامی خبریں، اس کے تجزیے اور ساتھ ہی ساتھ فیچرس پیش کیے جاتے تھے۔ ان دنوں جب بھی حادثات و واقعات پیش آتے تو اس کی جانکاری پورے ہندوستان میں اس پلیٹ فارم سے لوگوں تک پہنچائی جاتی تھی۔ یعنی خبر رسانی کی دنیا میں آکاش وانی سب سے بڑا رول ادا کیا کرتا تھا۔

7 وودھ بھارتی سروس: اس کی شروعات 3 اکتوبر 1957 کو ہوئی تھی۔ جس میں خصوصیت کے ساتھ فلمی نغمے، ڈرامے، مشاعرے، انٹرویوز، خصوصی فیچرس پیش کیے جاتے تھے، لیکن اس پروگرام کی انفرادیت اس بات سے تھی کہ ہمارے وہ فوجی بھائی جو اپنے خاندان کو چھوڑ کر سرحد پر تعینات تھے ان کی دلبستگی کا سامان بھی وودھ بھارتی کے پروگرام میں شامل تھا۔ فوجیوں کے درمیان یہ بے حد مشہور تھا اور ہر پوسٹ پر ہمارے فوجی بھائی اس پروگرام کو سننے کے لیے بے تاب دکھائی دیتے تھے۔

8 بھولے بسرے گیت: اس پروگرام کا آغاز 1960 میں ہوا وہ آج کی طرح ٹی وی، موبائل کا زمانہ نہیں تھا کہ جب چاہیں پرانے گانوں کو سن لیں۔ سننے کے لیے اس وقت ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ تھا ریڈیو۔ اسی مقصد کے تحت ویسے نغمے جو لوگوں کے ذہن سے محو ہوتے جارہے تھے انہی بھولے بسرے گیتوں کو لوگوں تک پہنچا کر ماضی سے حال کا رشتہ استوار کرنے کا مقصد یہ پروگرام اپنے پہلو میں رکھتا تھا۔ بزرگوں کے درمیان یہ پروگرام بے حد مقبول تھا۔

9 بال منڈل اور بال سبھا: جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ یہ پروگرام بچوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس کا آغاز 1940 میں ہوا۔ جن میں کہانیاں، نظمیں، ڈرامے، سوال وجواب اور تعلیمی معلومات سے متعلق کئی دیگر پروگرام ایسے تھے جو خاص کر کم عمر طلبا کی ذہنی تربیت کو سامنے رکھ کر نشر کیے جاتے تھے تاکہ ہمارے بچے اسے سنیں۔ اس سے وقتی طور پر لطف اندوز ہوں اور آنے والے دنوں میں اس کے اثرات کچھ ایسے مرتب ہوں کہ وہ بہتر انسان بن سکیں۔ قوم وملت کی خدمت کر سکیں۔ ملک کا بوجھ اپنے کاندھے پر اٹھاسکیں۔

10 اردو سروس: آل انڈیا ریڈیو کی نشریات جب شروع ہوئی تو اس وقت پورے برصغیر میں اردو رابطے کی ایک زبان تھی۔ ہندوستان میں

سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان اردو ہی تھی۔ اردو کی مقبولیت بلا مذہب وتفریق سب کے سر چڑھ کر بول رہی تھی۔ ایسے میں الگ سے آل انڈیا ریڈیو نے 'اردو سروس' کے نام سے ایک نشریاتی شاخ قائم کی۔ 1939 میں نئی دہلی ریڈیو اسٹیشن سے پہلی اردو سروس کے تحت ادبی پروگرام کا آغاز ہوا۔ جن میں مشاعرے، افسانے، ڈرامے، خبریں اور تبصرے شامل تھے۔ فلمی اور غیر فلمی نغموں کے ساتھ خصوصی طور پر غزلیں بھی پیش کی جاتی تھیں۔ اس پروگرام نے نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر پاکستان اور خلیجی ممالک میں بھی اردو کے پرچم لہرائے اور اردو سے عشق کرنے والے پیدا کئے۔

آکاش وانی کے دس اہم پروگرام کی تفصیلات کے بعد کچھ اور دوسرے اہم پروگرام کی طرف آپ کو لے کر چلتے ہیں۔ دراصل ریڈیو گاؤں والوں کے لیے ہمیشہ سے لائف لائن رہا ہے۔ جن میں گرام جگت کھیتی گرہستی، چوپال، کسان وانی، گرام سبھا جیسے پروگراموں نے کسانوں کی قسمت کو بدلنے میں اپنا اہم رول نبھایا ہے۔ ناٹیہ منجری، سنگیت سریتا، راشٹریہ کاریہ کرم جیسے پروگراموں کے ذریعہ خاص موضوع پر ڈاکومینٹریز اور ڈرامے پیش کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ موسیقی، فلم اور آرٹ سے تعلق رکھنے والے کلاسیکل آرٹسٹوں کے انٹرویوز اور ان کی زندگی سے جڑے اہم قصوں کے ذریعہ دراصل نئی نسل کی رہبری کی جاتی رہی ہے۔ آرٹ اینڈ کلچر کو بڑھاوا دیا جاتا رہا ہے۔ فیملی ویلفیئر پروگرام اور صحت عامہ سے جڑے مسائل پر سواستھیہ رکچھک، پریوار کلیان، سواستھیہ سندیش پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ انسانی حقوق اور اس کے تحفظ کی خاطر 'قانون کی بات' جاگرکتا پروگرام نشر کیا جاتا رہا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو ایسا نشری ادارہ ہے جو سرکاری منصوبوں کو عوام تک آسان زبان میں پہنچانے کا کام کرتا ہے تاکہ اسے سرکاری منصوبوں کا فائدہ ہو سکے۔ اس جن کلیان وارتا کے تحت' صحت بیمہ، پریوار کلیان، ٹیکا کرن منصوبوں کو سمجھایا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ منریگا، پردھان منتر آواس یوجنا، اجولا یوجنا پر گفتگو بھی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سرکاری منصوبوں کو کارآمد بنانے کے لیے ریڈیو ڈرامے اور فیچر بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ جس میں 'نیا سویرا' کے تحت 'بیٹی بچاؤ، بیٹی پڑھاؤ مہم پر ناٹک۔ سوچھ بھارت ...ہماری ذمہ داری کے تحت صفائی مہم پر فیچر پیش کیے جاتے ہیں۔ گیت اور جنگل کے تحت فیملی پلاننگ پر نعرہ ''جیسے ہم دو ہمارے دو۔'' پولیو کے لیے 'دو بوند زندگی کے' اور دوسرے کئی سرکاری منصوبے جیسے، کسان کریڈٹ کارڈ، ایجوکیشنل کریڈٹ کارڈ، بھارت کی بات، جن سیوا، آؤ سمجھائیں یوجنا وغیرہ آکاش وانی پر پیش کیے جاتے ہیں۔ آکاش وانی

نے گاندھی جی سے جڑے بے شمار پروگرام پیش کیے ہیں۔ گاندھی جی کی زندگی اور ان کی ہمہ جہت شخصیت کے ہفت رنگ پہلوؤں کو دکھانے کے لیے ریڈیو پر 'گاندھی درشن، گاندھی کے وچار، ستیہ اور اہنسا، گرام سوراجیہ، دانڈی یاترا، بھارت چھوڑو آندولن، ستیہ گرہ جیسے موضوع پر بے شمار مذاکرے، ناٹک اور فیچر بھی پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے اصولوں کی روشنی میں بحث ومباحثہ بھی کرائے گئے۔ 3اکتوبر 2014 سے ہمارے وزیر اعظم جناب نریندر مودی صاحب کی زبانی 'من کی بات' پروگرام دوردرشن کے ساتھ ساتھ آکاش وانی پر بھی ہر ماہ کے آخری اتوار کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے عوام کو بیدار کرنے، ان کی حوصلہ افزائی کرنے

اور ان کی کارگزاریوں کو سامنے لایا جاتا۔ ڈیزاسٹر اور قدرتی آفات جیسے سیلاب، زلزلہ، سائیکلون، سونامی، وبائی امراض کے دوران آکاش وانی فوری طور پر خبریں نشر کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے تدارک اور روک تھام کے لیے سرکاری اعلان کو ریڈیو کے ذریعہ گھر گھر پہنچانے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ ہیلپ لائن نمبر جاری کرتا ہے، افواہوں سے بچنے اور فوری طور پر امدادی اشیا کی فراہمی کی خبریں نشر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ سرکاری اور این جی اوز کے منصوبوں کو لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ مثال کے طور پر 1999 کے اوڈیشہ سائیکلون اور 2004 کے سونامی میں آکاش وانی نے راحت بچاؤ سے منسلک خبریں عام لوگوں تک پہنچائیں اور لاکھوں لوگوں کی جانیں بچانے میں اپنا ایک اہم کردار ادا کیا۔

آکاش وانی نے کھیلوں کو لے کر بھی دیہی اور شہری عوام میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، کشتی، ایتھلیٹکس کے نیشنل اور انٹرنیشنل پروگرام یہاں تک کے اولمپکس، ایشین گیمز اور دیگر بڑے ٹورنامنٹ اور ورلڈ کپ کی کمنٹری سنانے کا لائیو اہتمام برسوں سے آکاش وانی کرتا ہے۔ تعلیمی بیداری مہم کے تحت بھی آکاش وانی ایجوکیشن بیسڈ پروگرام نشر کرتا ہے جس کا مقصد بچوں کی بنیادی تعلیم، اساتذہ اور طلبہ کی رہنمائی، سماجی و ثقافتی تعلیم، زبان وادب کی ترویج شامل ہیں۔ قومی یکجہتی کے فروغ میں بلا تفریق اور بلا امتیاز مذہب، ذات اور علاقہ کی مختلف زبانوں کے پروگرام، قومی تہواروں کا کوریج، موسیقی اور فنون لطیفہ کی نشریات میں آکاش وانی کا رول بہت اہم رہا ہے۔ قومی اتحاد کو فروغ دینے اور ایک دوسرے کو قریب لانے، ہندوستانی تہذیب ووراثت کو سنجو کر رکھنے کی ذمہ داری بھی آکاش وانی نے بخوبی نبھائی ہے۔ چاہے وہ ادب وزبان کا فروغ ہو یا پھر کلاسیکل موسیقی اور لوک گیت ہو، یا پھر ہمارے تہوار اور رسومات ہوں یا پھر سماجی وثقافتی بیداری ہو۔ اس طرح کے تمام پروگرام کو ترجیحی بنیاد پر ہمیشہ سے آکاش وانی اپنے یہاں جگہ دیتا رہا ہے۔ آدی واسی سماج کی تہذیب وثقافت کو بڑھاوا دینے کے لئے آکاش وانی نے ہمیشہ نمایاں رول ادا کیا ہے۔ چاہے وہ آدی واسیوں کی شناخت کا مسئلہ ہو، مقامی زبان کے فروغ کا معاملہ ہو، لوک سنگیت اور فنون لطیفہ کو اہمیت دینے کی بات ہو، اس میں کبھی پیچھے نہیں رہا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے جنوری 1936 میں ایک پندرہ روزہ رسالہ اردو اور ہندی زبان میں جاری کیا گیا تھا جس میں آنے والے پندرہ دنوں کی تفصیلات درج ہوتی تھیں۔ یہ بے حد مقبول رسالہ تھا۔ ان تفصیلات کو پڑھ کر لوگ اپنے پسندیدہ پروگرام کے لیے وقت نکالا کرتے تھے۔ جولائی 1938 میں یہ رسالہ دو حصوں میں منقسم ہوگیا۔ ہندی پتریکا کا نام 'سارنگ' پڑا، تو اردو رسالہ کا نام 'آواز' رکھا گیا۔ اس رسالے کا شمار اس وقت اردو کے معیاری رسالوں میں ہوتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اردو کے بڑے بڑے فنکار اپنی کہانیوں کو، اپنی غزلوں کو، اپنے ڈراموں کو، اپنے سماجی، سیاسی اور دیگر شعبہ جات سے جڑے موضوعات پر لکھے مضامین کو آکاش وانی سے نشر کروانا اپنی شان سمجھتے تھے اور ان کی یہی تخلیقات ایک پالیسی کے تحت رسالہ 'آواز' کی زینت بنتی تھیں۔ جو ٹیلی کاسٹ کے وقت کسی وجہ سے سن نہیں پاتے تھے وہ رسالہ آواز کو خرید کر پڑھتے تھے اور بہترین تخلیقات سے محظوظ ہوتے تھے۔

ہندوستانی کرکٹ اور ریڈیو کمنٹری کبھی لازم وملزوم سمجھے جاتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو پر کرکٹ کمنٹری کی باقاعدہ شروعات 1936 میں ہندوستان اور انگلینڈ کے درمیان کلکتہ میں کھیلے جانے والے ٹسٹ میچ سے ہوئی تھی۔ ویسے 1934 میں آزمائشی نشریات کے طور پر بمبئی میں کھیلے گئے ہندوستان اور آسٹریلیا کے درمیان پہلے ہی ہو چکی تھی۔ 1983 میں جب ہندوستان نے ورلڈ کپ جیتا تو آدھی رات کو لوگوں کے کانوں میں آکاش وانی کی صدائیں گونج رہی تھیں۔

اب آکاش وانی کا رینج اور بھی زیادہ بڑھ گیا ہے۔ ایف ایم، سٹیلائٹ، ڈیجیٹل پلیٹ فارم اور آن لائن اسٹریمنگ کے ذریعہ آکاش وانی کو پوری دنیا میں سنا اور پسند کیا جاتا ہے۔ اس کے اندر 140 کروڑ ہندوستانیوں کے جذبات بھی ہیں اور بھارتیوں کی آواز بھی۔

اپنے 90 برس کے شاندار سفر میں آکاش وانی نے کئی اہم پڑاؤ دیکھے ہیں اور ہر پڑاؤ میں اپنے ساتھ بہت ساری یادوں کو سمیٹا ہے۔ آکاش وانی آج صرف ایک ریڈیو اسٹیشن نہیں ہے۔ بلکہ ایک جیتا جاگتا ہندوستان ہے۔ ہندوستانی تہذیب وثقافت، موسیقی، زبان اور ادب کا ایک گہوارہ ہے۔ اس میں ایک سو چالیس کروڑ ہندوستانیوں کی روح بستی ہے..... لیکن سائبر اسپیس اور انٹرنیٹ کے دور میں بقا کی جنگ کا بھی معاملہ ہے۔ جس سے اسے آج لڑنا ہے۔ اپنے مستقبل کو سجانا ہے سنوارنا ہے۔

■

Dr. Akhtar Azad
Assistant Professor, Dept of Urdu,
TNB College
Bhagalpur-812007 (Bihar)
Mo.: 9572683122
dr.akhtarazad@gmail.com

فیصل نذیر

قاضی سجاد حسین اور دیوانِ حافظ کا ترجمہ

جب ہم فارسی ادب، شاعری اور ان کے تراجم کی بات کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمارے ذہن میں جن کتابوں کے نام آتے ہیں ان میں گلستان سعدی، بوستاں سعدی، مثنوی، دیوان حافظ، کریما وغیرہ بہت اہم ہیں اور جب یہ سوچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بھلا ان کا اردو ترجمہ بھی کیا گیا کہ نہیں؟ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام کتابوں کا نہایت ہی سلیس اور عمدہ ترجمہ کسی ایک شخصیت نے کر دیا، اور اس کے بعد آپ مزید دوسرا ترجمہ ڈھونڈتے رہ جائیں مگر تا ہنوز نہیں ملتا۔ اور یہ ترجمے بھی مترجم نے بلا کسی معاوضے اور کسی یونیورسٹی کی فراغ سے پُر زندگی گزارتے ہوئے نہیں بلکہ پرانی دلّی میں ایک دینی مدرسے میں ایک استاد کے طور پر خدمات انجام دیتے ہوئے کیے، تو اس عظیم مترجم کے لیے دل میں احترام بڑھ جاتا ہے۔ وہ شخصیت قاضی سجاد حسین کی ہے جن کی علمی کاوشوں اور علم و ادب کے فروغ میں آپ کی خدمات کو دیکھتے ہوئے صدر جمہوریہ اعزاز و انعام سے نوازا گیا تھا۔

قاضی مولانا سجاد حسین کی جائے پیدائش کرتپور بجنور اور سن پیدائش 3 نومبر 1910 ہے، آپ کے والد حکیم قاضی شمشاد حسین صاحب نے آپ کی تعلیم و تربیت پر مکمل توجہ دی۔ عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم کرتپور میں ہی ہوئی پھر انھیں دارالعلوم دیوبند بھیج دیا گیا، وہاں سے فراغت حاصل کرنے کے بعد مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں بحیثیت استاد درس و تدریس سے وابستہ ہوگئے۔ 1947 میں آپ صدر المدرسین مقرر کئے گئے، آپ ایک باکمال استاد تھے، مگر آپ کی علمی تشنگی روز افزوں تھی، لہٰذا آپ نے اپنا علمی سفر جاری رکھتے ہوئے آلہ آباد بورڈ سے فاضل کا امتحان دیا اور اول آئے، پھر پنجاب یونیورسٹی سے عربی زبان میں بی اے کیا، اس کے علاوہ منشی فاضل و دیگر امتحانات میں بھی کامیاب ہوئے۔ ایک بہترین علمی زندگی گزارنے کے بعد آپ 1990 میں اس دار فانی کوچ کر گئے، انتقال کے وقت آپ کی عمر 80 سال تھی۔

آپ قلم و قرطاس کے شہسوار تھے، آپ نے سبع معلقات کی شرح 'التوشیحات' کے نام سے لکھی، جو بہت مقبول ہوئی۔ آپ نے گلستان، بوستان، اخلاق محسنی کے تراجم بھی کیے۔ بوستاں کا 1955، گلستاں 1960، دیوان حافظ کا 1972 اور مثنوی مولانا روم کا 1976 میں ترجمہ کیا، آپ ہمدرد دواخانہ میں معاون متولی بھی رہے۔ قاضی سجاد حسین کے تراجم بہت پسند کیے گئے، اور انھیں علمی حلقوں میں خوب سراہا گیا، آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو 1966 میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کے ہاتھوں 'سرٹیفکیٹ آف آنرز ان پرشین' دیا گیا۔

آپ کے اہم ترین کارناموں میں حافظ شیرازی کے ضخیم دیوان کا اردو ترجمہ بھی ہے، حافظ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، ان کے اشعار ضرب المثل ہیں، جو قصے کہانیوں اور عبرت کے بطور ہر شخص کی زبان پر ہیں۔ حافظ کا مکمل نام خواجہ شمس الدین محمد حافظ ہے، آپ سن 1325 میں ایران کے مشہور شہر شیراز میں پیدا ہوئے، ابتدائی زندگی غربت میں گذری، آپ ایک بیکری میں کام کرتے تھے۔ بعد کی زندگی میں بھی بہت تکلیفیں اور سختیاں دیکھیں، ایران پر کئی ظالم حکمرانوں کی حکمرانیاں دیکھیں، قتل و غارت گری کا گرم بازار دیکھا۔ حافظ کا انتقال 91-1390 میں ہوا۔

دیوان حافظ سہل؛ ضرب المثل اشعار اور نصیحت آموز قصے کہانیوں سے پر ہے، یہ دیوان اپنے علمی و ادبی معیار میں گلستاں و بوستاں سے کسی طرح فروتر نہیں ہے، مگر بدقسمتی سے درسیات کو اس طرح شامل نہیں کیا گیا جیسا کہ شیخ سعدی کی گلستاں و بوستاں کو اور بعض جگہ مثنوی مولانا روم کو شامل کیا گیا ہے۔

حافظ نے شاعری کے علاوہ تفسیر قرآن بھی تحریر کی تھی۔ محمد گل اندام کے بقول حافظ شیرازی نے 'کشاف' اور 'مصباح' کے حواشی بھی تحریر کیے۔ حافظ کے مندرجہ ذیل اشعار ہم بچپن سے سنتے اور پڑھتے آرہے ہیں:

صلاح کار کجا و من خراب کجا
ببیں تفاوت رہ از کجا تا بہ کجا
ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

فارسی اشعار میں وقفہ، سکتہ اور سوالیہ نشان اور دیگر

علامات کا استعمال بالکل نہیں کیا گیا ہے، مگر ترجمے میں مولانا سجاد حسین نے اس بات کا مکمل اہتمام کیا ہے جو اصل متن سمجھنے میں معاون ہے۔ مثلاً ایک شعر ہے۔

لطف باشد گر نپوشی از گداہا روت را
تا بکام دل ببیند دیدۂ ما روت را

شعر پڑھ کر اولاً مجھے ایسا لگا کہ یہ قرآن کریم میں موجود قصہ ہاروت و ماروت کی بات ہو رہی ہے لیکن جب ترجمہ پر میری نظر پڑی تب پتہ چلا کہ یہ لفظ ہاروت اور ماروت نہیں ہیں۔ شعر کا ترجمہ کچھ اس طرح ہے۔

''مہربانی ہوگی، اگر فقیروں سے تو اپنا چہرہ چھپائے تا کہ ہماری آنکھ، دل بھر کر تیرا چہرہ دیکھ لے''

یعنی اس شعر میں گدا کی جمع 'گداہا' ہے اور 'روت' یہ رو یعنی چہرے کے معنی میں ہے اورت اضافت کی ہے۔

بعض دفعہ اردو ترجمہ تحت اللفظ کرنے کی وجہ سے قدرے ثقیل ہوگیا ہے، جیسے دیوانِ حافظ کا پہلا شعر ہے۔

ألا یا أیها الساقی ادر کاسا وناولها
کہ عشق آساں نمود اول، ولے افتاد مشکلہا

ترجمہ کیا گیا ہے۔

آگاہ! اے ساقی پیالے کا دور چلا اور وہ دے
کیونکہ ابتدا عشق آسان نظر آیا، لیکن مشکلیں آن پڑیں۔

یہاں عربی کے حرف تنبیہ 'ألا' کا ترجمہ بعینہ کرنے کی وجہ سے ترجمے کا حسن قدرے مدھم نظر آتا ہے اور 'وناولها' میں ھا ضمیر کا ترجمہ 'اور وہ دے' قاری کے لیے غموض پیدا کر دیتا ہے۔ اسی غزل کے مقطع میں کہتے ہیں۔

حضوری گرہمی خواہی از و غائب مشو حافظ
متی ما تلق من تهوی دع الدنیا وأمهلها

''اے حافظ تو حضوری چاہتا ہے تو اس سے غائب نہ ہو۔ جب تیری محبوب سے ملاقات ہو تو دنیا کو چھوڑ اور اس کو ترک کر دے۔::

امہلہا لفظ میں ضمیر کا ترجمہ ضمیر سے کر کے یہاں پر بھی انھوں نے غموض پیدا کر دیا اور ترجمہ 'اس کو ترک کر دے' پڑھ کر قاری تھوڑی دیر کے لئے یہ سوچ سکتا ہے کہ دنیا کو ترک کرنے کی بات ہو رہی ہے یا محبوب کو ترک کرنے کی بات ہو رہی ہے۔ لیکن اکثر جگہ انھوں نے نہایت ہی سلیس، صاف، شائستہ اور شستہ ترجمہ کیا ہے، جس سے مترجم کی مہارت ظاہر ہوتی ہے: شعر ہے۔

تا جمالت عاشقاں را، زد بوصل خود صلا
جان و دل افتادہ اند، از زلف و خالت در بلا

''جب سے ترے حسن نے عاشقوں کو اپنے وصال کی دعوت دی ہے، جان اور دل تیری زلف اور تل سے مصیبت میں پڑے ہیں۔''

آنچہ جانِ عاشقان از دستِ ہجرت می کشد
کس ندیدہ در جہاں جز کشتگان کربلا

''عاشقوں کی جان تیرے فراق کے ہاتھ سے، جو کچھ برداشت کر رہی ہے، کربلا کے شہیدوں کے علاوہ، کسی نے دنیا میں نہیں دیکھا ہے''

ایسے ہی ایک مشہور شعر ہے۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ ما را
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند وبخارا را

اس کا ترجمہ انھوں نے اس طرح کیا ہے۔

''اگر وہ شیرازی معشوق، ہمارا دل تھام لے تو اس کے دل فریب تل کے عوض، میں سمرقند و بخارا بخش دوں''

حالانکہ اکثر مترجمین بخالِ ہندوش کا ترجمہ ہندستانی تل کر دیتے ہیں۔

'دیوانِ حافظ' کے پہلے انگریزی مترجم ولیم جونز نے بھی اس نے بھی اس شعر کے ترجمے میں غلطی کی ہے اور 'ہندوش' کا ترجمہ انھوں نے بھی ہندوستانی کیا ہے:

If that Shirazi Turk, accepts my heart
in their hand
For their Indian mole,Iwill give
Samarkand and Bukhara

اسی غزل کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

من از آں حُسنِ روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

''میں اس روز بروز بڑھنے والے حسن سے، جو کہ یوسف رکھتے تھے جان گیا تھا کہ عشق زلیخا کو، پا کی کے پردے سے باہر نکال لائے گا۔''

مزید کچھ ترجمے ملاحظہ ہوں۔

جانا تو را کہ گفت کہ احوال ما مپرس
بیگانہ گرد و قصۂ ہیچ آشنا مپرس

''اے محبوب تجھے کس نے کہا ہے کہ ہمارے حالات نہ پوچھ، بیگانہ بن جا، اور کسی آشنا کی بات نہ پوچھ۔''

ہیچ آگہی زعالم درویشیش نبود
آن کس کہ با تو گفت کہ درویش را مپرس

''اس کو درویشی کی دنیا کی، کچھ واقفیت نہ تھی، جس نے تجھ سے کہہ دیا ہے کہ درویش کو نہ پوچھ۔''

قاضی سجاد حسین صاحب کے تمام تراجم اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ بوریا نشیں عالم دین کس قدر کثیر المطالعہ، جفاکش، اور علمی تشنگی لیے ہوا تھا، جو داد و دہش اور صلہ کی فکر کیے بغیر رہتی دنیا تک کے لیے ایک عظیم علمی ورثہ چھوڑ گیا، اُس دور میں جب کہ نہ کوئی دوسرا ترجمہ حوالے کے لیے موجود تھا نہ ایران میں موجود محقق واسکالر سے رابطے کے فوری وسائل دستیاب تھے، ایسے وقت میں فارسی کے تمام اہم اور اعلیٰ متون کا ترجمہ کرنا، ایک ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔

■

Dr. Faisal Nazir
504, Green View Apartment
Near Kala Vidyalaya School
Mahada, Malwani, Malad,
Mumbai- 400095 (Maharashtra)
Mob.:9818697294
faislanzr40@gmail.com

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وما علیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیرضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

ویر ساورکر اور تقسیم ہند کا المیہ

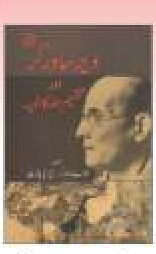

مترجمین: پروفیسر مظہر آصف/ ڈاکٹر مسعود عالم

صفحات: 385، قیمت: 240 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر قرۃ العین

F-9/20، گلی نمبر 6/4، ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی

تاریخ کے اوراق ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ان کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے، خاص طور پر جب وہ کسی ایسی عظیم شخصیت کے گرد گھومتے ہوں جس نے اپنی پوری زندگی قوم وملت کے لیے وقف کی ہو۔ ویر ساورکر اور تقسیم ہند کا المیہ ایسی ہی ایک کتاب ہے جو نہ صرف تقسیم ہند کے سانحے پر نئی روشنی ڈالتی ہے بلکہ ساورکر کی شخصیت، ان کے افکار اور ان کی دوراندیشی کو ایک تحقیقی، متوازن اور مثبت انداز میں اجاگر کرتی ہے۔

یہ کتاب دراصل ادوے ماہورکر اور چرایو پنڈت کی انگریزی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے جسے پروفیسر مظہر آصف اور ڈاکٹر مسعود عالم نے نہایت ہی خوش اسلوبی اور سلیقے کے ساتھ اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ پروفیسر مظہر آصف کا تدریسی اور تحقیقی سفر گوہاٹی یونیورسٹی سے شروع ہوا اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی میں اپنی علمی معراج کو پہنچا۔ فارسی، آسامی اور انگریزی زبانوں میں ان کی دس سے زائد کتابیں اور پچاس سے زیادہ تحقیقی مقالات مختلف معتبر رسائل وجرائد کی زینت بن چکے ہیں۔ فی الوقت پروفیسر مظہر آصف جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے وائس چانسلر کے منصب پر فائز ہیں۔ جب کہ دوسرے مترجم ڈاکٹر مسعود عالم جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور ہندوستان کے نوجوان مترجمین میں سے ایک ہیں۔ وہ انگریزی متون کو اردو اور ہندی میں بامحاورہ منتقل کرنے میں مہارت رکھتے ہیں اور ساتھ ہی عربی زبان وادب کے سنجیدہ محقق کی حیثیت سے بھی شناخت رکھتے ہیں۔ مترجمین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے کتاب کی اصل روح کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی زبان وبیان کو رواں، شگفتہ اور بامحاورہ اردو میں منتقل کیا ہے تاکہ اردوداں طبقہ بھی ساورکر کی فکری میراث سے براہِ راست فیض یاب ہوسکے۔ ترجمے میں کہیں بھی اجنبیت یا بوجھل پن محسوس نہیں ہوتا بلکہ یوں لگتا ہے جیسے کتاب براہِ راست اردو میں ہی تحریر کی گئی ہو۔ مترجمین کا یہ کارنامہ اردو دنیا کے لیے ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

کتاب کا مرکزی محور ویر ساورکر کی شخصیت اور ان کے افکار ہیں۔ ساورکر کو ایک ایسے مردِ آہن کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس نے نہ صرف آزادی کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا بلکہ تقسیم ہند کے خطرے کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔ کتاب میں اس پہلو پر نہایت مدلل انداز میں بحث کی گئی ہے کہ اگر ساورکر کی تجاویز کو بروقت تسلیم کیا جاتا تو شاید تقسیم کا یہ المناک سانحہ رونما نہ ہوتا اور لاکھوں بے گناہ جانیں ضائع ہونے سے بچ جاتیں۔

ساورکر کی ایک اور نمایاں خصوصیت جس پر کتاب میں زور دیا گیا ہے وہ ان کی ہمہ گیر قومیت ہے۔ انھیں صرف ایک ہندو رہنما کے طور پر پیش نہیں کیا گیا بلکہ ایک ایسے مدبر ومفکر کے طور پر دکھایا گیا ہے جن کے نزدیک قوم پرستی ہی اصل معیار تھی۔ ان کی نگاہ میں مذہب کی بنیاد پر عوام کو تقسیم کرنا کسی بھی طرح درست نہ تھا۔ کتاب میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ ساورکر کی قومیت میں کشش وجاذبیت ایسی تھی کہ وہ مسلمانوں اور عیسائیوں کو بھی اپنے ساتھ لے کر ایک متحدہ قومی دھارے میں شامل کرسکتی تھی، بشرطیکہ اس پیغام کو صحیح انداز میں عام کیا جاتا۔

ساورکر کے فلسفۂ عدم تشدد پر تنقید کو بھی کتاب میں ایک سنجیدہ موضوع کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ دشمن اگر تشدد پر اتر آئے تو اس کا جواب اسی کی زبان میں دینا چاہیے، ورنہ عدم تشدد محض بزدلی بن جاتا ہے۔ اس فکر کو مصنّفین نے بابا پرشورام کی اس تعلیم سے جوڑا ہے جس میں کہا گیا کہ سنگین جرم کرنے والے کے خلاف ہتھیار اٹھانا عین اخلاقی تقاضا ہے۔

کتاب میں یہ پہلو بھی اجاگر کیا گیا ہے کہ ساورکر کے نظریات میں قومی سلامتی اور موجودہ سماجی مسائل، جیسے عریانیت اور فحاشی، کے حل بھی موجود ہیں۔ ان کے نزدیک ایک صحت منداور باوقار سماج ہی مضبوط قوم کی ضمانت ہے۔ اس لیے ساورکر محض ایک سیاسی رہنما ہی نہیں بلکہ انھیں ایک سماجی مصلح کے طور پر بھی دیکھا جانا چاہیے۔

مترجمین کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف کتاب کو اردو کے قالب میں منتقل کیا بلکہ اس کی فکری معنویت کو اور زیادہ ابھار کر پیش کیا ہے۔ انھوں نے ساورکر کی شخصیت پر کوئی جذباتی غلاف نہیں چڑھایا بلکہ ایک غیر جانبدارانہ اور تحقیقی انداز اختیار کرتے ہوئے ان کے مثبت پہلوؤں کو سامنے رکھا، ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کیا کہ ان کی بعض خامیوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہی اعتدال پسندی اور دیانت داری اس ترجمے کو مزید قابلِ اعتبار بناتی ہے۔

کتاب کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں ساورکر کے افکار کو گاندھی جی، سبھاش چندر بوس اور بابا صاحب امبیڈکر جیسے رہنماؤں کے نظریات کے ساتھ تقابلی انداز میں پرکھا گیا ہے۔ اس سے قاری کو اس زمانے کے فکری تنوع اور نظریاتی اختلافات کے باوجود باہمی احترام و رواداری کے پہلوؤں کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ خاص طور پر یہ حقیقت کہ امبیڈکر اور ساورکر قومی سلامتی کے حوالے سے ایک دوسرے کے ہم خیال تھے، تاریخی اعتبار سے نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ امبیڈکر نے حتیٰ کہ گاندھی جی کے قتل کے مقدمے کے دوران ساورکر کی مدد کی، جو اس بات کی دلیل ہے کہ اختلاف رائے کے باوجود دونوں میں باہمی عزت واحترام موجود تھا۔ اس پہلو کو اجاگر کرنا آج کے ہندوستانی معاشرے کے لیے بھی ایک گہرا پیغام رکھتا ہے کہ فکری اختلافات کو نفرت اور دشمنی میں نہیں بدلنا چاہیے بلکہ قومی مفاد کے بڑے مقصد کے تحت مکالمے اور تعاون کی گنجائش رکھنی چاہیے۔

کتاب میں ساورکر کی ادبی وتخلیقی حیثیت پر بھی بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے خطبات، ڈرامے، شاعری اور نثری تصنیفات محض ادبی کاوشیں نہیں بلکہ ولولہ انگیز قومی شعور کو بیدار کرنے کے ذرائع بھی ہیں۔ ساورکر کا چھ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل علمی وفکری سرمایہ ان کی ہمہ جہت شخصیت کا ثبوت ہے۔ مترجم نے ان پہلوؤں کو اردو داں قارئین کے سامنے نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے، اور یہ امر مترجم کی علمی دیانت اور فکری بصیرت کا پتہ دیتا ہے۔

کتاب کے اختتامیہ میں مصنّفین نے نہایت دردمندی کے ساتھ یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ اگر آزادی کے بعد ساورکر کے نظریات کو عملی جامہ پہنادیا گیا ہوتا تو آج ہندوستان کس قدر مضبوط اور متحد ہوتا۔ یہ سوال قاری کو سوچنے اور فکر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے، کتاب کی اہم خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ محض ماضی کا احوال نہ سنائے بلکہ مستقبل کی سمت بھی اشارہ کرے۔

کتاب کے مجموعی مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ویر ساورکر اور تقسیم ہند کا المیہ نہ صرف ایک تاریخی کتاب ہے بلکہ قومی فکر کی تعمیر نو کا ایک اہم ذریعہ بھی ہے۔ یہ کتاب نئی نسل کے لیے ایک پیغام ہے کہ تاریخ کے اصل حقائق کو جانے بغیر کوئی قوم آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ساورکر کی شخصیت اور ان کے افکار آج بھی زندہ ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد قاری کے ذہن میں یہ بات راسخ ہوجاتی ہے کہ ساورکر کو محض ایک متنازع شخصیت کے طور پر دیکھنا سراسر زیادتی ہے، وہ دراصل ایک عظیم مفکر، مدبر اور سچے قوم پرست تھے۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ مترجمین نے اس کتاب کے ذریعے اردو قارئین کو ایک انمول تحفہ دیا ہے۔ یہ کتاب ساورکر کی شخصیت کو مثبت تناظر میں سمجھنے، ان کے نظریات سے سبق لینے اور مستقبل کے لیے رہنمائی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ بلاشبہ یہ کام اردو دنیا کے علمی ذخیرے میں ایک روشن اضافہ ہے جسے آنے والے دنوں میں مزید اہمیت حاصل ہوگی۔

اردو صرف و نحو

مصنف: اقتدار حسین خان

صفحات: 131، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: عبدالرحمٰن شافی

ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زبان کسی قوم کی فکری وتہذیبی شناخت کا آئینہ ہوتی ہے، اور قواعد زبان اس آئینے کو صاف اور منظم رکھنے والے اصول ہیں۔ اردو زبان کی صرف ونحو، محض لفظوں اور جملوں کے ظاہری ربط کی سائنس نہیں، بلکہ فکر و اظہار کے اس نظام کا بنیادی ڈھانچہ ہے جس کے بغیر معنی کی تعمیر ممکن نہیں۔ زبان، دراصل، انسانی شعور کی تہذیبی اور نفسیاتی تشکیل کا مظہر ہے، اور قواعد اس شعور کو نظم و ترتیب عطا کرتے ہیں۔

اقتدار حسین خان کی تصنیف ''اردو صرف ونحو'' اردو زبان کے انہی اصول و ضوابط کو نہایت سلیقے اور علمی توازن کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ مصنف نے اردو کی ساخت، اس کی نحوی ترکیب اور صرفی بنیادوں کو نہ صرف وضاحت سے بیان کیا ہے بلکہ ان کے پس منظر میں موجود فکری اور تاریخی عوامل کو بھی سامنے رکھا ہے۔ مارفولوجی (Morphology) اور نحو (Syntax) کے دقیق مباحث کو اس انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ قاری کے لیے زبان کی داخلی ساخت کا ایک نیا زاویہ وا ہوتا ہے۔ الفاظ کے اشتقاق، ان کے صرفی اجزا، جملوں کی ترکیب، اور معنی کے باہمی رشتے، یہ سب وہ عناصر ہیں جنھیں مصنف نے لسانی منطق اور ادبی شعور، دونوں کے توازن سے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

اردو قواعد کی روایت اگرچہ عربی و فارسی لسانیات سے گہرا رشتہ رکھتی ہے، مگر کتاب ہذا میں مصنف نے محض تقلید پر اکتفا نہیں کیا۔ یہاں زبان کو ایک زندہ اور تغیر پذیر مظہر کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ ایسا مظہر جو وقت، معاشرت، اور انسانی تجربے کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ مصنف نے قواعد کو جامد اصولوں کے بجائے ایک متحرک نظام کے طور پر برتا ہے جو معنی کے امکانات کو محدود نہیں بلکہ وسیع کرتا ہے۔

کتاب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مصنف نے اردو قواعد کو محض روایتی ترتیب میں نہیں پیش کیا بلکہ اسے ایک سائنسی اور تجزیاتی تناظر میں دیکھا ہے۔ ہر باب میں

موضوع کی تعریف، عملی مثالیں اور موجودہ لسانی رویوں کا تجزیہ ایک مربوط ترتیب میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف کا اسلوب نہ صرف علمی ہے بلکہ تدریجی بھی ہے۔ یوں کہ قاری کو ابتدا ہی سے علم کی ایک واضح سمت ملتی ہے، اور وہ رفتہ رفتہ زبان کی ساختیاتی پیچیدگیوں کو سمجھنے لگتا ہے۔

مارفولوجی کے مباحث میں اردو لفظیات کی ساخت اور ان کے اجزائے ترکیبی کو دقتِ نظر سے سمجھایا گیا ہے۔ لفظ کے مادّے، اس کی جڑ، سابقے اور لاحقے کے باہمی تعلقات پر مصنف نے جو مثالیں پیش کی ہیں، وہ اردو کے صوتی نظام اور تاریخی ارتقا دونوں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ یہاں قواعد کو خشک اصطلاحات کے طور پر نہیں، بلکہ زبان کے زندہ مظاہر کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ یہی وہ نقطۂ نظر ہے جو اس کتاب کو محض تعلیمی نہیں، بلکہ فکری و سائنسی اہمیت بھی عطا کرتا ہے۔

'نحو' کے ابواب میں جملے کی ترکیب، ارکانِ جملہ، اور معنوی روابط کو گہرائی سے پرکھا گیا ہے۔ مصنف نے جملے کی ساخت کو محض نحوی قید کے طور پر نہیں دیکھا بلکہ اسے معنی کی تشکیل کا بنیادی ذریعہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح اردو کی نحوی ساخت میں جو لچک اور وسعت پائی جاتی ہے، مصنف نے اس کو زبان کی تخلیقی قوت کے طور پر پیش کیا ہے، نہ کہ محض قواعد کی پابندی کے طور پر۔

کتاب کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے مختلف زبانوں کے تقابلی جائزے کے ذریعے اردو کی لسانی شناخت کو اجاگر کیا ہے۔ عربی و فارسی کی قواعدی روایت، ہندی کے اثرات، اور انگریزی کے جدید اثرات کو مصنف نے نہایت متوازن نقطۂ نظر سے بیان کیا ہے۔ یہ تقابلی اسلوب اردو زبان کی تاریخی وسعت اور اس کے تہذیبی پس منظر کو مزید نمایاں کرتا ہے۔

مذکورہ کتاب میں اصطلاحات کی وضاحت بھی نہایت سلیقے سے کی گئی ہے۔ ہر مشکل اصطلاح کے ساتھ اس کی تعریف، مفہوم اور استعمال کی مثال دی گئی ہے، اس کے ساتھ ساتھ نثر کا بہاؤ خشک نہیں ہونے پاتا۔ جس سے یہ تصنیف تدریس کے میدان میں بھی ایک کارآمد ماخذ بن جاتی ہے۔

لسانیات چونکہ ایک خشک موضوع ہے مگر موصوف نے علمی مباحث میں بھی نثر کی وہ نفاست اور لطافت برقرار رکھی ہے جو قاری کو بوجھل ہونے سے بچاتی ہے۔ کہیں کہیں استعارے، تشبیہیں اور ادبی اشارے اس علمی گفتگو میں ایک جمالیاتی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ یوں لسانیات کا خشک میدان بھی ایک فکری و ادبی فضا میں ڈھل جاتا ہے۔ کتاب کے ابواب کا باہمی ربط بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ہر باب اگلے باب کی تمہید معلوم ہوتا ہے، اور پورا متن ایک فکری تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ صرف قواعد نہیں پڑھ رہا، بلکہ زبان کے ایک زندہ اور ارتقائی سفر میں شریک ہے۔

اردو زبان کے قواعد پر لکھی گئی یہ کتاب محض ایک درسی یا نصابی تصنیف نہیں بلکہ ایک فکری و لسانی دستاویز ہے، جو زبان کی ساخت، منطق اور معنویت کو گہرے علمی شعور کے ساتھ منکشف کرتی ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ مصنف نے قواعد کے خشک خانے میں علم و ادب کی روح پھونک دی ہے۔ وہ زبان کو ایک متحرک اور زندہ وجود کے طور پر دیکھتے ہیں، ایسا وجود جو انسان کے احساس، تجربے اور تہذیب کے ساتھ سانس لیتا ہے۔

یہ تصنیف اردو لسانیات کے طلبا، محققین اور اساتذہ کے لیے نہ صرف ایک معتبر ماخذ ہے بلکہ انہیں زبان کو ایک نئے زاویے سے سمجھنے کی دعوت بھی دیتی ہے۔ آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ کتاب اردو قواعد کی روایت میں ایک نمایاں اضافہ ہے۔ ایسا اضافہ جو نہ صرف علمی سطح پر قیمتی ہے بلکہ اردو زبان کی تہذیبی و فکری معنویت کو بھی نئی توانائی بخشتا ہے۔ یہ تصنیف ان لوگوں کے لیے ایک راہنما کا درجہ رکھتی ہے جو زبان کو محض اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ فکر کی تعمیر کا بنیادی آلہ سمجھتے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، قانون، فنونِ لطیفہ، فلسفہ، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

تحقیق و تنقید

کلیم عاجز کی شاعری (تنقید و تجزیہ)

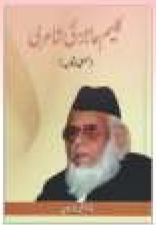

مصنف: ڈاکٹر محمد رضوان

صفحات: 252، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: محمد یونس انصاری، دہلی

کلیم عاجز کی شخصیت متعدد جہتوں سے اہمیت کی حامل ہے۔یوں تو وہ بحیثیت شاعر دنیائے ادب میں مشہور ہیں لیکن نثر کے میدان میں بھی ان کی خدمات لائق تحسین ہیں۔ان کی نثری تصانیف میں تنقیدی و تحقیقی مضامین، سفرنامے، آپ بیتی، شعرا اور ادبا کے خاکے اور مکتوبات شامل ہیں تو شاعری میں انھوں نے غزل، نظم، نعت، سہرے، مرثیے اور رباعیاں لکھی ہیں۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ادبی خدمات کا دائرہ کس قدر وسیع تھا۔انھوں نے نثر و نظم کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیے اس سے ان کی شخصیت کو مزید بلندی و سرفرازی حاصل ہوئی۔اب تک ان کی ایک درجن سے زائد کتابیں بشمول نظم ونثر شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔

'کلیم عاجز کی شاعری (تنقید و تجزیہ)' مصنفہ ڈاکٹر محمد رضوان ایک اہم کتاب ہے جس میں انھوں نے کلیم عاجز کے کلام کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے اور ان کی شخصیت کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔شروع میں مختصر سوانح حیات بیان کرتے ہوئے ان کی ولادت، خاندانی افراد، ماحول، تعلیم و تربیت اور ان کے ادبی ذوق کا ذکر کیا گیا ہے۔صاحب کتاب نے فہرست مضامین میں ایک عنوان 'کلیم عاجز کی پریشانیاں' کے نام سے قائم کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ 1941 میں جب کلیم عاجز نے آئی اے میں داخلہ لیا تو اسی سال ان کے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ والد صاحب کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ان کے معاشی حالات پہلے جیسے نہیں رہے اور انھیں مختلف پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ابھی وہ والد صاحب کے صدمے سے باہر نہیں نکلے تھے کہ کلیم عاجز کو ایک اور دل دہلا دینے والے واقعہ کا سامنا کرنا پڑا اور وہ تھا بہار میں 1946 کے دوران فرقہ وارانہ فساد۔یہ واقعہ ان کے لیے سوہان روح ثابت ہوا۔اس فساد نے ان کے ذہن و دل پر اس قدر گہرے اور انمٹ اثرات مرتب کیے جنھیں وہ مرتے دم تک نہیں بھلا پائے۔

اس کتاب میں مصنف نے یہ معلومات بھی فراہم کی ہیں کہ کس طرح کلیم عاجز کی شاعری کی ابتدا ہوئی اور کن کن اصناف ادب پر انھوں نے طبع آزمائی کی۔ دراصل ان کا شعری سفر کافی طویل رہا ہے۔بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے ہی ہوئی۔شعر و شاعری کا آغاز انھوں نے کم عمری ہی میں کردیا تھا۔اپنی مختلف رغبتوں اور دلی میلانات کے سبب وہ ادب کے مختلف شعبوں میں بھی قسمت آزماتے رہے۔وہ جس دبستان سے تعلق رکھتے ہیں وہاں کی قدیم شعری وادبی فضا ہی کچھ ایسی ہے جس نے ان کی شاعری میں چار چاند لگادیے اور وہ بہت جلد شعری افق پر نمودار ہونے لگے۔ان کی تخلیقی صلاحیت کا نمونہ اس شکل میں ظاہر ہوا۔

یوں تو دنیا میں اور کیا نہ ہوا — پر جو اپنا تھا مدعا نہ ہوا
بام پر وہ جو بے نقاب آئے — سر اٹھانے کا حوصلہ نہ ہوا

کلیم عاجز لکھتے بھی تھے اور مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے۔گیارہ سال کی عمر میں انھوں نے پہلی غزل کہی اور اپنا تخلص عاجز رکھا۔مسلسل مشق سخن سے وہ عمدہ شاعر بن گئے۔ان کے کلام کی تاثیر اور قوت نے انھیں بہت جلد عوامی حلقوں میں مشہور و مقبول کردیا۔ان کی شہرت دور دور تک پھیلتی چلی گئی لہٰذا ملک و بیرون ملک منعقد ہونے والے مشاعروں میں انھیں مدعو کیا جانے لگا۔

اس کتاب میں مصنف نے کلیم عاجز کی سیرت، وفات اور ان کی نثری تصانیف: مختصر تعارف کے ذیلی عنوانات بھی قائم کیے ہیں۔کتاب کے پچاس ساٹھ صفحات میں مذکورہ امور پر گفتگو کرنے کے بعد آخر میں ڈاکٹر محمد رضوان صاحب اپنے اصل مدعے پر آتے ہیں اور کلیم عاجز کے شعری مجموعوں کا تعارف و تجزیہ پیش کرتے ہیں۔اس میں ان کے غزلیہ مجموعوں کی فہرست دی ہے اور ہر ایک پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔کلیم عاجز کے جن پانچ شعری مجموعوں کی فہرست کتاب میں شامل ہے، ان کے نام اس طرح ہیں: وہ جو شاعری کا سبب ہوا، جب فصل بہاراں آئی تھی، کوچہ جاناں جاناں، پھر ایسا نظارہ نہیں ہوگا، ہاں چھیڑو غزل عاجز۔

کلیم عاجز کا پہلا شعری مجموعہ 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' 190 غزلوں پر مشتمل ہے۔یہی وہ مجموعہ ہے جسے حلقہ ارباب ذوق نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔اس کے بعد کلیم عاجز عالمی شہرت یافتہ شاعروں میں شمار کیے جانے لگے۔'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' میں کلیم عاجز نے اپنے درد و غم کا اظہار کیا ہے، انھیں زندگی سے شکایت ہے، انھوں نے صحیح ڈھنگ سے زندگی جینے کی کوشش کی لیکن حالات سازگار نہیں رہے۔زندگی سے نالہ و فریاد کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

کچھ اپنی زندگی نالوں میں کچھ فریاد میں گزری — جو باقی رہ گئی اندیشہ بیداد میں گزری
خزاں کا دور گزرا خانہ بربادی کے ماتم میں — بہار گل بہار آشیاں کی یاد میں گزری

اس طرح 'کلیم عاجز کی شاعری (تنقید و تجزیہ)' میں مذکورہ بالا شعری مجموعوں کا نہ صرف تعارف پیش کیا گیا ہے بلکہ وہ کب شائع ہوئے اور کس موقع پر کہاں ان کا اجرا ہوا؟ جیسے حقائق بھی پیش کیے گئے ہیں۔اس کے علاوہ مجموعوں میں شامل غزلوں اور نظموں کا تجزیہ بھی گہرائی کے ساتھ کیا گیا ہے۔اس قابل ستائش کارنامے کے لیے ڈاکٹر محمد رضوان تبریک کے مستحق ہیں۔

ترتیب

اعتراف نامہ

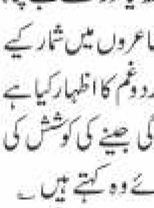

مرتبہ: شمع اختر کاظمی

صفحات: 224، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: فرحان حنیف وارثی

پوسٹ باکس نمبر: 2546، ممبئی سینٹرل پوسٹ آفس، ممبئی

معروف قلمکار شمع اختر کاظمی کی مرتب کردہ کتاب 'اعتراف نامہ' کی رسم رونمائی حال (ماہ ستمبر 2025) ہی میں 'پاورلوم' اور اردو کے شہر بھیونڈی میں ہوئی۔اس کتاب میں موصوفہ کے رفیق حیات اور سنیئر صحافی اختر کاظمی کی شخصی اور صحافتی خوبیوں پر تحریر کردہ مضامین کو یکجا کیا گیا ہے تاکہ وہ محفوظ ہو جائیں۔تمام مضامین فعال ادیبوں اور

صحافیوں نے لکھے ہیں، جس سے اختر کاظمی کے صحافتی قد کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ وہ قلمکار ہیں جنھوں نے اختر کاظمی کو قریب سے دیکھا، اور ان کے ساتھ وقت گذارا ہے۔ ان کی رپورٹنگ، تجزیوں اور مضامین کو پڑھا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے شمع اختر کاظمی کے 'پیش لفظ' پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔

شمع اختر کاظمی 'اعتراف نامہ، کیوں؟' عنوان کے تحت رقم طراز ہیں: 'اعتراف نامہ، ان مہربان شخصیات کے خلوص کا اعترافیہ ہے جو سچائی کے اظہار اور ادب دوستی کے بامعنی رشتوں میں ملفوف ہے۔ ان مضامین میں نئی جہت کی تلاش، تخلیقی حسن و شعور کے ساتھ غیر جانب دارانہ تاثرات کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مصلحت و ریا کاری سے غیر آلود تحریریں 'اعتراف نامہ' کی قدر و قیمت میں اضافے کا سبب ہیں۔ یہ ان اصحاب کی تحریریں ہیں جن کو دنیائے ادب، آداب کے ساتھ تسلیم کرتی ہیں۔ 'اختر کاظمی: شخصیت اور صحافت' سے 'اعتراف نامہ' تک کا سفر خوشگوار بھی اور خوش کن احساسات سے معمور بھی اور حوصلہ بخش بھی ہے۔ انھوں نے اپنے پیش لفظ میں ایک جگہ لکھا ہے: 'یہاں یہ واضح رہے کہ صحافی بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو صحافت کو پوری ایمانداری اور مستقل مزاجی کے ساتھ اپناتے ہیں اور کچھ اسے وقت گزاری کا مشغلہ سمجھتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ موجودہ وقت اردو صحافت کے لیے مایوس کن ہے۔ ایسی صورتحال میں اختر کاظمی جیسے صحافیوں کی موجودگی کسی نعمت خداوندی سے کم نہیں ہے۔

'اعتراف نامہ، کیوں؟' میں 26 مضامین ہیں۔ معروف نقاد اور ادبی صحافی حقانی القاسمی اپنے مضمون 'اختر کاظمی: شخصیت اور صحافت' میں لکھتے ہیں: 'اختر کاظمی کے لیے صحافت تجارت نہیں بلکہ عبادت ہے۔ انھوں نے صحافت کو جلب منفعت کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ صارفی کلچر میں مادیت مرکوز صحافت سے اپنے آپ کو دور رکھا اور ہر سطح پر صحافتی اقدار اور اخلاقیات کی پاسداری کی اور وہی لکھا جو ان کی ذات، ذہن اور ضمیر کا تقاضا تھا۔ صحافت میں مفادات، مراعات اور ترغیبات سے دامن کو بچائے رکھنا بھی ایک کمال ہے۔ اگر اس کمال کا انھوں نے خیال نہ رکھا ہوتا تو ان کی صحافت پر بھی زوال طاری ہو جاتا۔'

اختر کاظمی کے جاننے والوں کو یہ بخوبی پتہ ہے کہ وہ اپنی صحافت اور صحافتی پیشے کو کسی بھی صورت میں زوال پذیر ہونے نہیں دیں گے۔ وہ صحافت میں ایمانداری اور سخت محنت کے قائل ہیں۔ رپورٹنگ کے علاوہ مضمون نویسی اور تجزیہ نگاری پر انھیں یکساں قدرت حاصل ہے۔ اس کتاب میں موصوف کی شخصیت اور صحافت پر تحریر کردہ ایسے کئی مضامین ہیں جو دلچسپ اور بھرپور ہیں۔ مضامین لکھنے والوں میں کئی نام بہت اہم ہیں۔ مثلاً حقانی القاسمی، صابر علی سیوانی، سہیل انجم، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر عطا عابدی، ڈاکٹر سید احمد قادری، محمد رفیع انصاری، محمد عارف اقبال، احسن امام احسن، اشہر ہاشمی، ڈاکٹر مشتاق احمد، سعید رحمانی، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دانش ریاض اور ڈاکٹر منصور خوشتر وغیرہ۔ علاوہ ازاں دیگر لکھنے والے بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ مذکورہ کتاب میں راقم السطور کا بھی ایک مضمون شامل ہے۔

ڈاکٹر صابر علی سیوانی کی تحریر متوجہ کرتی ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون 'بے باک صحافت کے علمبردار: اختر کاظمی' میں لکھا ہے: 'اختر کاظمی پیشے سے صحافی ضرور ہیں لیکن ان کے اندر ایک اردو کا ادیب چھپا ہے جو وقتاً فوقتاً ان کی رپورٹس میں نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ ان کے خاندانی ادبی پس منظر کا اثر ہے۔ جس کا چوکھا رنگ کاظمی صاحب کی رپورٹنگ میں نظر آتا ہے۔ 'اختر کاظمی ایک ادبی اور علمی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ زبان و بیان سے واقف ہیں اور ان کی صحافت معیاری ہے۔

معروف صحافی سہیل انجم اپنے مضمون 'اختر کاظمی: شخصیت اور صحافت' میں لکھتے ہیں: 'اس کتاب سے دو باتیں بہت واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ اختر کاظمی ایک مقبول صحافی ہیں۔ تمام حلقوں میں ان کی پذیرائی ہے اور لوگ ان کی خدمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ ایک دیانتدار، اصول پسند اور حق گو صحافی ہیں۔ انھوں نے کبھی اپنے صحافتی اصولوں کا سودا نہیں کیا اور نہ ہی اپنے قلم کو کسی مفاد کے عوض نیلام کیا۔'

پروفیسر اسلم جمشید پوری کے مطابق: 'اختر کاظمی برسوں سے اردو صحافت کے باغیچہ کو اپنے خون جگر سے سینچ رہے ہیں۔ ان کی خبریں، مضامین و مقالات مہاراشٹر کے اردو اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ ان کی تحریر میں ایک قسم کی کشش اور گہرائی ملتی ہے۔ موجودہ عہد کے صحافیوں میں ایک معتبر نام اختر کاظمی کا ہے۔'

راقم الحروف نے درج بالا سطور میں جن قلمکاروں کے تاثرات پیش کیے ہیں، وہ بھی ادبی اور صحافتی دنیا میں ایک ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مقبول اردو رسالہ 'اردو بک ریویو' کے مدیر محمد عارف اقبال کے ساتھ بھی اختر کاظمی کے دیرینہ مراسم ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون 'اختر کاظمی: شخصیت اور صحافت' میں لکھا ہے: 'یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے اس لیے بھی انتہائی اہم ہے کہ ایک اردو صحافی کے خلوص، ایثار و قربانی اور خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا ہے۔ عام طور پر زندہ معروف ادبی شخصیات پر رسائل و جرائد کے گوشے شائع ہوتے رہے ہیں لیکن اردو کے ایک صحافی پر کتاب کی اشاعت باعث تقویت ہے۔'

چلتے چلتے احسن امام احسن کے مضمون 'دانشوران ادب اور اختر کاظمی' پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں: 'اختر کاظمی کا منفرد انداز اور کھرا کھرا لکھنے کی عادت انھیں صحافت کی دنیا میں منفرد صحافی کی صف میں کھڑا کرتی ہے۔ کاظمی صاحب کا اخبار میں لکھنے کا اپنا ایک لہجہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان میں یہ خوبی بھی ہے کہ وہ کسی سے ملتے ہیں تو اسے اپنا بنا لیتے ہیں۔ اختر کاظمی نے پوری ایمانداری کے ساتھ صحافت کا کام انجام دیا ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیت سے صحافت کو مالا مال کیا ہے۔'

'اعتراف نامہ' میں اختر کاظمی کی اداریہ نگاری، منتخب مطبوعہ رپورٹس (اقتباسات) کے چند نمونے بھی شامل ہیں۔ پونے میں مقیم معروف شاعر رفیق جعفر کا مضمون 'اختر کاظمی: شخصیت اور صحافت ایک خصوصی مطالعہ' اور کتاب کے آخر میں سابقہ کتاب 'اختر کاظمی: شخصیت اور صحافت' کی 11 مارچ 2023 کو منعقد ہونے والی اجرائی تقریب کا فوٹو البم دیا گیا ہے۔

شمع اختر کاظمی نے لکھنے پڑھنے کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہے۔ ان کی مرتبہ کتاب 'اعتراف نامہ' کے علاوہ بحیثیت مصنفہ چار کتابیں: آدھی دنیا، سورج سوا نیزے پر، آدھی دنیا کا مکمل جہاں، اور 'نقوش پندار' منظر عام پر آچکی ہیں۔

'اعتراف نامہ' کو نئی دہلی کے معروف عرشیہ پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے۔ سر ورق سادہ، مگر بامعنی ہے اور اسے عائشہ اختر کاظمی نے بنایا ہے۔

شاعری

آئندہ

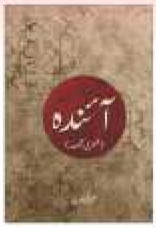

شاعر: سلیم محی الدین
صفحات: 264، قیمت: 349 روپے، سنہ اشاعت: 2025
ناشر: ریختہ پبلی کیشنز (انڈیا)
مبصر: ڈاکٹر غضنفر اقبال
سائبان زبیر کالونی، ہاگر گا کراس، رنگ روڈ گلبرگہ 585104

پروفیسر سلیم محی الدین، اُردو کے خوش کلام شاعر ہیں۔ تصنیف و تالیف اور مطالعہ و تحقیق سے انھیں خصوصی شغف ہے۔ سلیم محی الدین کی شعری کتاب 'آئندہ' دوسری اور 'وابستہ' اولین شعری کتاب تھی۔ پیشِ نگاہ کتاب میں حمدیات، نعت رسول پاکؐ، غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ سلیم محی الدین کی چار حمدیں مالک ارض و سما کی بڑائی، کبریائی اور برگزیدگی کا عقیدت نامہ ہیں۔ نعت رسول کریمؐ شاعر کی عجز بیانی کا بلیغ اظہار یہ ہے۔ انھوں نے تقدیسی شاعری کو اپنی والہانہ رافت سے شعری پیرہن آراستہ کیا ہے۔

سلیم محی الدین کی غزلیہ شاعری تازہ کار فکر اور محتاط وارفتگی کا حسین و جمیل مرقع ہے۔ ان کی شاعری کے تمام رنگ شگفتگی، سلاست و روانی سے اُبھرتے ہیں۔ وہ سادگی اور صفائی سے بات کہنے کے قائل ہیں بڑی سے بڑی بات بھی سہل اور عام فہم زبان میں کہہ جاتے ہیں اور ایک موضوع کو سو رنگ سے باندھنے کا ہنر جانتے ہیں۔ انھی شاعرانہ کمالات کے سبب سلیم محی الدین نے شعبۂ شاعری کے ایک وسیع حلقے کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

اسی میں خواب ہیں نیندیں اسی میں   ہماری آنکھ میں پانی بہت ہے
ایسا لگتا ہے میں پرندہ ہوں   اور مجھ پر اڑان طاری ہے

سلیم محی الدین کے اندر شاعری کی خداداد صلاحیت پائی جاتی ہے۔ ان کی غزلوں میں تغزل سے بھرپور اشعار پختگی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ ان کی غزلیں موضوعاتی تنوع اور ہمہ گیری کے لحاظ سے فنی سطح پر قابل توجہ ہیں۔

خوف تو زندگی کا ساتھی ہے   حادثہ چاند پر نہیں ہوتا
ہتھیلی کی لکیریں کہہ رہی ہیں   ستاروں میں پریشانی بہت ہے
اسے مجھ پر آخر یقین آگیا   رکھی درمیاں جب سنہری کتاب

سلیم محی الدین کی غزل بدلتا ہوا معاشرہ، بدلتی ہوئی تہذیب اور بدلتی اقدار کا نوحہ نہیں ہے بلکہ اس میں گہرا سماجی شعور ہے۔ ان کے شعری محرکات روزمرہ کی ناہمواریوں کے بیان کی آڑی ترچھی لکیروں سے کلاسیکی ورثے کی گواہی دیتے ہیں۔ ان کی شعری فضا میں بلا کی ندرت پائی جاتی ہے۔

ہماری آگ بھی گلزار ہو گئی ہوتی   خلل دماغ کا دل میں ذرا اتر جاتا
میں راضی 'خدا مجھ سے راضی مرا   عبادت ریاضت مبارک تجھے
ہر پرندہ نشانِ ہجرت ہے   پیڑ تو آخری علامت ہے

سلیم محی الدین غزل کے مزاج داں ہیں۔ ان کی غزل میں بے شمار جہتیں ہیں۔ انھوں نے عہدِ موجود کو ایک اکائی کی شکل میں دیکھا ہے اسی لیے ان کی غزلیہ شاعری میں دل کشی اور خوش منظری دکھائی دیتی ہے۔ وہ ماضی کے خوابوں کی پرچھائیوں سے شعری پیکر بنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی غزل میں کہیں جامد اور کہیں متحرک پیکروں کی جلوہ سامانیاں نمایاں ہیں۔ انھوں نے کئی طرح کے شعری پیکر تخلیق کیے ہیں۔ سلیم محی الدین کی غزل میں تازہ گوئی اساسی کردار ادا کرتی ہے وہیں شاعر نے تازہ اور نادر ترکیب سازی اور پیکر تراشی سے اُردو غزل کو روانی و برجستگی اور سادگی و پرکاری کا پُراثر لہجہ عطا کیا ہے۔

کاغذ کی پیاس بجھ نہ سکی، دل ہی بجھ گیا   جلنے کو یہ چراغ جلا تھا، نہیں رہا
ہتھیلیوں کی لکیروں کو پڑھ رہا تھا وہ   پتہ چلا کہ ستارہ زمیں پر اترا ہے
کر رہا ہوں ترے لہجے کی ورق گردانی   دل پہ چھائے ہوئے موسم کو سہانا کر دے

سلیم محی الدین کا وسیع شعری ادراک فن کارانہ طور پر متوجہ کرتا ہے۔ گہری فکر اور معنی کی بلند آفرینی شاعر کے اعتماد کا انفراد ہے۔ ان کے ہاں داخلیت کا عمل اتنا زیادہ نہیں ہے خارجی مشاہدات کی معرفت شاعر نے اپنے عصر کی بے کیفی، بے سمتی اور بے رشتگی سے پہچان کرائی ہے۔

آنسو ہے آنکھ میں، نہ ہی شبنم ہے پھول پر   اچھا ہے روز و شب کا تماشہ نہیں رہا
روپ بدلتی دنیا، رنگ بدلتے چہرے   اسی لیے تو رشتے کرنا چھوڑ دیا ہے
خلوص و محبت رواداریاں   جو آئیں نظر تو نوادر کہو

کتاب کی ابتدا میں پروفیسر طارق سعید نے طویل، مبسوط اور وقیع مقدمے میں سلیم محی الدین کی شعری کائنات پر جو باتیں کہی ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر کا رشتہ اپنی زمین سے کس قدر استوار ہے۔ اور عہدِ حاضر کے نمائندہ شعرا میں بے حد اہم ترین شاعر ہیں۔ اور اُن کی کتاب 'آئندہ' عصری حسیات و کیفیات کی تخلیقی دستاویز ہے جس کو شاعر نے فکری رعنائی، بلندئ خیال اور ماضی کی بازیافت سے ہم رشتہ کیا ہے۔ پروفیسر طارق سعید کے لفظوں میں:

''سلیم محی الدین کے تخلیقی سفر کی زادِراہ کی علامت نادید جہانوں کا ایک سفر ہے اور سفر ہی اس کا حاصل و منتہا ہے۔ حاصلِ سفر کے طور پر حصہ میں تکان ہی تکان اور ہر لحظہ نئے طور کی جستجو فن کار سلیم محی الدین کے قلم کا مقدر ہے۔''

(بحوالہ مقدمہ، پروفیسر طارق سعید، ص 69)

سلیم محی الدین نے افتخار نسیم کی زمین میں غزل کہی ہے۔ ولی اورنگ آبادی، حمایت علی شاعر، دشینت کمار، اسلم مرزا اور ارتکاز افضل کے نام معنون غزلیں فکری کینوس، مشاہدے کی گہرائی اور احساس کی شدت کے سبب دامن دل کھینچتی ہیں۔

سلیم محی الدین نے فطری زبان میں نظمیں کہیں ہیں۔ وہ اپنی نظمیہ شاعری میں کائنات کی فطری سادگی اور حسن کی بقا کے خواہاں ہیں۔ کورونا وائرس کی وبا سے متاثر ہو کر کہی گئی سلیم محی الدین کی سلسلہ وار نظمیں متوجہ کن ہیں۔ حمید سہروردی، شہاب افسر اور منش کے فکر و فن پر کہی گئیں توصیفی نظمیں شاعر اور صاحبِ موضوع کے درمیان ایک پل کا کام کرتی ہیں جو احساس و اظہار کی سچی تصویریں ہیں۔ بہرصورت سلیم محی الدین کی شاعری آئندہ سے وابستہ ہے۔ شاعر کی شعری و ادبی قدر افزائی کرتے ہوئے ریختہ نے کتاب 'آئندہ' کو شائع کیا ہے کیونکہ 'آئندہ' اردو شاعری میں ایک موقر اضافہ ہے۔

■

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے خبر نامہ میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔

یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

فروغِ اردو کے لیے ماضی پرستانہ رویے کے بجائے مستقبل پسندانہ اپروچ اختیار کرنے کی ضرورت: دانشوران

6 تا 8 فروری 2026 کو قومی اردو کونسل کی مجوزہ عالمی اردو کانفرنس کے تعلق سے ایڈوائزری کمیٹی کی میٹنگ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام 6 سے 8 فروری 2026 کو مجوزہ ورلڈ اردو کانفرنس کے تعلق سے تشکیل کردہ ایڈوائزری کمیٹی کی میٹنگ کا انعقاد انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں عمل میں آیا جس میں کانفرنس کے خدوخال اور غرض و غایت پر غور وخوض کیا گیا۔ میٹنگ کا آغاز کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال کے

خیر مقدمی کلمات سے ہوا، جبکہ ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر) نے میٹنگ کے ایجنڈے پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر شمس اقبال نے میٹنگ کے شرکا کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان ایک کثیر لسانی و کثیر ثقافتی ملک ہے جس میں اردو زبان وتہذیب کا اہم مقام ہے جسے ہر سطح پر سرکاری تحفظ اور سرپرستی بھی حاصل ہے۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل گزشتہ بارہ برسوں سے عالمی اردو کانفرنس کا اہتمام کرتی آرہی ہے اور ہماری کوشش ہے کہ آنے والی کانفرنس اپنے موضوع اور تھیم کے اعتبار سے ایسی ہمہ گیر ہو کہ اردو کی تکثیری، شمولیتی اور ہندوستانی شناخت بہت واضح طور پر سامنے آئے، کیونکہ ہم ہندوستانی ثقافت اور ملک بھر کی زبانوں کے ساتھ مستحکم رشتہ قائم کرکے ہی اپنی زبان کا فروغ کرسکتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس کانفرنس کا موضوع 'کثیر لسانی ہندوستان میں اردو زبان وتہذیب' رکھا گیا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ اس کانفرنس میں اردو اور دوسری ہندوستانی و عالمی زبانوں کے مابین اثر و تاثیر اور لین دین کی روایت پر بہت منظم گفتگو ہوگی جس سے ہم آگے کا روڈ میپ تیار کرسکیں گے۔

نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے ڈائرکٹر جناب یوراج ملک نے کہا کہ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اردو ایک شیریں زبان ہے اور ثروت مند تاریخ کی حامل ہے مگر آج کے دور میں اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ضروری ہے۔ ہمیں اردو کے خوب صورت لٹریچر سے غیر اردو داں طبقے کو متعارف کروانے کے لیے مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ شائع کرنا چاہیے، اسی طرح ہندوستان کی دوسری ایسی زبانوں کے ماہرین کو بھی اس کانفرنس میں مدعو کیا جائے جن کا اردو سے گہرا تعلق ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے وائس چانسلر پروفیسر عین الحسن نے کہا کہ اس کانفرنس میں اردو کے ساتھ فارسی، عربی، ہندی اور دیگر زبانوں کے دانشوران کو بھی مدعو کیا جائے کیونکہ اردو ایسی زبان ہے جس نے عربی و فارسی کے ساتھ تمام ہندوستانی زبانوں کے اثرات قبول کیے ہیں اور ان پر اثر بھی ڈالا ہے۔

بین المذاہب ہم آہنگی فاؤنڈیشن کے صدر ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد نے کہا کہ اردو پیدائشی اعتبار سے ایک شمولیتی زبان ہے، لہٰذا ہمیں اس حوالے سے پھیلائے گئے اسٹیریوٹائپ سے باہر نکلنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ کونسل کی مجوزہ کانفرنس اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہے البتہ یہ کوشش کرنی ہوگی کہ کانفرنس کے مقالات ماضی پرستانہ ہونے کے بجائے حال اور مستقبل پسندی پر مبنی ہوں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ سرکار کی طرف سے اردو زبان کے فروغ کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، بس ہمیں اپنے فرائض کی انجام دہی میں ایمان داری سے کام لینا ہوگا۔ مولانا آزاد چیئر 'مانو' کے پروفیسر امتیاز حسنین نے کہا کہ اس کانفرنس میں ہندوستان کی شیڈولڈ زبانوں کے ساتھ علاقائی وقبائلی ہندوستانی زبانوں سے اردو کے رشتے بھی زیر بحث آنے چاہئیں، تبھی ہم کانفرنس کے اہداف تک پہنچ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق یونیورسٹی، کرنول کے سابق وائس چانسلر پروفیسر مظفر علی شہ میری نے اردو میں مختلف عالمی وقومی زبانوں کے تراجم کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا کہ اس کانفرنس میں اس حوالے سے خصوصی سیشن ہونا چاہیے تاکہ اب تک دنیا بھر کی زبانوں سے اردو میں کیے گئے تراجم کی جھلک اور ان زبانوں سے اردو کا رشتہ آشکار ہو سکے۔

سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر مشتاق لون نے کہا کہ اردو کے روشن مستقبل کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسے نئی نسل اور Gen Z میں منتقل کریں، ساتھ ہی اس زبان کو مستقبل کی علمی ضرورتوں کے مطابق بنانا ہوگا تبھی اس کی افادیت قائم رہ سکے گی۔ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر مشتاق عالم قادری نے کہا کہ اس کانفرنس میں ایسے موضوعات ونکات زیر بحث آنے چاہئیں جن کی روشنی میں ہم اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے مابین روابط کو جان اور سمجھ سکیں۔ پروفیسر قطب الدین (جواہر لال نہرو یونیورسٹی) نے خصوصاً عرب دنیا میں اردو کی مقبولیت و شہرت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس وقت متعدد عرب ممالک کی یونیورسٹیز میں اردو کے شعبے قائم ہیں۔ اس مجوزہ کانفرنس میں اردو کے قومی و عالمی زبانوں سے رشتوں کو ہائی لائٹ کرنے کے ساتھ اس کا ایک خاص ہدف اردو کو گھر گھر پہنچانے کا ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر شمس اقبال کے اظہار تشکر کے ساتھ میٹنگ کا اختتام عمل میں آیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 27 اکتوبر 2025

30 اکتوبر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں فاصلاتی تعلیم سے متعلق کمیٹی کی میٹنگ ہوئی جس میں یک سالہ اردو ڈپلومہ، یک سالہ عربی سرٹیفکیٹ، دو سالہ عربی ڈپلومہ اور یک سالہ فارسی سرٹیفکیٹ کورسز کے لیے نئے سنٹرز کھولنے کے حوالے سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور وخوض کیا گیا۔

اس میٹنگ کی صدارت ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ (سابق پروفیسر سی آئی آئی ایل) نے کی۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شمس اقبال، پروفیسر جسیم احمد (اعزازی ڈائریکٹر اے پی ڈی یو ایم ٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ)، پروفیسر عارفہ بشریٰ (آن لائن، سابق پروفیسر کشمیر یونیورسٹی، کشمیر)، پروفیسر محمد فاروق انصاری (صدر شعبہ اردو، این سی ای آر ٹی)، پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی (صدر شعبہ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)، پروفیسر محمد احسن (ریجنل ڈائریکٹر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، بھوپال)، ڈاکٹر سید مشیر عالم (سابق سکریٹری اڈیشا اردو اکیڈمی)، مولانا مطیع الرحمٰن بن عبدالمتین (آن لائن، چیرمین توحید ایجوکیشنل ٹرسٹ، کشن گنج، بہار)، جناب محمد شہزاد (چیف سب ایڈیٹر ہندوستان سماچار ملٹی لینگول نیوز ایجنسی)، ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر، ڈسٹنس ایجوکیشن)، جاوید اقبال (ٹیکنیکل اسسٹنٹ)، ڈاکٹر شاداب شمیم (پروجیکٹ اسسٹنٹ) وغیرہ موجود رہے۔

شارجہ بین الاقوامی کتاب میلہ 2025 کے موقع پر انڈیا نیشنل اسٹینڈ کا افتتاح عزت مآب قونصل جنرل آف انڈیا جناب ستیش کمار سیون کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقع پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال اور نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کے چیئر مین پروفیسر ملند سدھاکر مراٹھے وغیرہ موجود رہے۔

دنیا کے سب سے بڑے کتاب میلے میں قومی اُردو کونسل کی نمائندگی

فرینکفرٹ (جرمنی) کے پانچ روزہ کتاب میلے میں قومی اردو کونسل نے شرکت کی۔ فرینکفرٹ میں انڈین قونصل جنرل محترمہ سُچیتا کشور، این بی ٹی کے چیئر مین پروفیسر ملند سدھاکر مراٹھے اور آئی سی ایس ایس آر کے ممبر سکریٹری و سابق ڈائریکٹر قومی اردو کونسل پروفیسر دھننجے سنگھ کونسل کے اسٹال پر کتابوں کا معائنہ کرتے ہوئے دیکھے جاسکتے ہیں۔

قومی یوم یکجہتی (بہ موقع یوم پیدائش سردار ولبھ بھائی پٹیل) کے موقعے پر قومی اردو کونسل میں ملکی اتحاد و سلامتی کو قائم رکھنے اور استحکام بخشنے کا اجتماعی عہد لیا گیا۔

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دهلی

جشنِ چراغاں

نئی دهلی: ادب قوم کی روح ہے، جو مکالمہ، ہم آہنگی

اور قومی شعور کو سمت دیتا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہے کہ وہ عوام میں 'قوم پہلے' کے جذبے کو ہمیشہ بیدار رکھیں۔ ان خیالات کا اظہار راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے رہنما اندریش کمار نے آئیڈیا کمیونی کیشنز کی سلور جبلی تقریب اور جشن چراغاں کے دسویں ایڈیشن کے موقعے پر بطور مہمان خصوصی اپنے خطاب میں کیا۔ تقریب کی صدارت سینئر رکن پارلیمنٹ جگدمبیکا پال نے کی۔ انھوں نے کہا کہ جشن چراغاں محض ایک مشاعرہ نہیں بلکہ مختلف زبانوں، ثقافتوں اور روایات کا حسین سنگم ہے۔ انھوں نے کہا کہ مشترکہ وراثت اور قومی یکجہتی کو مستحکم کرنے میں ایسے پروگرام اہم کردار ادا کرتے ہیں اور آئیڈیا کمیونی کیشنز گزشتہ پچیس برسوں سے یہ فریضہ بخوبی انجام دے رہا ہے۔ پروفیسر امت کمار سنگھ نے کہا کہ ہندوستان کی ثقافتی اور لسانی وراثت کو نئی نسل تک پہنچانا ہم سب کی ذمے داری ہے، اسی لیے غیر نصابی سرگرمیوں میں اس نوعیت کے پروگراموں کو ترجیح دی جانی چاہیے۔ پروفیسر درشن پانڈے نے استقبالیہ خطاب پیش کیا، جب کہ آئیڈیا کے صدر گجانند پرساد شرما نے اظہارِ تشکر کیا۔ نظامت ڈاکٹر گوروِیندر سنگھ بانگا نے کی۔ تقریب میں بطورِ مہمانِ خصوصی شاعر پرتاپ سومتشی اور عقیل بخش شریک ہوئے۔ اردو اکادمی دہلی، ہندی اکادمی دہلی اور کاویانجلی کے اشتراک سے منعقد اس ادبی محفل میں اردو، ہندی، بھوجپوری اور پنجابی کے ممتاز ادبا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اکتوبر 2025

مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی عربی تصنیفات کی روشنی میں

نئی دهلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ عربی

میں 'مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اپنی عربی تصنیفات کی روشنی میں' کے عنوان سے ایک توسیعی خطبہ منعقد ہوا۔ پروگرام کے آغاز میں صدر شعبۂ عربی پروفیسر محمد قطب الدین نے تمام مہمانوں اور حاضرین کا استقبال کیا، جب کہ پروفیسر مجیب الرحمٰن نے پروفیسر محسن عثمانی ندوی کا تعارف کرایا۔ پروفیسر محسن عثمانی نے اپنے کلیدی خطبہ میں کہا کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے بچپن میں ہی ادیبوں کی کتابوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، آپ کی زندگی کی ایک اہم خوبی استغنا تھی جو آپ کو دوسروں سے ممتاز بناتی ہے۔ آپ ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے اور اس کے لیے آپ نے پیام انسانیت کی تحریک چلائی۔ عالم عرب میں اقبال کا تعارف آپ نے جس انداز میں پیش کرایا ہے اس کی مثال کمیاب ہے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر زبیر احمد فاروقی نے شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ مولانا علی میاں مختلف الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ پروفیسر شوبھا سیواسانکرن نے حاضرین کی ایک بڑی تعداد اور پروگرام کی کامیابی پر شعبۂ عربی کو مبارکباد پیش کی۔ اس موقعے پر یونیورسٹی کے مختلف ثقافتی مقابلوں میں کامیاب طلبہ کو شعبہ کی جانب سے انعامات سے بھی نوازا گیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر زرنگار نے کی۔ پروفیسر اشفاق احمد نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 اکتوبر 2025

علمی تحقیق میں دیانت اور اخلاقی اصول کی اہمیت وافادیت

نئی دهلی: علمی دیانت درحقیقت وہ فکری امانت ہے جو محقق کے کردار اور اس کی تحقیق وتصنیف دونوں کو معتبر بناتی ہے، کیونکہ تحقیق کا اصل مقصد محض علمی مواد جمع کرنا نہیں، بلکہ اخلاقی ذمے داری کے ساتھ نئی فکری راہیں متعین کرنا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر سفیان احمد، نائب لائبریرین، ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے بزم تحقیق کے زیر اہتمام

شعبہ اسلامک اسٹڈیز میں منعقد دوسرے لیکچر بہ عنوان 'علمی تحقیق میں دیانت اور اخلاقی اصول کی اہمیت وافادیت' میں کیا۔ پروفیسر اقتدار محمد خان، صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز اور ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز نے مہمان مقرر کا استقبال کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اس نوعیت کے پروگرام ریسرچ اسکالرز میں تحقیق کے معیار کو بلند کرنے اور ان میں علمی شعور پیدا کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوں گے۔ ڈاکٹر محمد خالد خان، مشیر، بزم تحقیق نے کہا کہ اس بزم نے ابتدا سے ہی علمی مکالمے اور فکری مباحث کے فروغ میں کلیدی کردار نبھایا ہے۔ جناب جنید حارث، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز نے پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ تحقیق کا اصل مقصد علم کے حصول کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار کی پاسداری اور انسانی فلاح کے اصولوں کی ترویج ہے۔ نظامت کے فرائض ملک محمود نے انجام دیے۔ آخر میں سوال وجواب کا سیشن بھی ہوا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 16 اکتوبر 2025

اردو صحافت: امکانات اور چیلنجز

نئی دہلی: معروف صحافی آنجہانی جی ڈی چندن کے 103 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام 'اردو صحافت: امکانات اور چیلنجز' کے عنوان سے ایک روزہ سمینار منعقد کیا گیا جس کی صدارت کرتے ہوئے ممتاز ادیب ڈاکٹر جی آر کنول نے کہا کہ صحافت ایک غیر محفوظ پیشہ ہے لیکن اردو صحافی اپنے حوصلے اور جذبے سے اردو صحافت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اردو بولنا دراصل محبت کا اظہار ہے، مگر افسوس کہ قارئین اردو پڑھنے سے گریزاں ہیں۔ مہمان خصوصی شیخ منظور احمد نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو اخبارات کے بند ہونے کی بڑی وجہ اشتہارات کی کمی اور قارئین کی کم ہوتی تعداد ہے۔ اس موقعے پر معروف صحافی اور کالم نگار معصوم مرادآبادی نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو صحافت کا ترقی پسند نقطۂ نظر ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جہاں اردو زبان کی ترقی رک جاتی ہے، وہاں اردو صحافت بھی متاثر ہوتی ہے۔ نیا قاری پیدا نہ ہونا ایک سنگین مسئلہ ہے۔ سمینار میں خطاب کرتے ہوئے معروف صحافی سہیل انجم نے کہا کہ اردو اخبارات نے ہمیشہ حب الوطنی، قومی اتحاد اور فکری بیداری کو فروغ دیا ہے۔ سینئر صحافی عبدالسلام عاصم نے اپنے مقالے میں جی ڈی چندن کی کتاب اور اردو صحافت کی تاریخی جہتوں پر روشنی ڈالی، وہیں خاتون صحافی ڈاکٹر وسیم راشد نے 'اردو صحافت میں خواتین کا کردار' کے موضوع پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ خواتین نے اردو صحافت میں تابناک خدمات انجام دی ہیں۔ اس موقعے پر اردو صحافت میں نمایاں خدمات انجام دینے والے مختلف صحافیوں، نامہ نگاروں اور فوٹو گرافروں کو مومنٹوز پیش کیے گئے۔ ان میں فرزان قریشی (انقلاب)، محمد یامین، اظہار الحسن (راشٹریہ سہارا)، انجم جعفری (قومی بھارت)، شمس الہدیٰ (میزائل ایکسپریس)، نوازش مہدی (ڈی ڈی نیوز)، شعیب رضا فاطمی (ہمارا سماج)، محمد ایاز (سیاسی تقدیر)، محمد طیب (صحافت)، محمد علی (جرنومر) اور معین احمد خان (فوٹوگرافر) کے نام شامل ہیں۔ سمینار کی نظامت سینئر صحافی ڈاکٹر یامین انصاری نے کی، جب کہ غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے شرکا ومقررین کے لیے شکریہ کی تحریک پیش کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 اکتوبر 2025

گروگرنتھ صاحب: تعارف واہمیت

نئی دہلی: اردو اکادمی دہلی کی جانب سے 'گروگرنتھ صاحب: تعارف واہمیت' کے موضوع پر ایک توسیعی خطبہ منعقد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر ناشر نقوی نے کی جب کہ خطبہ پروفیسر جسپال سنگھ (سابق وائس چانسلر، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ) نے پیش کیا۔ نظامت ڈاکٹر شفیع ایوب نے کی۔ اردو اکادمی کے سکریٹری (لنک آفیسر) ڈاکٹر ایس ایم لعل نے استقبالیہ خطاب کیا۔ پروفیسر جسپال سنگھ نے کہا کہ گروگرنتھ صاحب مذہبی کتابوں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے جس میں بابا فرید کے اقوال کی سب سے زیادہ شمولیت ہے۔ پروفیسر ناشر نقوی نے کہا کہ گروگرنتھ صاحب میں اردو کے تقریباً 65 فیصد الفاظ پائے جاتے ہیں جو ہندوستان کی مشترکہ لسانی روایت کا مظہر ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر اسلم جمشید پوری، شعیب رضا فاطمی، پروفیسر خالد اشرف، حبیب سیفی، شہادت علی نظامی، اعجاز انصاری، ایم آر قاسمی، جاوید نیازی، خان رضوان، طٰہٰ نسیم، حامد علی اختر، لئیق رضوی سمیت اساتذہ وطلبہ کی بڑی تعداد موجود تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 اکتوبر 2025

پروفیسر ابن کنول اردو ادب کا روشن چراغ

نئی دہلی: پروفیسر ابن کنول کی یوم پیدائش کے موقعے پر انجمن شاگردان ابن کنول کے زیر اہتمام ایک روزہ آن لائن سمینار منعقد ہوا جس میں ملک کی مختلف جامعات کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ سمینار کی صدارت پروفیسر فاروق بخشی سابق صدر شعبہ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ پروفیسر ابن کنول نہایت ملنسار، شفیق اور علم دوست انسان تھے، ان کی تحریریں اردو دنیا میں ہمیشہ زندہ رہیں گی اور نئی نسل کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گی۔ مہمان خصوصی پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی سابق صدر شعبۂ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ نے کہا کہ ابن کنول ایک ہمہ جہت ادیب اور سدابہار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ تدریس کے ساتھ ساتھ تحقیق وتخلیق کے میدان میں بھی نمایاں مقام

رکھتے تھے۔ پروفیسر محمد کاظم (دہلی یونیورسٹی) نے کہا کہ ان کے تمام علمی و ادبی کام کو یکجا کر کے محفوظ کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ پروفیسر ثوبان سعید (خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی) نے مرحوم کی بذلہ سنجی، شگفتہ مزاجی اور شاگردوں کے ساتھ ان کے محبت بھرے تعلقات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر احمد امتیاز نے کہا کہ ابن کنول جتنے اچھے ادیب تھے، اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ انسان اور استاد تھے۔ ڈاکٹر شفیع ایوب نے ان کے انتقال کو اردو ادب کا ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا۔ ڈاکٹر محمد اکمل نے کہا کہ انجمن شاگردان ابن کنول کا یہ پروگرام استاد کے ساتھ عقیدت و محبت کا مظہر ہے جو ان کی تربیت و کردار کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر وصی احمد اعظم انصاری نے ان کے افسانوں میں موجود احتجاجی رنگ پر گفتگو کی، جب کہ ڈاکٹر شاداب شمیم نے 'پروفیسر ابن کنول: اردو ادب کا روشن چراغ' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر ابن کنول کی صاحب زادی ڈاکٹر زیانہ ناصر نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔ نظامت ڈاکٹر عزیر اسرائیل نے کی اور شکریے کی رسم ڈاکٹر اکمل شاداب نے کی۔ اس آن لائن ادبی سمینار میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی، جے این یو، مانو اور مظہر الحق یونیورسٹی کے سو سے زائد اسکالرز اور طلبہ و طالبات شریک ہوئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اکتوبر 2025

منشی نول کشور یادگاری خطبہ

نئی دھلی: ڈرامے کی داغ بیل دراصل آفرینش آدم سے ہی پڑ چکی تھی۔ خدا، عزازیل، آدم اور فرشتے

اس کے مرکزی کردار تھے۔ وہاں مکالمہ بھی تھا، کشمکش بھی تھی، ابتدا، ارتقا اور انجام بھی تھا۔ یہی عمل اور ردِ عمل ڈرامے کی اصل روح ہے۔ ڈرامہ صرف حرف و صورت کا میڈیم نہیں، بلکہ خموشی کے وسیلے سے ڈرامہ زیادہ موثر پیامبری کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس ترسیل کے لیے تمام بصری، سمعی، صوتی، لونی، حرکی اور غیر ملفوظی وسائل موجود ہیں۔ ہندوستان اور یونان ڈرامے کے دو قدیم ترین گہوارے ہیں۔ اردو ڈرامے کے ارتقائی سفر میں لکھنؤ، کولکاتا، ممبئی اور دہلی کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈرامے نے ہماری تاریخ، تہذیب، سیاست و معاشرت اور ادب و ثقافت کو ہمہ جہت شعور و آگہی سے ثروت مند کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے 105 ویں یوم تاسیس کے موقعے پر شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقدہ منشی نول کشور یادگاری خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے دہلی یونیورسٹی کے استاذ پروفیسر محمد کاظم نے کیا۔ اس خطبے کے صدر پروفیسر کوثر مظہری نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ پروفیسر محمد کاظم ڈرامے کے محقق اور ناقد ہی نہیں بلکہ ان کا تعلق اسٹیج ڈرامے کی ہدایت کاری اور اداکاری سے بھی ہے۔ انھوں نے پروفیسر محمد کاظم کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ خطبہ نہایت فکر انگیز اور بلیغ تھا۔ انھوں نے اس مسئلے پر تشویش کا بھی اظہار کیا کہ آج کل اردو میں اول تو ڈرامے بہت کم لکھے جا رہے ہیں اور جو کچھ لکھے بھی جا رہے ہیں، ان کی زبان اس قدر مستحکم نہیں ہے جو ہمارے اردو ڈراموں کی شناخت رہی ہے۔ نظامت کے فرائض اس خطبے کے کنوینر پروفیسر ندیم احمد نے انجام دیتے ہوئے منشی نول کشور کی حیات و خدمات پر مفصل روشنی ڈالی۔ نیز مہمان خطیب پروفیسر کاظم کے علمی و ادبی کارناموں کا تعارف بھی پیش کیا۔ خطبے کا اختتام پروفیسر عمران احمد عندلیب کے اظہار تشکر پر ہوا۔ اس موقعے پر شعبۂ اردو کے تمام اساتذہ اور طلبہ و طالبات موجود رہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 14 اکتوبر 2025

اترپردیش

جدید فارسی ادب پر ایک اجمالی نظر

نئی دھلی: شعبۂ فارسی ذاکر حسین دہلی کالج (دہلی یونیورسٹی) میں انجمن فارسی کے زیر اہتمام اور کالج کے پرنسپل پروفیسر نریندر سنگھ کی سرپرستی میں 'جدید فارسی ادب پر ایک اجمالی نظر' کے عنوان سے ایک پر معنی اور بامقصد علمی سیشن کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر راجندر کمار کو بطور کلیدی مقرر مدعو کیا گیا۔ پروگرام کے آغاز میں شعبے کے سینئر استاد پروفیسر جمیل الرحمن خان نے مہمانِ خصوصی کا جامع تعارف پیش کیا۔ انھوں نے پروفیسر راجندر کمار کی علمی خدمات، تحقیقی کارناموں اور بحیثیت صدر شعبہ ان کے اہم علمی و انتظامی کارہائے نمایاں کا ذکر کیا، جس سے حاضرین کو مہمان مقرر کی شخصیت کے ہمہ جہت پہلوؤں سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ پروفیسر راجندر کمار نے اپنے نہایت معلوماتی اور فکر انگیز خطاب میں یورپی ادب کے تناظر میں جدید فارسی ادب کے ارتقائی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے دونوں کے مابین فکری و فنی مماثلتوں کو اجاگر کیا اور واضح کیا کہ فارسی ادب اپنی معنویت اور جمالیاتی سطح پر کسی بھی عالمی ادب کے ہم پلہ ہے۔ پروگرام کی صدارت شعبۂ فارسی کے سابق استاد ڈاکٹر شمیم الحق صدیقی نے کی۔ اپنے صدارتی کلمات میں انھوں نے فارسی زبان و ادب کی ہمہ گیر افادیت اور اس کی علمی و تہذیبی اہمیت پر روشنی ڈالی اور طلبہ کو اس میدان میں مزید تحقیق و مطالعے کی ترغیب دی۔ اس علمی نشست کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر ملک سلیم جاوید نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیے جب کہ آخر میں ڈاکٹر ابرار علی شاہ نے تمام مہمان گرامی، مقررین اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اکتوبر 2025

یک روزہ اردو ورکشاپ

مظفر نگر: اردو بیداری فورم کے زیر اہتمام ایک روزہ اردو ورکشاپ فلاح دارین اسلامیہ انٹر کالج بلاسپور میں منعقد کی گئی جس کی صدارت مولانا ممشاد قاسمی اور نظامت جناب محمد ارشاد خازن اردو بیداری فورم مظفر نگر نے کی۔ ناظم ورکشاپ محمد شاہ ویز نے تمام جج حضرات کا تعارف کراتے ہوئے ورکشاپ کے اغراض پر روشنی ڈالی۔ اردو بیداری فورم مظفر نگر کے صدر شہزاد علی نے ورکشاپ کی تفصیلات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ یہ ورکشاپ درجہ نو سے ڈگری کلاس تک زیر تعلیم طلبہ کے لیے منعقد کی گئی ہے جو بچے اردو زبان کو بطور ایک مضمون پڑھتے ہیں، ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کی غرض سے اردو بیداری فورم مختلف پروگرام کا اہتمام کرتی ہے اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ ورکشاپ بھی ہے۔ ورکشاپ میں تین گروپ بنائے گئے تھے ایک بچے کو 3-2 منٹ کا وقت اپنی گفتگو کو مکمل کرنے کو

دیا گیا۔ پہلا گروپ درجہ 10-9 کے طلبہ وطالبات کے لیے تھا جس کا موضوع علامہ اقبال بحیثیت شاعر اور مربی رکھا گیا۔ دوسرا گروپ درجہ 11 کا موضوع 'الم مظفر نگری حیات و خدمات' اور 12 کا موضوع 'علامہ اقبال کا تصور شاہین' تیسرا گروپ گریجویشن کا موضوع 'بابائے اردو مولوی ڈاکٹر عبدالحق حیات و خدمات' تھا۔ عنوان پر گفتگو مکمل کرنے کے بعد جج حضرات نے طلبہ وطالبات کی کارکردگی پر تبصرہ پیش کیا۔ مہمان مکرم عرفان علی اساروی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ وقت میں اردو ورکشاپ کا اہتمام کیا جانا وقت کی ضرورت ہے۔ مظفر نگر میں یہ پہلی کوشش اردو بیداری فورم کی جانب سے ہوئی۔ قاضی تنویر عالم لکچرر اسلامیہ انٹر کالج مظفر نگر نے بچوں کو اردو سبجیکٹ کے ساتھ آگے بڑھنے کی تلقین کی۔ اعلیٰ تعلیم، سول سروس، صحافت، ٹیکنیکل کورسز میں مہارت حاصل کریں تو ان شاء اللہ ہندی انگریزی زبان کی طرح اردو کے ذریعے بھی ضرور ترقی کریں گے۔ حاجی اوصاف احمد انصاری جنرل سکریٹری اردو بیداری فورم و محمد چودھری نائب منیجر ایف ڈی انٹرکال نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں صدارتی خطاب میں مولانا ممشا قاسمی نے تنظیم کے اردو کے فروغ کے لیے کی جارہی کاوشوں کو وقت کی ضرورت بتاتے ہوئے ہر اسکول و کالج کو ایسے پروگرام کرائے جانے کی اپیل کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 8 اکتوبر 2025

تعلیم اور ادب میں سرسید احمد خاں کی خدمات

شاہجہاں پور: جی ایف کالج کے شعبہ اردو نے سرسید احمد خان کے یوم پیدائش کے موقعے پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا، جس کا موضوع تھا 'تعلیم اور ادب میں سرسید احمد خان کی خدمات'۔ اس موقعے پر طلبا سے خطاب کرتے ہوئے کالج کے پرنسپل پروفیسر محسن حسن خان نے کہا کہ سرسید احمد خان نے بنیادی طور پر لوگوں کو روایتی تعلیم کے بجائے جدید تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ معاشرے کی ترقی کے لیے جدید تعلیم ضروری ہے۔ شعبہ اردو کے سربراہ ڈاکٹر تجمل حسین نے کہا کہ سرسید خان نے اردو زبان کی مضبوطی میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے ایک سائنسی معاشرہ قائم کیا تا کہ مغربی علم و سائنس کا ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کیا جاسکے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر کوثر جمال، ڈاکٹر نسیم احمد، ڈاکٹر ارم جہاں، ڈاکٹر غلام اشرف قادری، ڈاکٹر سعید احمد اور ریسرچ اسٹوڈنٹس شمع فاطمہ اسد، محمد ظفر، آمنہ، عائشہ، روشن، عابدہ خاتون، غزالہ، محمد آفتاب، شاداب صبور، طاؤس، طلحہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کی نظامت فردین نے کی۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 18 اکتوبر 2025

احمد فراز کی غزلیہ شاعری

میرٹھ: احمد فراز کی شاعری رومانیت، احتجاج اور امن کی شاعری ہے۔ احمد فراز نے اپنی پوری شاعری میں امن پھیلانے کی کوشش کی ساتھ ہی انھوں نے کسی بھی ازم کا انکار کیا اور شاعری کو خالص شاعری رہنے دینے پر اصرار کیا۔ یہ الفاظ تھے معروف ناقد پروفیسر صغیر افراہیم کے جو آیوسا اور شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقدہ 'احمد فراز کی غزلیہ شاعری' موضوع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اور صدارت کے فرائض معروف ادیب ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ استقبالیہ کلمات اسماعیل نیشنل پی جی کالج کی طالبہ اریبہ نے اور نظامت کے فرائض شعبے کی ریسرچ اسکالر عظمیٰ سحر نے انجام دیے جب کہ شکریے کی رسم محمد ندیم نے ادا کی۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ احمد فراز ایک رومانی شاعر تھے، ساتھ ہی انھوں نے اس عہد کے مسائل کو بھی اپنی شاعری کے ذریعے قلم بند کیا ہے۔ پروفیسر ریاض احمد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ احمد فراز کی شاعری یوں تو رومان کی شاعری ہے لیکن اس میں احتجاجی رنگ ملتا ہے۔ ڈاکٹر عفت ذکیہ نے کہا کہ احمد فراز کی شاعری اپنی نوعیت کی منفرد شاعری ہے۔ انھوں نے پوری دنیا کے انسانوں کو شاعری کے ذریعے محبت کا پیغام دیا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 24 اکتوبر 2025

بہار

یوم سرسید

گیا: سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تعلیم کو قومی بقا اور ترقی کا واحد ذریعہ قرار دیا۔ ان کی تعلیمی تحریک آج بھی ہمارے لیے اندھیرے میں ایک چراغ کی مانند ہے۔ یہ باتیں ایس ایس کالج جہان آباد کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر محمد عمران ارشد نے یوم سرسید کے موقعے پر گیا کالج کے شعبۂ اردو میں منعقدہ ایک تقریب میں بطور مہمان خصوصی شرکت کرتے ہوئے کہیں۔ اس موقعے پر طلبہ وطالبات نے بھی سرسید کی زندگی، خدمات اور ان کے اصلاحی کارناموں پر اپنے تاثرات پیش کیے جن میں ماہرہ خاتون، چاندنی خانم، نوشابہ پروین، عظمیٰ پروین، یاسر امین، تبسم بے بی، آسیہ پروین، چاندنی خانم، کشفی فاطمہ، عظمت درخشاں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ پروگرام کی نظامت شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر محمد منہاج الدین نے خوش اسلوبی سے انجام دی اور سرسید کی حیات و خدمات پر مختصر گفتگو کی۔ آخر میں صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر عبدالحی نے مہمان مقرر اور حاضرین محفل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ سرسید کا پیغام صرف ایک شخص یا زمانے تک محدود نہیں بلکہ ہر عہد کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے اور آج بھی ان کے افکار ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 18 اکتوبر 2025

اعزاز و اکرام

شکیل اعظمی

دہلی: ملک کے مشہور و معروف شاعر، ادیب اور نغمہ نگار جناب شکیل اعظمی کو رامائن اور جنگل پر مشتمل ان کے

مجموعہ کلام 'بنواس' کے لیے سات ستارہ ہوٹل لی۔میریڈین میں دینک جاگرن گروپ کی طرف سے 10 اکتوبر کو بھارت کے وزیر داخلہ محترم امیت شاہ جی کے ہاتھوں 'بیسٹ سیلر ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ شکیل اعظمی کے اس مجموعہ کا ہندی ایڈیشن 2023 میں شائع ہوا تھا جو اشاعت کے تیسرے سال میں بھی ہندی کی سب سے زیادہ فروخت ہونے والی 10 ٹاپ کتابوں میں شامل ہے۔ اردو میں یہ مجموعہ 2020 میں منظر عام پر آیا تھا۔ اردو ادب میں اس کی مقبولیت کا یہ عالم رہا کہ اس

پر مضامین کی بھی کتاب آ چکی ہے جسے پروفیسر کوثر مظہری نے مرتب کیا ہے اور جس میں ہندوپاک کے اہم لکھنے والوں کے مضامین شامل ہیں۔

شکیل اعظمی کا تعلق اترپردیش کے ضلع اعظم گڑھ سے ہے لیکن وہ پچھلے 25 سالوں سے ممبئی میں مقیم ہیں۔ اردو میں اب تک ان کے آٹھ مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ شکیل اعظمی کو ادب اور فلم کے لیے 'بیسٹ سیلر ایوارڈ' کے علاوہ گجرات گورو ایوارڈ، کیفی اعظمی ایوارڈ، ایس ڈبلیو اے ایوارڈ، جھارکھنڈ نیشنل فلم فیسٹیول ایوارڈ اور ایف او آئی او ایوارڈ سمیت تقریباً 25 ایوارڈ مل چکے ہیں۔ ویب سیریز، ٹی وی سیریل پرائیویٹ البم متعدد سنگلس کے ساتھ ان کی خاص فلمیں ہیں ملک، آرٹیکل 15، تھپڑ، ضد، شادی میں ضرور آنا، مدہوشی، زہر، نظر، 1920 ایول ریٹرنس، 1921 وغیرہ۔

مرسلہ: ف س اعجاز، کولکاتا، 15 اکتوبر 2025

رسم اجرا

قلم گوید

نگینہ: عالم دین، آزاد صحافی، معروف ادیب اور کہنہ مشق شاعر عبدالغفار صدیقی (دانش نورپوری) کے

مضامین کے مجموعے 'قلم گوید' کی رسم رونمائی کی تقریب راقم منزل نگینہ میں منعقد ہوئی، جس کا اہتمام ایجوکیشنل اینڈ سوشل ٹرسٹ بجنور نے کیا تھا۔ رسم اجرا کی تقریب میں شہر کے معروف شعرا اور اہل دانش نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شیخ نگینوی نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ دانش نورپوری کے 78 منتخب مضامین کا یہ مجموعہ مختلف اخبارات میں شائع ہوا ہے جو کہ اہم قومی اور بین الاقوامی مسائل کو مثبت نقطۂ نظر سے پیش کرتے ہیں۔ ان مضامین کا تعلق ملی، سماجی اور ملکی و عالمی مسائل سے ہے۔ ماہر تعلیم پرویز عادل نے کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مصنف نے بڑی دلیری سے قلم اٹھایا ہے اور اپنی تحریروں میں معاشرتی برائیوں سے نمٹنے کے لیے قابل عمل تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ دہلی سے تشریف لائے ہوئے ادیب و شاعر ناظر وحید نے دانش نورپوری کو مبارکباد دی اور ان سے خواہش کی کہ وہ قومی مفاد اور عوامی خدمت کے لیے اپنی توانا اور مثبت تحریر کا استعمال جاری رکھیں اور ان تحریروں کو عوامی مفاد کی خاطر ہندی زبان میں بھی منتقل کریں۔ ڈاکٹر احتشام نعمانی تشنہ نے تبصرہ کیا کہ عبدالغفار صدیقی کے مضامین ہندوستان اور بیرون ملک کے سینکڑوں اخبارات اور سوشل میڈیا سائٹس پر شائع ہوتے رہے ہیں، جو بجنور ضلع کے لیے فخر کی بات ہے۔ مولانا محمد عرفان فلاحی نے کہا ان مضامین کی بڑی خوبی بیباکانہ اظہار بیان ہے جو بات بھی کہی گئی ہے وہ ڈنکے کی چوٹ پر کہی گئی ہے، اب ایسے صحافی سماج میں کم ہوتے جارہے ہیں۔ صاحب عبدالغفار صدیقی نے مبصرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گزارش کی کہ وہ کتاب پڑھنے کے بعد ضروری مشوروں سے نوازیں اور قابل توجہ امور کی نشاندہی فرمائیں تاکہ دوسرے ایڈیشن میں اصلاح کی جاسکے۔ تقریب رونمائی کی صدارت ڈاکٹر محمد داؤد ملتانی نورنگینوی نے کی۔ اس موقعے پر شعرا نے اپنا اپنا کلام بھی پیش کیا۔ آخر میں ناظم پروگرام شیخ نگینوی نے مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' 14 اکتوبر 2025

ڈاکٹر محمد منظور عالم: امپاورنگ دی مارجنلائزڈ

نئی دهلی: ڈاکٹر منظور عالم کی شخصیت ایک تحریک ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گی اور ان کی حیات وخدمات پر لکھی گئی کتاب آئندہ بھی نئی نسل کے لیے مشعل راہ ہوگی۔ ان خیالات کا اظہار انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کے بانی ڈاکٹر منظور عالم کی حیات وخدمات پر مبنی کتاب کی رسم اجرا کے موقعے پر ملیشیا کے وزیراعظم ڈاکٹر انور ابراہیم نے اپنے پیغام میں کیا۔ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹس (آئی آئی آئی ٹی) امریکہ کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عمر حسن کسولے نے کہا کہ علم کو تبدیلی کا محرک بنانا ڈاکٹر منظور عالم کا گرانقدر کارنامہ ہے۔ اس سے قبل صحافی اے یو آصف کی کتاب 'ڈاکٹر محمد منظور عالم: امپاورنگ دی مارجنلائزڈ' کی رسم اجرا سابق مرکزی وزیر اور انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سلمان خورشید اور دیگر معززین کے ہاتھوں ہوئی۔ اس موقعے پر سلمان خورشید نے کہا کہ ڈاکٹر منظور عالم کی شخصیت ہم سب کے لیے روشنی کا ایک مینار ہے۔ پروفیسر اپیتابھ کنڈو نے سچر کمیٹی کی رپورٹ اور اس سے قبل و بعد کی یادوں کو شیئر کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر عالم ایک کمیونٹی کے لیے فکرمند نہیں تھے، وہ ہمیشہ ملک وقوم کے مفادات میں بے چین رہے جب کہ چانکیہ لا یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر فیضان مصطفیٰ نے کہا کہ آئی او ایس نے نالج کریشن کا جو کام کیا وہ اپنی مثال آپ ہے، انھوں نے کہا کہ آئی او ایس کو ایک ریسرچ یونیورسٹی ہونا چاہیے۔ اس موقعے پر آئی آئی سی او کویت کے چیئرمین ڈاکٹر عبداللہ آل معتوق نے کہا کہ ڈاکٹر منظور عالم شعور و دانش کی آواز کا نام ہے جب کہ سابق الیکشن کمشنر آف انڈیا اور مشہور مصنف و تجزیہ نگار ڈاکٹر ایس وائی قریشی نے کہا کہ ہندوستان میں معیاری تحقیق کی بہت کمی رہی ہے اور ڈاکٹر صاحب اس کام کے محرک اول ہیں۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ڈاکٹر منظور عالم نے تھنک ٹینک کے تصور کو عملی طور پر پیش کیا۔ اس کے علاوہ جن مقررین نے اظہار خیال کیا ان میں صحافی و سماجی کارکن جان دیال، یوگ گرو شری شری روی شنکر، سابق رکن پارلیمنٹ احمد حسن عمران، سابق رکن پارلیمنٹ اور صحافی م افضل، سری لنکا کے مہور دانشور ڈاکٹر اے جے ایم ظہیر شامل تھے۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر زیڈ ایم خان نے پیش کیا جب کہ خطبۂ صدارت آئی او ایس کے چیئرمین پروفیسر محمد افضل نے پیش کیا۔ آئی او ایس کی وائس چیئرپرسن پروفیسر حسینہ حاشیہ نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 اکتوبر 2025

نئی دنیا کی نئی صحافت

نئی دهلی: اردو صحافت نے ملک کی تعمیر و ترقی میں ہمیشہ اہم رول ادا کیا ہے اور اس کا کردار سیکولر رہا ہے۔

ان خیالات کا اظہار نئی دنیا فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقد 'نئی دنیا کی نئی صحافت' نامی کتاب کی رسم اجرا کی تقریب میں مقررین نے کیا۔ تقریب میں نئی دنیا ادارے سے وابستہ صحافیوں کو اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ اس موقعے پر نئی دنیا کے ایڈیٹر ان چیف اور سابق ممبر پارلیمنٹ شاہد صدیقی نے کہا کہ اس طرح کی تقریب منعقد کرنے کا مقصد اردو صحافت کی بنیادوں کو مضبوط بنانا ہے۔ چونکہ اردو صحافت کی تاریخ میں نئی دنیا کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں کے تربیت یافتہ صحافی آج مختلف میڈیا اداروں میں اہم عہدوں پر فائز ہیں جب کہ کچھ لوگ دیگر شعبوں میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ معروف اسلامی مفکر پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ 'نئی دنیا' کے بند ہونے کا بہت افسوس ہے۔ انھوں نے شاہد صدیقی سے اپیل کی کہ ان کی خواہش ہے کہ نئی دنیا کی اشاعت کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا جائے۔ کرناٹک کے سابق وزیر اور سینئر کانگریس لیڈر روشن بیگ نے اردو صحافت میں شاہد صدیقی کے کردار کو ناقابل فراموش بتایا۔ سینئر صحافی اور کانگریس لیڈر میم افضل نے کہا کہ نئی دنیا کی بڑی خدمت یہ ہے کہ یہاں سے تربیت یافتہ اردو صحافیوں کی بڑی تعداد آج بھی اردو صحافت میں اپنی خدمات انجام دے رہی ہے۔ ڈاکٹر شفیع ایوب نے کہا کہ نئی دنیا کی نئی صفحات کتاب کو اردو صحافت کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ اس موقعے پر بزرگ شاعر متین امروہوی اور اسرار رازی نے نئی دنیا کو وقف اپنی نظمیں سنا کر سامعین کو محظوظ کیا۔ اس کے بعد نئی دنیا سے وابستہ رہے صحافیوں کو 'نئی دنیا' کا ایک یادگاری مومنٹو پیش کیا گیا جن میں سہیل انجم، حقانی القاسمی، ڈاکٹر شفیع ایوب، شفیق الحسن، جمشید عادل علیگ، احمد جاوید، ڈاکٹر منور حسن کمال، اسرار رازی، نفیس الرحمٰن، ماجد علی خان، ممتاز اعظمی، امیر احمد راجہ، سلام الدین خان، آسیہ خان، نفیس عالم، شمیم خان، کلیم انور قاسمی، عالیہ خان، شکیل خان اور دیگر افراد شامل ہیں۔ آخر میں پروگرام کے کنوینر شفیق الحسن نے سبھی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ شاہد صدیقی کی سرپرستی میں نئی دنیا ایک بڑا ادارہ بنا اور یہاں سے بڑے بڑے صحافی وابستہ رہے جنھوں نے یہاں سے جانے کے بعد مختلف اداروں میں اپنی صحافتی خدمات انجام دیں اور آج بھی کئی اہم اخبارات میں مختلف عہدوں پر فائز ہیں۔

روز نامہ 'صحافت' دہلی، 12 اکتوبر 2025

اردو بک ریویو

نئی دهلی: اردو دنیا کا معروف مجلّہ 'اردو بک ریویو' گزشتہ تیس برسوں سے شائع ہو رہا ہے۔ اکتیسواں سال مکمل ہونے کو ہے۔ تازہ شمارہ جولائی تا ستمبر 2025 کا اجرا معروف سینئر صحافی منصور آغا اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے قومی صدر ڈاکٹر سید احمد خاں کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ منصور آغا نے 'اردو بک ریویو' کے تیس سال مکمل ہونے پر نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے اس رسالہ کی دستاویزی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے مزید کہا کہ 'اردو بک ریویو' کے ذریعے نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمی سطح پر اردو کی نمائندگی ہو رہی ہے۔ یہ میری نظر میں اردو زبان و ادب اور تاریخ کی بہت بڑی خدمت ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ 'اردو بک ریویو' کے ایڈیٹر محمد عارف قابل مبارکباد ہیں۔ وہ بڑی مستعدی کے ساتھ تسلسل سے اردو بک ریویو شائع کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر سید احمد خاں نے کہا کہ 'اردو بک ریویو' کے تیس سال مکمل ہونے پر اہل علم کو چاہیے کہ اس کی خدمات سے اردو دنیا کو روشناس کرائیں۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 10 اکتوبر 2025

خواجہ عبدالمنتقم کی متعدد علمی و تحقیقی کتابوں کی رونمائی

نئی دهلی: انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں خواجہ عبدالمنتقم کی متعدد علمی و تحقیقی کتب کی رسم اجرا ایک پروقار تقریب میں عمل میں آئی۔ اس تقریب کا اہتمام ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی نے کیا، جس میں ملک کی معزز شخصیات، ماہرین قانون، دانشوران اور ادبی حلقوں کی نمائندہ شخصیات نے شرکت کی۔ تقریب میں جن کتابوں کا اجرا عمل میں آیا ان میں نمایاں ہیں: بھارتیہ

نیائے سنہتا 2023، (سہ لسانی ایڈیشن) نظائر و تبصروں کے ساتھ اور 'جمہوری ریاست میں پولیس کا کردار'، کا اجرا سابق چیف جسٹس آف انڈیا و سابق چیئرمین این ایچ آر سی جسٹس کے جی بالاکرشنن نے کیا۔ 'سہ لسانی قانون لغت و سہ لسانی بھارت کا آئین (آئین ہند)'، سابق چیف جسٹس پٹنہ ہائی کورٹ جسٹس اقبال انصاری نے جاری کیا۔ 'سر سید احمد خاں، وہ شخصیت جسے مسلمان ہند ہمیشہ یاد کریں گے'، اور 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، بنارس ہندو یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سیکولر کردار'، جنھیں سابق چیف الیکشن کمشنر آف انڈیا ایم وائی قریشی نے پیش کیا۔ 'کاش بھارت کا وبھاجن نہ ہوتا' اور 'قانونی ادب کا درخشاں ستارہ خواجہ عبدالمنتقم'، جس کی مصنفہ ڈاکٹر عطیہ رئیس ہیں کا اجرا معروف سماجی خدمت گار اور وزیر اعلیٰ راجستھان کی اکنامک ٹرانسفارمیشن ایڈوائزری کونسل کے رکن نوید خاں نے کیا۔ پروگرام کی نظامت ہبہ خواجہ نے کی۔ مقررین نے خواجہ عبدالمنتقم کی علمی و ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی کتب نہ صرف قانون و آئین کے طلبہ کے لیے ایک بیش قیمتی سرمایہ ہیں، بلکہ عصری و سماجی مباحث میں بھی رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ ڈاکٹر اشرف علی نے مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ میری کولیگ ڈاکٹر عطیہ رئیس جن کے ساتھ مجھے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں تدریس کی سعادت حاصل رہی ہے، نہ

صرف ایک صاحب علم و صاحب قلم شخصیت ہیں بلکہ ادبی دنیا میں اپنی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت کی بنا پر ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ ان کی تصنیف قانونی ادب کا درخشاں ستارہ خواجہ عبدالمنتقم علمی و ادبی حلقوں میں ایک بیش قیمتی اضافہ ہے۔ اس موقعے پر ایم آر پبلی کیشنز کے روح رواں عبدالصمد بھی خصوصی مبارکباد کے مستحق ہیں جن کی انتھک محنت، علمی ذوق اور اشاعتی خدمات نے اس تقریب کو عملی جامہ پہنایا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 اکتوبر 2025

صدائے جوہر

نئی دہلی: شعبہ اسلامک اسٹڈیز بلاشبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی روح، شناخت اور اس کی فکری اساس کا حقیقی مظہر ہے اور اس کے طلبہ نہ صرف جامعہ کے علمی

ورثے کے امین ہیں، بلکہ اس کے روشن مستقبل کے معمار بھی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار مہمان خصوصی پروفیسر نیلوفر افضل، ڈین اسٹوڈنٹس ویلفیئر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے بزم طلبہ کے زیر اہتمام ایم اے اور بی اے کے نئے طلبہ و طالبات کے لیے منعقد استقبالیہ تقریب میں کیا۔ پروفیسر موصوفہ نے اس موقعے پر بزم طلبہ کے ترجمان 'صدائے جوہر' کے خصوصی شمارے بہ موضوع 'شیوخ الجامعہ کی خدمات' کا اجرا کرتے ہوئے فرمایا کہ اس مجلّہ کا نام ایک ایسی شخصیت، مولانا محمد علی جوہر سے منسوب ہے جس نے برصغیر کی فکری تاریخ پر انمٹ نقوش مرتب کیے ہیں اور ان کی جرأت مندانہ و ایمانی بصیرت آج بھی ہمیں یہ عملی سبق دیتی ہے کہ تعلیم محض علم حاصل کرنے کا نام نہیں، بلکہ ضمیر کی بیداری، کردار سازی اور انسانیت کی خدمت کا نام ہے۔ پروفیسر اقتدار محمد خان، صدر بزم طلبہ و شعبہ اسلامک اسٹڈیز نے فرمایا کہ صدائے جوہر خصوصی شمارہ جامعہ کی فکری تاریخ، علمی میراث اور قائدانہ کا آئینہ دار ہے۔ یہ ایک ایسی فکری دستاویز ہے جو ان شخصیات کے عزم و ایثار، جرأت و بصیرت اور علمی خدمات کے امتزاج کو خراج تحسین پیش کرتی ہے جنھوں نے جامعہ کے وقار کو ہمیشہ قائم و دائم رکھا اور اس کے تشخص کو استحکام بخشا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 24 اکتوبر 2025

مراد سعیدی خصوصی شمارہ

ممبئی: اردو گنگن کے صدر مشیر انصاری کی اطلاع کے مطابق ٹونک راجستھان کی علمی شخصیت مرحوم مراد سعیدی کے فنی کمالات و شخصی اوصاف کے ہمہ جہت پہلوؤں پر سیر حاصل تجزیاتی تذکرات اور تبصرات پر محیط خصوصی شمارہ 'اردو آنگن' ریلیز کر دیا گیا۔ تقریب کی صدارت اختر آزاد نے کی۔ مہمان خصوصی جبل پور سے تشریف لائے ترقی پسند مصنفین مدھیہ پردیش کے صوبائی جنرل سکریٹری اور معروف ماہر تعلیم ترن گہانیوگی تھے۔ مشہور شاعر و دانشور پروفیسر قاسم امام، پروفیسر نور الامین اور اس شمارے کے مدیر اعزازی سید ساجد علی ٹونکی نے مراد سعیدی کی حیات و جہات پر سیر حاصل گفتگو کی۔ پروگرام کی نظامت مشیر انصاری نے کی۔ اس کے بعد مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکیڈمی کے ایوارڈز یافتگان کو 'سند توصیف و اکرام' اردو گنگن سنستھا ممبئی، کمال پبلی کیشن جبل پور کی جانب سے پیش کیا گیا، جس کی نظامت فاروقی سید نے کی۔ مزاحیہ شعری نشست کا بھی اہتمام کیا گیا، جس میں محشر فیض آبادی، توصیف کاتب اور دیگر شعرائے کرام نے مزاحیہ کلام پیش کر سامعین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 اکتوبر 2025

عکس ادب

اورنگ آباد: 'عکس ادب' کے پچاسویں (گولڈن جوبلی)

شمارے کی اشاعت کے موقعے پر منجانب 'عکس ادب' سکندر علی وجد ہال نزد بھڑکل گیٹ، اورنگ آباد حلیم صابر (کولکاتہ) ڈاکٹر احمد معراج (کولکاتہ) اطیب اعجاز (حیدرآباد) رفیق ناگوری (اجین) تابش

(مہاراشٹر) میں مختلف پُروقار تقاریب منعقد کی گئیں۔ اسٹیج پر تشریف فرما تمام مہمانوں کے ہاتھوں (1) عکس ادب سہ ماہی اردو اورنگ آباد (خصوصی گوشہ ڈاکٹر دوست محمد خان) (2) نباتات طب نبویؐ۔ مرہٹواڑہ کے حوالے سے (3) نباتات قرآنی۔ مراٹھواڑہ کے حوالے سے' کا اجرا عمل میں آیا۔ ڈاکٹر یوسف صابر نے بنام ڈاکٹر دوست محمد خان کو توشیحی نظم پیش کی۔ اسی طرح ڈاکٹر ذاکر خان ذاکر کا تخلیق کردہ قصیدہ (بنام دوست محمد خان) ڈاکٹر محمود صدیقی نے پڑھ کر سنایا۔ اس جلسے کی صدارت ڈاکٹر عبدالکریم سالار (جلگاؤں) نے فرمائی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر رفیع الدین ناصر و ڈاکٹر یوسف صابر نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ اس کے بعد ڈاکٹر دوست محمد خان اور یوگندھرا کے چے نے اپنی مترنم آوازوں میں سازندوں کے ساتھ نہایت خوبصورت غزلیں گا کر خوب داد و تحسین حاصل کی۔ محفل غزل سرائی کے بعد ڈاکٹر مخشب مسعود کی صدارت میں افسانچوں کی محفل سجی۔ اس میں صدر محفل ڈاکٹر مخشب مسعود کے علاوہ ڈاکٹر شہباز زرین، ڈاکٹر فردوس فاطمہ، فوزیہ نسرین، ارشد صدیقی، قاضی مجیب الرحمٰن (بیڑ) ڈاکٹر شہاب افسر، ڈاکٹر یوسف صابر اور خالد قریشی (بیڑ) نے اپنے منتخب افسانچے پیش کیے جبکہ نظامت ڈاکٹر یوسف صابر نے کی۔ اس کے بعد حلیم صابر (کولکاتا) کی صدارت میں کل ہند مشاعرے کا آغاز عمل میں آیا۔ مختلف شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ مشاعرے کی نظامت ارشاد ضیا اور صدارت حلیم صابر نے کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر مسرت فردوس کی صدارت میں ایوارڈ فنکشن کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں ڈاکٹر انصاری ابرار، ڈاکٹر وہاب الحق، جمال چشتی، ڈاکٹر شیخ عظیم الدین، شیخ عباس شیخ غفور،

تفضیل (برہان پور) اور عمر خان موسیٰ خان کو ایوارڈز سے نوازا گیا۔ آخر میں ڈاکٹر یوسف صابر کے شکریے پر اس پُروقار پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر رفیع الدین ناصر، صدر شعبۂ بوٹنی، مولانا آزاد کالج آف آرٹس سائنس اینڈ کامرس، ڈاکٹر رفیق زکریا کیمپس اورنگ آباد، 23 اکتوبر 2025

رقصِ انگشت

رانچی: 25 اکتوبر 2025 کو ڈاکٹر محفوظ عالم کی کتاب 'رقصِ انگشت' (انشائیے) اور اس کتاب کا

ہندی ایڈیشن 'دیکھ تماشا انگلی کا' (ہاسیہ-ویتگیہ) کا اجرا ہوا۔ اس تقریب کی صدارت ڈاکٹر آفتاب احمد سابق پروفیسر اردو، بھاگلپور یونیورسٹی، بھاگلپور اور ڈاکٹر ونود کمار، سابق پروفیسر انگریزی، رانچی یونیورسٹی، رانچی نے مشترکہ طور پر کی۔ اس موقعے پر معروف کہانی کار پنکج متر بطور مہمان خصوصی اور ادیب وشاعر ڈاکٹر احسان تابش بطور مہمان اعزازی شریک تھے۔ تقریب میں سہیل سعید، ڈاکٹر عبدالباسط، پنکج جین، شہاب حمزہ، شالینی صہبا، روزنامہ جدید بھارت کے ایڈیٹر مظفر حسن، ڈاکٹر وکیل احمد رضوی اور ڈاکٹر راج شری جینتی نے مذکورہ دونوں کتابوں پر اظہار خیال کیا اور سیر حاصل گفتگو فرمائی۔ تقریب میں اردو- ہندی کے ادبا وشعرا بڑی تعداد میں موجود تھے۔ یاسمین لال نے اظہار تشکر پیش کیا۔

پریس ریلیز: محفوظ عالم، رانچی، 28 اکتوبر 2025

سخن زارِ بنگالہ

کولکاتا: اردو ادب کا نیا ادارہ 'محفل ادب' کے زیراہتمام ایم نصراللہ نصر کی تصنیف اور شکیل انور کی ترتیب کردہ کتاب 'سخن زارِ بنگالہ' کا ڈاکٹر ابوبکر جیلانی کے دست مبارک 26 اکتوبر 2025 کو اجرا ہوا۔ صدارت ظہیر انور نے فرمائی اور نظامت کے فرائض ایم نصراللہ نصر نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ اس پروگرام میں سامعین کی کثیر تعداد بھی موجود رہی۔ سبھی حاضرین کو کتاب کی اعزازی کاپی پیش کی گئی۔

تقریب اجرا کے دوران مقررین نے کتاب اور صاحب کتاب کے تعلق سے بصیرت افروز تقاریر سے سامعین کی معلومات میں اضافہ کیا۔ کتاب کی اہمیت اور افادیت کی باتیں بھی کی گئیں۔ بہت سے مشورے بھی دیے گئے۔ بنگال میں شعری ادب کے معیار ومنہاج پر اس کتاب کے حوالے سے روشنی ڈالی گئی۔ مصنف اور مرتب نے بھی کتاب کے حوالے سے گفتگو کی۔ مشاعرے کا دورانیہ کافی لمبا رہا۔ 30 شعرا نے اپنے خوبصورت اور فکرانگیز کلام سے سامعین کا دل جیت لیا۔

پریس ریلیز، ایم نصراللہ نصر، کولکاتا، 30 اکتوبر 202

'ابجد'

اردیا: سیمانچل کے ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے معروف نقاد حقانی القاسمی نے کہا کہ 'ابجد' کی ازسرنو اشاعت دراصل سیمانچل کی ادبی

روح کی بحالی ہے، جو طویل خاموشی کے بعد ایک نئے عزم و جوش کے ساتھ سامنے آئی ہے۔ سیمانچل سرکل آف دہلی کے زیراہتمام سہ ماہی 'ابجد' کے شمارہ کا مشترکہ طور پر اجرا کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ 'ابجد' کا پہلا شمارہ 7 مئی 2009 کو منظرعام پر آیا تھا۔ سیمانچل خطے (ارریہ، پورنیہ، کشن گنج، اور کٹیہار) میں اردو زبان کی گہری جڑوں کے باوجود یہاں سے کوئی معتبر ادبی رسالہ شائع نہیں ہورہا تھا۔ 'ابجد' نے اس خلا کو پر کیا اور مختصر عرصے میں علمی وادبی دنیا میں اپنی ایک مضبوط پہچان قائم کی۔ یہ رسالہ خطے کے اہل قلم کو ایک پلیٹ فارم فراہم کرے گا اور ان کی صلاحیتوں کو قومی سطح تک پہنچانے میں مددگار ثابت ہوگا۔ ڈاکٹر خالد مبشر نے اپنے پراثر خطاب میں کہا کہ ابجد کی اشاعت جمود کو توڑنے کی ایک علمی وتہذیبی کوشش ہے۔ ہمیں اس تحریک کا حصہ بننا چاہیے۔ معروف صحافی اور سیمانچل سرکل آف دہلی کے صدر عابد انور نے کہا کہ سیمانچل پسماندگی کا شکار ضرور ہے، مگر اس کے باسیوں میں علمی وادبی شعور کی کوئی کمی نہیں۔ 'ابجد' کی دوبارہ شروعات اس بات کی دلیل ہے کہ ہم اپنی تہذیبی شناخت کو زندہ رکھنے کے لیے پرعزم ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمیں محض ادبی نہیں بلکہ سماجی، تعلیمی اور معاشی ترقی کے پہلوؤں پر بھی یکجا ہوکر غور کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر عبدالمنان (مدیر ماہنامہ آجکل) نے کہا کہ ابجد کے معیار، طباعت اور مواد میں اعلیٰ معیار پر برقرار رکھنا نہایت ضروری ہے۔ یہ رسالہ سیمانچل کی علمی وادبی شناخت کا نمائندہ بن سکتا ہے۔ اس کے لیے میں اپنی طویل پیشہ ورانہ تجربات کی روشنی میں اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے تیار ہوں۔ صدارتی خطاب میں پرویز عالم نے کہا کہ ابجد کی ازسرنو اشاعت دراصل سیمانچل کے اہل قلم کی اجتماعی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ ہمارا مقصد اسے صرف ایک علاقائی رسالہ نہیں بلکہ قومی سطح کا نمائندہ جریدہ بنانا ہے۔ ہم سب کے تعاون سے ابجد یقیناً اپنی بلند پرواز جاری رکھے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ابجد سیمانچل کی مجموعی صورت حال، اس کی سماجی، ثقافتی اور تعلیمی جہتوں کی عکاسی کرے۔ یہ صرف ایک رسالہ نہیں بلکہ سیمانچل کی فکری شناخت کی تجدید ہے۔ سیمانچل سرکل آف دہلی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر مہربان علی نے کہا کہ ابجد کو صرف سیمانچل کا ادبی ترجمان نہیں بلکہ اس کے مسائل وحقائق کا بھی عکاس ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ علی نے کہا کہ کسی علاقے سے ادبی جریدے کی اشاعت اس کے علمی وجود کا ثبوت ہوتی ہے۔ ابجد سیمانچل کو عالمی سطح پر ایک ادبی شناخت دے گا۔ معروف افسانہ نگار عشرت ظہیر نے کہا کہ عرصے سے یہ رسالہ سیمانچل کے نوجوان قلمکاروں کی فکری

تربیت کا ذریعہ بنے۔ ڈاکٹر شاہد حبیب نے اس موقعے پر کہا کہ جب دنیا بھر میں رسائل کا سلسلہ بند ہوتا جا رہا ہے، ایسے میں ابجد کا دوبارہ نکلنا ایک دیوانگی ہے، لیکن یہ دیوانگی ادبی و تہذیبی سطح پر سیمانچل کی بیداری کی علامت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ 'ابجد' آئندہ کئی صدیوں تک اپنی پہچان برقرار رکھے گا۔ فرقان عالم (ریسرچ اسکالر، دہلی یونیورسٹی) نے کہا کہ ابجد سیمانچل کے لکھنے والوں کی تربیت اور ان کے ذوق کو جلا بخشنے میں موثر کردار ادا کر رہا ہے۔ ڈاکٹر جگدمبا دوبے (اسسٹنٹ پروفیسر، کانپور) نے کہا کہ یہ رسالہ صرف سیمانچل تک محدود نہیں رہے گا بلکہ اس کی آواز جلد اروناچل تک میں سنائی دے گی۔ نوشاد عالم (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے کہا کہ ابجد کی ٹیم جس لگن سے کام کر رہی ہے، اس سے واضح ہے کہ یہ رسالہ ملکی سطح پر اردو صحافت کا تابندہ ستارہ بنے گا۔ معروف صحافی جمشید عادل نے کہا کہ ابجد ہمارا اپنا رسالہ ہے، ہمیں اسے محض ایک اشاعتی تجربہ نہیں بلکہ اجتماعی ذمے داری سمجھ کر آگے بڑھانا چاہیے۔ ڈاکٹر محمد بہول نے کہا کہ ابجد کی ترقی اجتماعی تعاون سے ہی ممکن ہے۔ ہمیں مل کر اس کے روغ کے لیے کام کرنا ہوگا۔ محفل میں ادب دوست شخصیات، اساتذہ، محققین اور طلبہ کی بڑی تعداد شریک تھی۔ روزنامہ 'پندار' پٹنہ، 23 اکتوبر 2025

وفیات

انیس صدیقی

نئی دہلی: اجمیری گیٹ پر واقع اینگلو عربک سینئر سیکنڈری اسکول کے سابق استاذ ماسٹر انیس صدیقی کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم کینسر کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ گزشتہ دنوں ہی ہسپتال سے گھر آئے تھے۔ ان کے پسماندگان میں دو بیٹے اور ایک بیٹی ڈاکٹر رئیس صدیقی، ڈاکٹر نفیس صدیقی، تنویر عزیز اور پانچ پوتے، دو پوتیاں، تین نواسے اور ایک نواسی شامل ہیں۔ مرحوم کی نماز جنازہ جماعت اسلامی ہند کے مرکزی دفتر میں ادا کی گئی، جب کہ تدفین شاہین کے قبرستان میں بعد نماز مغرب عمل میں آئی، جس میں بڑی تعداد میں سوگوران، شاگردان اور

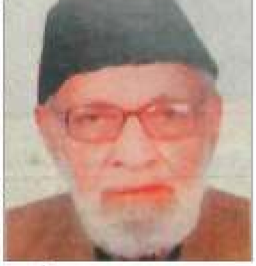

عزیز و اقارب موجود تھے۔ ان کے بیٹے ڈاکٹر رئیس صدیقی نے بتایا کہ والد مرحوم اکنومکس، اردو، انگلش کے استاذ تھے۔ اینگلو عربک اسکول میں 1956 سے تقریباً 35 برس تدریسی خدمات انجام دی تھیں۔ ان کے شاگرد سماجی کارکن محمد تقی نے بتایا کہ ماسٹر انیس صدیقی کئی مضامین پڑھایا کرتے تھے، ہمیں انھوں نے اردو پڑھائی، وہ پہلے پرانی دہلی میں مقیم تھے لیکن بعد میں مستقل اوکھلا شفٹ ہوگئے تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 اکتوبر 2025

مہر الٰہی ندیم

علی گڑھ: معروف ادیب اور قلمکار جناب مہر الٰہی ندیم کا 12 نومبر کی صبح 6 بجے چند روز کی علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ گزشتہ چند روز سے ان کو سینہ میں انفیکشن کی وجہ سے سانس لینے میں تکلیف تھی، اس وجہ سے ان کو اسپتال میں بھی بھرتی کرایا گیا تھا، اور وہ 11 نومبر کو اسپتال سے گھر آگئے تھے۔ ان کی عمر 88 برس تھی۔ مرحوم کا وطن مالوف اٹاوہ تھا۔ وہ 1937 میں اٹاوہ (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ بی کام، ایم اے اردو، بی لب ایس سی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ حصول تعلیم کے لیے علی گڑھ گئے تو پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انتہائی مخلص، شریف النفس، علم دوست، غریب پرور شخصیت تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے جنرل ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کی لائبریری سے وابستہ رہے اور 1997 میں ریٹائرمنٹ کے بعد علی گڑھ کو ہی اپنا وطن ثانی بنا لیا۔ تحقیقی و علمی کاموں میں تادم آخر مصروف رہے۔ ان کی اہم تصانیف میں کلیات رشید احمد صدیقی (24 جلدیں)، مجموعہ مضامین شیخ پاپا میاں (4 جلدیں)، مختارنامہ بہ اشتراک ڈاکٹر عطا خورشید کے علاوہ بچوں کے لیے متعدد کتب لکھیں جو NCPUL نے شائع کیں۔ اٹاوہ اسلامیہ ایجوکیشنل ایسوسی ایشن اور مسلم تعلیمی سوسائٹی سمیت متعدد تعلیمی اداروں سے منسلک تھے۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیٹا احتشام اور ایک بیٹی زیبا ہیں۔ تدفین اٹاوہ میں بعد نماز مغرب ہوئی۔

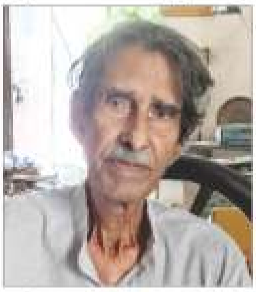

بشکریہ، ڈاکٹر اسعد فیصل فاروقی، علی گڑھ

مولانا نذیر احمد ندوی

لکھنؤ: دارالعلوم ندوۃ العلما کے سینئر استاد مولانا ڈاکٹر نذیر احمد ندوی کا مختصر علالت کے بعد 59 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ کچھ دنوں سے بہت کمزوری لاحق ہوگئی تھی۔ 7 اکتوبر کو انھوں نے صبح کو آخری درس دیا۔ طبیعت بہتر نہ محسوس ہونے پر اپنی آرام گاہ چلے گئے تھے۔ طبیعت بگڑنے پر انھیں ہسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے ان کے انتقال کا اعلان کر دیا۔ مولانا کی ایک نماز جنازہ بعد نماز عصر دارالعلوم ندوۃ العلما میں ناظم ندوۃ العلما مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی کی اقتدا میں ادا کی گئی۔ دوسری ان کے وطن نورنگ آباد اٹاوہ میں۔ یہیں ان کی تدفین بھی عمل میں آئی۔ پسماندگان میں اہلیہ اور ایک بیٹی ہیں۔ مولانا نذیر احمد ندوی دارالعلوم میں کلیۃ اللغۃ العربیۃ کے سینئر استاذ تھے۔ وہ نورنگ آباد، اٹاوہ، یوپی میں 1966 کو پیدا ہوئے، ان کے والد عزیز احمد سرکاری ملازم تھے۔ مولانا نذیر احمد ندوی نے دارالعلوم ندوۃ العلما سے 1986 میں عالمیت کی سند حاصل کی، 1988 میں تخصص فی الادب کیا، لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ مولانا نذیر احمد ندوی کو عربی، اردو، انگریزی اور فارسی میں کمال حاصل تھا۔ ان کی صلاحیت کے پیش نظر ندوۃ العلما کے پندرہ روزہ عربی ترجمان 'الرائد' میں بحیثیت مترجم ان کا تقرر ہوا۔ مشہور ادیب، مفکر اور صحافی مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی کی تربیت میں رہ کر انھوں نے اس فن میں کمال پیدا کیا۔ عربی میں متعدد مضامین اور ترجمے الرائد میں شائع ہوئے۔ بعد میں مولانا نے دارالعلوم میں بحیثیت استاذ خدمات شروع کیں، عربی زبان و ادب کے ایک مقبول استاذ کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے۔ مولانا نذیر احمد ندوی نے 2022 میں خادم الحرمین الشریفین کی دعوت پر حج کی سعادت حاصل کی، اس سے پہلے وہ لندن کا سفر بھی کر چکے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 اکتوبر 2005

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ویر ساورکر اور تقسیم ہند کا المیہ

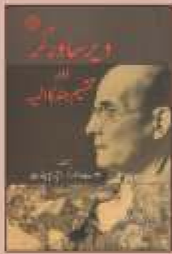

تالیف: اودے ماہورکر، چرایو پنڈت

مترجم: پروفیسر مظہر آصف، ڈاکٹر مسعود عالم

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 385+xxxviii

قیمت: 240 روپے

ہندوستانی مسلمان: اتحاد کی بنیاد حب الوطنی

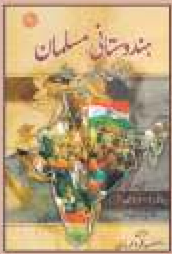

مرتبین: پروفیسر (ڈاکٹر) شاہد اختر

ڈاکٹر کیشو پٹیل

مترجمین: ڈاکٹر نصیب علی، محمد عارف

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 211+xl، قیمت: 150 روپے

کلیات سعادت حسن منٹو (جلد دوم)

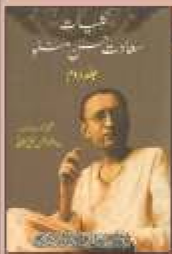

تحقیق، تدوین و ترتیب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

تیسرا ایڈیشن: 2025

صفحات 23+576

قیمت: 305 روپے

ٹیگور بتیسی (ٹیگور کے بتیس افسانوں کا انتخاب)

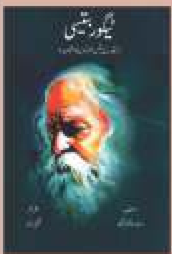

مصنف: رابندر ناتھ ٹیگور، مترجم: شبیر احمد

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 65+510

قیمت: 300 روپے

مرزا غالب: ایک سوانحی منظر نامہ

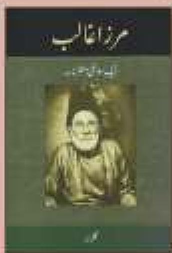

مصنف: گلزار

دوسرا ایڈیشن: 2025

صفحات: 23+247

قیمت: 160 روپے

نقوش کلام (سوانح حیات ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام)

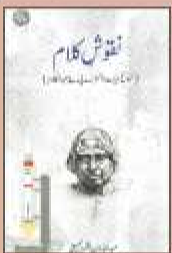

مصنف: عبداللہ ابن القمر الحسینی

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 20+460

قیمت: 255 روپے

Let's Learn Urdu
Beginner's Mannual for Urdu Script

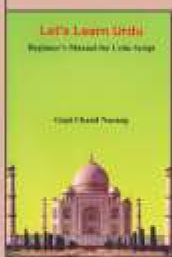

مصنف: گوپی چند نارنگ

ساتواں ایڈیشن: 2025

صفحات: 111

قیمت: 65 روپے

Work Book: Let's Learn Urdu
Beginner's Mannual for Urdu Scripts

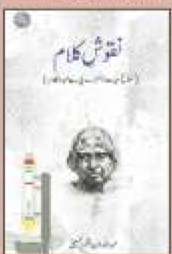

مصنف: گوپی چند نارنگ

ساتواں ایڈیشن: 2025

صفحات: 76

قیمت: 50 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, दिसम्बर–2025,वर्ष:27, अंक:12
URDU DUNIYA Monthly, December-2025, Vol.27, Issue:12
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/11/2025
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in، پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6